01۔دکن میں اردو زبان وادب کے بنیادی رجحانات کی تشکیل کا جائزہ (سیاسی اور ثقافتی تناظر)

جوابی خاکہ: نوٹ: (یہ سوال ''اردو ادب کی تاریخ'' مصنفہ ڈاکٹر انور سدیدؒ۔ کے حوالے سے دیا جارہا ہے۔ص۔96-97 سے شروع۔۔۔۔۔)

دکن (جنوبی ہندوستان) میں اردو ادب کی تشکیل

(الف) تمہید

01- دکن میں اردو ادب کے ورود کے دو اسباب

(i) دکن پر علاؤالدین خلجی کی یلغار

(ii) محمد تغلق کے عہد میں دارالحکومت کی دہلی سے دولت آباد کو منتقلی

(ب) دکن میں اردو کے حوالے سے صوفیائے کرام کی ادبی خدمات:

01 فخرالدین نظامی دکنی

02 اشرف بیابانی

(ج) دکن کے ابتدائی اردو شعرائے کرام:

01 ولّی دکنی

02 سراج اورنگ آبادی

03 اشرف گجراتی

04 شاہ تراب

(د) دکن کے ابتدائی اردو نثر نگار:

01 خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی

02 شاہ راجو (سید یوسف حسینؒ)

03 شیخ عین الدین گنج العلم

04 سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ

05 شمس العشاق شاہ میراں جی

06 شاہ میراں جی حسین خدانما

07 امین الدین اعلیٰ

08 میراں یعقوب

09 ملاں وجہی

10 محمد باقر آگاہ

(ر) دکن میں اردو تنقید کا نقشِ اوّل:

01 محمد باقر آگاہ

(الف) تمہید

01- دکن میں اردو ادب کے ورود کے دو اسباب ہیں۔

۱۔ دکن پر علاؤالدین خلجی کی یلغار

۲۔ محمد تغلق کے عہد میں دارالحکومت کی دہلی سے دولت آباد کو منتقلی

دکن میں قافلۂ اردو کا ابتدائی ورود مندرجہ بالا دو واقعات کا مرہون منت ہے۔ان دونوں واقعات کی وجہ سے نہ صرف حکمران وقت اور لشکر دکن آئے بلکہ ان کے ساتھ اہل ہنر، اربابِ حرفہ، اور امیر و متوسلین بھی دکن پہنچے۔اس نقل آبادی نے مقامی اور نو وارد باشندوں کے درمیان معاشرتی، تہذیبی اور لسانی میل جول کثرت سے پیدا کیا۔لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دکن نے اس سیاسی یلغار کو بارضا و رغبت قبول نہیں کیا تھا۔ چنانچہ مرکز دہلی کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہوگئی۔اس دور میں دکنی تہذیب کو مرصع کرنے کی جو سعی وسیع پیمانے پر ہوئی یہ حقیقت میں اپنی شناخت کو مقامی رنگوں سے ظاہر کرنے اور اسے مضبوط بنانے ہی کا عمل تھا۔نئی سلطنت کی بنیاد میں شمال دشمنی کے جذبات بھی شامل تھے اور اس میں فارسی زبان کے خلاف بھی رویہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ شمال میں تو فارسی اور عربی الفاظ کو قبول کرنے کا رجحان روز افزوں پرورش پا رہا تھا لیکن اس دور میں دکن میں' تامل، تلیگو اور مراٹھی وغیرہ زبانوں کے الفاظ قائم رکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔اس رجحان کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ پنجابی، سندھی اور ملتانی کے جو الفاظ دکن پہنچ گئے تھے، ان کے خلاف ردِعمل کی لہر نمایاں نظر نہیں آتی۔ دکن نے آزادانہ طور پر اپنا ادبی سفر طے کیا۔بہمنی دور میں جو شاعری سامنے آتی ہے اس میں غزل کا وجود کہیں نہیں ملتا۔ یہاں شاعری کے لیے ہندی اوزان اور ہندی اصناف کو ترجیح دی گئی۔ دوہا، گیت، بھجن وغیرہ کی تخلیقات کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔طویل نظم میں مثنوی کو فروغ حاصل ہوا اور مثنوی نے بھی ہندی رنگ اور غلبہ قبول کیا۔اس دور میں فخر الدین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ پہلی تصنیف ہے۔

(ب) دکن میں اردو کے حوالے سے صوفیائے کرام کی ادبی خدمات:

دکن میں اردو زبان کی ابتداء میں اولیاء کا بڑا عمل دخل ہے۔ بہت سے اولیاء اللہ نے اپنا پیغام شاعری کے ذریعے سے پھیلایا اور کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے مناقب اور تصوف پر رسالے لکھے۔دکن میں اردو کی ابتداء کے حوالے سے مندرجہ ذیل صوفی قابل ذکر ہیں۔

01 فخر الدین نظامی دکنی

02 اشرف بیابانی

01- فخر الدین نظامی دکنی:

فخر الدین نظامی دکنی کے مفصل حالات تا حال دستیاب نہیں ہو سکے مگر ڈاکٹر جمیل جالبی نے داخلی شہادتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ نظامی احمد شاہ ولی البہمنی (۱۴۲۲ تا ۱۴۳۵) کے زمانے میں بیدر میں تھے۔ان کی مثنوی ''**کدم راؤ پدم راؤ**'' اس عہد کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔ اگر چہ نظامی فارسی زبان جانتے تھے اور ان کی مثنوی کی بحر (فعولن،فعولن،فعولن،فعول) بھی اسی زبان سے مستعار ہے۔لیکن اس میں مرہٹی اور کنڑی زبانوں کے اثرات نمایاں ہیں۔اس میں پنجابی اور سرائیکی کے نقوش بھی جا بہ جا ملتے ہیں اور مقامی الفاظ اور معاشرتی اثرات نے مثنوی کا عجمی مزاج ابھرنے نہیں دیا۔اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

بڑے ساچ کہہ کر گئے بول چوک دَوھا دُودھ کا چھا چھہا پیوے پھوک
تہیں فخر دیؔں دیکہ ایناؤ راؤ کہ بن دوس دھن پر ہری دکھ لاؤ
نظامی دھرم دکھ کیوں راؤ دے کہ پت ورتھ گن بات دھن سو کیے

اس مثنوی میں راجہ کدم راؤ کی زندگی کے محیّر العقول واقعات بیان کیے گئے ہیں لیکن اندازِ بیان قدیم ہونے کی وجہ سے مشکل ہے۔ نظامی کی دوسری مثنوی ''**خوف نامہ**'' کا اسلوب نسبتاً سادہ ہے اور اس میں روزِ محشر کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

نہ بھائی کو بھائی مدد گار ہووے نہ کوئی یار کوں یار غم خوار ہووے
میاں کوں نہ کوئی بھی آوے غلام گواہ دیون اس وقت اعضا تمام

02- اشرف بیابانی (متوفی ۱۵۷۲ء):

اشرف بیابانی مخدوم شاہ ضیاء الدین ملتانیؔ کے فرزندِ اکبر تھے۔انہوں نے ''**لازمِ مبتدی**'' اور ''**واحد باری**'' دو منظوم رسالے بھی لکھے لیکن ایک اور مثنوی ''**نوسرہار**'' میں ملتان کی علاقائی بولی سرائیکی جیسی مٹھاس ہے۔حضرت زینبؓ کا ایک سراپا ملاحظہ کیجئے جس میں تخیل تخلیقی مزاج میں رچا بسا نظر آتا ہے۔

زینبؓ ہے اس کا نام نین سلونے جوں بادام
از حد صاحب حسن جمال زیبا موزوں صورت حال
ماتھا جانوں سورج پاٹ یا کے جانوں چندا لاٹ
دانت بتیسی تیسی جان جیسے ہرنیہ کیری کھان

اس دور میں فارسی زبان نے مقامی مزاج پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا اور مثنوی کے علاوہ غزل اور قصیدہ کی اصناف کو بھی خوش دلی سے قبول کر لیا گیا تھا۔چنانچہ سید شہبازؔ حسینی،مشتاقؔ،لطفیؔ اور عبداللہ حسینی،بہمنی دورِ سلطنت کے چند ایسے شعرا ہیں جنہوں نے مثنوی،غزل اور قصیدہ کی اصناف میں شاعری کی۔

(ج) دکن کے ابتدائی اردو شعرائے کرام:

دکن میں شاعری کی ابتداء میں مندرجہ ذیل شعراء تھے جنہوں نے اپنی شاعری اور کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ شعراء مندرجہ ذیل تھے۔

01 ولؔی دکنی

02 سراج اورنگ آبادی

03 اشرف گجراتی

04 شاہ تراب

01 ولؔی دکنی:

ولؔی دکنی سے پہلے جنوبی ہند میں مقامی زبان وادب پر فارسی کے غلبے کی ابتداء ہو چکی تھی۔ شعراء کا تخلیقی ذہن آہستہ آہستہ اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔ اور جن لوگوں کو فارسی نہیں آتی تھی وہ اپنی اس لسانی لاعلمی پر کفِ افسوس ملتے تھے۔ اس قسم کا تاثر شمال میں بھی موجود تھا چندر بھان برہمؔن، شاہ مراد خان پوری، ناصر سرہندی، دلشاد اورشاکر اٹکی کے ہاں فارسی اسلوب میں غزل کہنے کا رجحان نمایاں طور پر پروان چڑھ چکا تھا۔ جنوبی ہند میں اس قسم کی فضا' نصرتؔی، شاہؔی، غواصؔی، وجہؔی، محمودؔ، فیروزؔ اور حسن شوقؔی جیسے شعراء نے پیدا کی اور جب شاہ گلشنؔ نے ولؔی کو فارسی ادب سے مضامین حاصل کرنے کی نصیحت کی تھی اور کہا تھا کہ:

''ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اندر ریختہ خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔'' (اردو ادب کی تحریکیں: ص۔۱۸۹ کراچی ۱۹۸۵ء)

ولؔی دکنی کے بارے میں مزید دیکھنے کے لیے پہلا پرچہ (ولؔی دکنی کا خصوصی مطالعہ) ملاحظہ فرمائیں۔ کچھ نمونۂ کلام یہاں دیا جا رہا ہے۔

شرابِ شوق سے سرشار ہیں ہم کبھی بے خود کبھی ہشیار ہیں ہم

ہر چند رنگ زردی حاصل ہے عاشقوں کو لیکن شگفتہ رو ہیں گل جعفری کے مانند

ہوئے ہیں رام پیتم کے نیئن آہستہ آہستہ کہ جیوں پھاندے میں آتے ہیں ہرن آہستہ آہستہ

تو سر سے قدم تک جھلک میں گویا ہے قصیدہ انورؔی کا

02 سراج اورنگ آبادی (متوفی ۱۷۶۳):

ولؔی کے بعد اورنگ آباد سے جس شاعر کے رنگِ سخن، جودت طبع اور تخلیقی انفرادیت کو بڑے پیمانے پر تسلیم کیا گیا وہ سراج اورنگ آبادی ہے۔ وہ ولؔی کی وفات کے بعد پیدا ہوا اور خود کو ولؔی کا جانشین کہتا تھا لیکن وہ خود بھی استادی کے درجے کو پہنچا ہوا شاعر تھا۔ اس کی غزلوں میں بھی سراپا نگاری اور محبوب پرستی کا رجحان نمایاں ہے اور یہ دکن ہی کی گیت نما غزل کی ترقی یافتہ صورت نظر آتی ہے۔ سراج خود کشتۂ عشق ہے اور محبوب کو بھی پروانے کی مثال قرار دیتا ہے۔ اس کا سیمابی جذبہ جب باصرہ کو لامسہ تک لے آتا ہے تو اس پر ایک گونہ بے

خودی اور سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس کی سادگی بھی پرکاری نظر آنے لگتی ہے۔ مثلاً:

؎ جل گیا شوق کے شعلوں میں سراجؔ اپنی دانست میں بے جا نہ کیا
؎ آج کی رات مرا چاند نظر آیا ہے چاندنی دود سی چٹکی ہے مرے آنگن میں
؎ کبھی سمتِ غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی
؎ رخسارِ یار حلقۂ کامل میں ہے عیاں یا چاند ہے سراجؔ اماوس کی رات کا (سراجؔ)

سراجؔ جذبے کی تہذیب کا شاعر ہے۔ وہ آتش فشاں کا دہانہ کھولتا ہے لیکن پھر اسے مائل بہ اعتدال بھی کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعض اشعار تو ہمارے عہد کی جدید غزل کا پیش خیمہ نظر آتے ہیں۔

03- اشرف گجراتی (متوفی ۱۷۱۶ء):

اشرف گجراتی کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے قدیم مخطوطوں سے دریافت کیا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ 1716ء کے لگ بھگ اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ اشرف کی شاعری کا خمیر بتوں کے عشق سے اٹھا ہے۔ اس نے حسِ باصرہ سے لطف اٹھایا اور حدِ امان سے اوپر جا کر انوکھی حیرتوں کو جگا دیا۔

؎ اس آئینہ رو کی دیکھ تصویر
حیرت سوں جگت ہے نقش دیوار (اشرفؔ)

؎ تصویر اس پری کی اگر ہے خیال میں
دل کو مثالِ آئینہ حیران کر رکھو (اشرفؔ)

04- شاہ تراب، گنج الاسرار:

تراب شاہ اٹھارہویں صدی کے قادر الکلام شاعر اور کثیر التصانیف مصنف تھے۔ انہوں نے ''**ظہور کلی**''، ''**گلزار وحدت**''، ''**گنج الاسرار**''، ''**گیان سروپ**'' اور ''**مثنوی تراب**'' جیسی کتابیں تصنیف کیں۔ غزل میں وہ ولیؔ کی ریختہ نگاری سے بہت متاثر تھے۔ نظم میں رموز تصوف اور سرِ حق بیان کرنے میں تراب نے گہری دلچسپی لی۔ چنانچہ ان کے پیر حضرت شاہ حسینیؒ نے انہیں ''**گنج الاسرار**'' کا لقب دیا تھا۔ ان کی شاعری میں فرنگی راج کے خلاف ردِ عمل کا واضح اظہار ہوا ہے۔

؎ غلبۂ قومِ نصارا بسکہ دستا ہر طرف
کہ ظہور اپنا شتاب اے مہدیؑ آخرِ زماں
؎ ہوا ہے ہر طرف ہنگامہ دیکھو قومِ نصارا کا
خدایا بھیج مہدیؑ کوں جوں قائم رہے مسلمانی

ترابؔ کی غزل کے اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

؎ شمع رو کی یاد میں پروانہ وار
دن گیا اور رات ساری ہے ہنوز

؎ ترابؔ اک نقشِ پا ہو کر رہا ہوں کوئے جاناں میں
مرا نام عاشقوں میں سب شمار ہوتا تو خوب ہوتا

؎ چشمِ بتاں میں معرفتِ کردگار ہے
جوں مرد مک میں گنجِ نہاں آشکار ہے

ولیؔ کی وفات کے بعد شعر وسخن کی شمع جنوب سے شمال کی طرف منتقل ہوگئی۔ اگر چہ دکن میں بھی یہ شمع روشن رہی اور سراجؔ اور شاہ قاسمؔ جیسے شاعر پیدا ہوئے لیکن اب شاعری کے زیادہ امکانات شمال سے پیدا ہو رہے تھے اور وہی سے نئی روایت کی کونپل پھوٹ رہی تھی۔

(د) دکن کے ابتدائی اردو نثر نگار:

جنوبی ہندوستان میں جن مصنفین نے ابتداء میں اردو کی تصنیفی خدمات سرانجام دیں ان کے اسماء مندرجہ ذیل ہیں۔

01	خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی	06	شاہ میراں جی حسین خدانما
02	شاہ راجو (سید یوسف حسینؒ)	07	میراں یعقوب
03	شیخ عین الدین گنج العلم	08	امین الدین اعلیٰ
04	سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز	09	ملاں وجہیؔ
05	شمس العشاق شاہ میراں جی	10	محمد باقر آگاہؔ

اب ان مصنفین کی خدمات کا تفصیلی جائزہ ملاحظہ فرمائیں۔

01- خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی (متوفی ۱۳۰۸ء):

اردو نثر کی تاریخ تا حال اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دستیاب مواد کی اساس پر خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کا نام قدیم ترین نثر نگاروں میں شامل ہے اور شہادت کے طور پر ان کی نثر کا مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

''اے طالب آسمان زمین سب خدا میں ہے۔ ہوا سب خدا میں ہے۔ جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات۔''

بحوالہ:۔ (داستان تاریخ اردو: مصنفہ: حامد حسن قادری۔ ص ۲۴۔ کراچی ۱۹۶۶ء)

(اردو ادب کی تاریخ: مصنفہ: انور سدید۔ عزیز بک ڈپو لاہور۔ ص۔ ۱۱۹)

مولانا حامد قادری نے میر نذر علی درد کاکوروی کے ایک مضمون مطبوعہ ''نگار'' لکھنؤ دسمبر ۱۹۲۵ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''سید اشرف جہانگیر نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں خود جمع کیا تھا۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحات کی ہے۔ اور اس کے صفحہ ۱۱۸ پر متذکرہ بالا عبارت کا ٹکڑا درج ہے۔''

تحقیقِ مزید کے لیے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے دردؔ کاکوروی صاحب تک رسائی حاصل کی تو انہوں نے وضاحت کی کہ ان کا مضمون رسالہ ''**یادگار**'' لاہور میں ''**اردو اور شمالی ہندوستان**'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا لیکن انہوں نے رسالہ ''**یادگار**'' کا ماہ و سالِ اشاعت درج نہیں کیا اور متذکرہ بالا اقتباس کا صفحہ ۱۸ تو درج کیا ہے لیکن کتاب کی ضخامت نہیں بتائی۔ دونوں بیانات میں تضاد اتنا زیادہ ہے کہ اب مولانا حامد قادری کے بیان پر یقین کرنا بھی ممکن نہیں۔ مولوی عبدالخالق نے لکھا ہے کہ

''جس رسالے کا ذکر حامد حسن قادری نے کیا ہے وہ بہت مشتبہ ہے اور وہ پائے ثبوت کو نہیں پہنچا۔''

(بحوالہ: ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ''اردو نثر کا آغاز و ارتقاء'' ص۔ ۵۷۔ کراچی)

اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سید اشرف جہانگیر کو تب تک اردو کا پہلا نثر نگار نہیں مانا جاتا جب تک کہ ان کی کوئی واضح تصنیف سامنے نہ آ جائے۔ مذکورہ بالا اشرف جہانگیر کی اقتباس بہت کم ہے اور نامکمل ہے جو کہ ثبوت کے زمرے میں پوری نہیں اترتی۔ لہٰذا آئندہ سطور میں مذکور شاہ راجو کو اردو کا پہلا نثر نگار مانا جا سکتا ہے۔

رسالہ ''جنونیہ'' (۱۳۹۲ء):

سید اشرف جہانگیر کے ساتھ ایک اور رسالے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس رسالہ کا نام ''رسالہ جنونیہ'' بتایا جاتا ہے۔ ڈکٹر رفیعہ سلطانہ نے اس رسالے کو اردو نثر کی قدیم ترین کتاب شمار کیا ہے اور اس کا مصنف **محمد دخان روزی** بتایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسالہ جنونیہ میں چند اردو معقولے موجود ہیں۔ جن کی تشریح فارسی زبان میں کی گئی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ''رسالہ جنونیہ'' کی اساسی زبان فارسی ہے اور سولہ (۱۶) صفحات کے اس رسالے کو جس میں نو (۹) معقولے اردو کے ہیں اردو کی تصنیف قرار دینا مناسب نہیں۔ اس رسالے سے صرف اتنی سی بات ہی ثابت ہوتی ہے کہ ۱۳۹۲ء کے لگ بھگ اردو معقولے بول چال کا حصہ بن چکے تھے۔ چنانچہ **محمد دخان روزی** کو اردو کا پہلا مصنف اور اس کے رسالے ''جنونیہ'' کو اردو نثر کی پہلی تصنیف تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے۔

02- سید یوسف حسین شاہ راجو (متوفی ۳۱۔۱۳۳۰ء) :

(اردو کا پہلا نثر نگار)

پہلی اردو نثر کی تلاش میں پھرتے پھراتے اس اندھیرے سے جو تازہ کرن پھوٹی ہے اس نے سید یوسف حسین شاہ راجو کے رسالۂ نثر کو روشنی دے دی ہے۔ یہ رسالہ بعض دوسرے اردو رسالوں کے ساتھ جن میں حضرت گیسودرازؒ کے کچھ رسالے بھی شامل ہیں ملا ہے اور اس پر ''رسالہ شاہ راجو'' درج ہے۔ (بحوالہ: علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ ص۔ ۱۴۶ یہ رسالہ کتب خانہ رضتین گلبرگہ میں محفوظ ہے۔)

اس رسالے کا ایک اقتباس حسبِ ذیل ہے۔

''جان اے عزیز اوّل کچھ نہ تھا۔ آسمان تھا نہ زمین، عرش نہ کرسی، چاند نہ تارے۔ نہ کچھ تھا اور ذات حق تعالیٰ اپنے میں آپی تھا۔ اس حد تلک کہ صفتوں کا بھی ظہر نہ تھا۔ نہ اپنی خبر رکھتا تھا نہ غیر کی۔''

آگے سوالیہ انداز میں اقتباس کچھ یوں ہے۔

''سوال۔ کس واسطے خبر نہیں رکھتا تھا؟

جواب۔ کہ خبر رکھنا صفاتوں سوں تعلق رکھتا ہے۔ ہور اپنی ذات سوں اپے ایسا مشغول تھا جو کسی صفاتاں کی گنجائش نہ تھا۔ جس وقت صفاتاں کی گنجائش نہ تھا تو خبر رکھنا بھی ممکن نہیں

سوال۔ صفتاں قدیم جدید

جواب۔ قدیم میں ظہور اس کا ذات مرئی میں مخفی ہے۔ جیوں کی شراب ذات میں، عطر پھول میں۔''

عبدالقادر سروری نے لکھا ہے کہ:

''اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ یہ رسالہ شاہ راجو ہی کی تصنیف ہے۔''

تاہم اس کے حق میں مندرجہ ذیل شہادتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اوّل۔ اوّل یہ رسالہ حضرت گیسو دراز کے رسائل کے ساتھ منسلک ہے۔ جن کے بزرگ شاہ راجو تھے۔ شاہ راجو کی مثنوی ''**سہاگن**'' ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے دریافت کی ہے۔ فارسی میں مثنوی ''**تحفۃ النصائح**'' اور دیوان راجہ بھی دستیاب ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ راجو کو تصنیف و تالیف سے دلچسپی تھی۔

دوم۔ رسالے پر شاہ راجو کا نام درج ہے۔ اس نام کے اور کوئی بزرگ اس زمانے میں نہیں تھے۔

سوم۔ رسالہ کتب خانہ روضتین گلبرگہ میں موجود ہے۔ جہاں اس خاندان کے متعدد دوسرے مخطوطے بھی موجود ہیں۔

چہارم۔ رسالے کا اسلوب خطابیہ ہے جو شاہ راجو کے دور کا مقبول اسلوب تھا۔ خواجہ گیسو دراز کے دکنی رسائل بھی اسی خطابیہ اسلوب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان کا خاندانی اسلوب تھا۔

پنجم۔ یہ رسالہ سوال و جواب کی صورت میں لکھا گیا ہے اور یہ بھی شاہ راجو کے زمانے کا انداز تھا۔

ششم۔ اس رسالے کی زبان اور خواجہ گیسو دراز کی زبان میں مماثلت موجود ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے لکھا ہے کہ:

''قرینِ قیاس یہی بات ہے یہ رسالہ شاہ راجو اوّل ہی کی تصنیف ہے۔''

ان شواہد کی بنا پر ''**رسالہ شاہ راجو**'' کو اردو نثر کا قدیم ترین نمونہ اور شاہ راجو کو اردو کا پہلا نثر نگار قرار دینا مناسب ہے۔

03- شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۱۳۹۲ء):

شیخ عین الدین گنج العلم کے بارے میں حکیم شمس اللہ قادری نے لکھا ہے کہ

''انہوں نے کئی چھوٹے چھوٹے رسالے دکنی زبان میں لکھے تھے۔''

شیخ محمد اکرام نے **''آبِ کوثر''** میں ان کے تین رسائل **''طورالابرار''**، **''رسالہ الانساب''** اور **''ملحقاتِ طبقاتِ ناصری''** کا ذکر کیا ہے۔ مولانا حامد حسن قادری نے بھی حضرت گنج العلم کے رسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ ان رسائل کا ذکر افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ حضرت گنج العلم کے رسائل چونکہ ناپید ہیں اور ان کے اقتباسات بھی کہیں موجود نہیں اس لیے اردو نثر کے فروغ میں ان کی عطا کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کہ حضرت گنج العلم نے اپنے علم و فضل کی بنا پر بڑا نام پایا۔ ان کے ارشادات و ہدایات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان کی جملہ تصانیف کی تعداد ایک سو تیس بتائی جاتی ہے۔

04- سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (متوفی ۱۴۲۲ء):

خواجہ بندہ نواز کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ ان کی کم و بیش چالیس کتابیں دریافت ہو چکی ہیں۔ عبدالقادر سروری نے لکھا ہے کہ:

''فیروز شاہ بہمنی کے عہد کی سب سے بڑی دین شاید حضرت گیسو دراز کے وہ رسالے ہیں جو اردو میں لکھے گئے اور جن سے اردو ادب میں مستقل تصنیف و تالیف کے سلسلے کا آغاز ہوا۔''

ان رسائل میں سب سے زیادہ شہرت **''معراج العاشقین''** کو ملی۔ رسالہ شاہ راجو کی دریافت سے قبل اس کتاب کو اردو کی پہلی نثری تصنیف کا درجہ حاصل تھا۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل کا دعویٰ ہے کہ **''معراج العاشقین''** کے مصنف خواجہ گیسو دراز کے بجائے مخدوم شاہ حسینی بے جا پوری ہیں۔ جنہوں نے گیارہوی صدی ہجری کے نصف آخر یا بارہویں صدی کے اوّائل میں (۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء کے لگ بھگ) **''تلاوۃ الوجود''** کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ عبدالقادر سروری نے خواجہ گیسو دراز کی دکنی زبان کی کتابوں میں **''تلاوۃ الوجود''** کو بھی شامل کیا ہے۔ خواجہ صاحب کی تصنیف **''خاتمہ''** کے مقدمے میں عطا حسین نے لکھا ہے کہ:

''آپ اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں لکھتے تھے۔ بلکہ کاتب مستعملی سے لکھوایا کرتے تھے اور کسی کتاب کو لکھوا لینے کے بعد اس کی نظر ثانی کبھی نہیں کی اور کبھی دوبارہ پڑھوا کر نہیں سنا۔''

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ خواجہ گیسو دراز کی تصانیف میں خاصی تحریف ہوئی ہوگی۔ اور ان کے عقیدت مندوں نے نقل در نقل کا عمل بھی اختیار کیا ہوگا۔ **''معراج العاشقین''** اور **''تلاوۃ الوجود''** کی زبان و بیان میں مشابہت موجود ہے۔ آغاز کلام کی آیات کریمہ بھی ایک ہیں، دونوں کا انداز خطابیہ ہے۔ **''عشق نامہ''** میں اس کتاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق نے درست قیاس کیا ہے کہ **''معراج العاشقین''** حضرت بندہ نواز ہی تصنیف ہے۔ ان کی دوسری اردو تصانیف میں **''صفتِ اسرار''**، **''درّالاسرار''**، **''تمثیل نامہ''**، **''شکارنامہ''**، **''خلاصہ توحید''**، **''رسالہ کلمہ طیبہ''**، **''رسالہ سہ پارہ''**، **''ہدایت نامہ''** اور **''ہشت مسائل''** وغیرہ شامل ہیں۔

خواجہ بندہ نواز کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے دکنی نثر کو تالیف وتصنیف کا وسیلہ بنایا اور اس میں متعدد کتابیں لکھیں۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ خواجہ صاحب نے اردو کی ابتدائی نثر کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔

05- شمس العشاق شاہ میراں جی (متوفی ۱۴۹۶ء):

حضرت گیسو دراز کے بعد شاہ میراں جی اس صدی کے ایک اور قابل ذکر نثر نگار ہیں۔ ان کے دو رسائل ''**گل باس**'' اور ''**جلترنگ**'' شمس اللہ قادری نے دیکھے تھے۔ لیکن اب دستیاب نہیں۔ فارسی مثنوی ''**مرغوب القلوب**'' کی شرح میں ان کا دکنی اسلوب سامنے آتا ہے۔

''**پیغمبر کہے کُج کام کرے گا کوئی خدا نانوں نالے کرتو اوکام**

پائمال ہوگا۔ سرانا' نواز نا خدا کو بہوت کہ او پالن ہارا ہے عالم کا۔''

شاہ میراں جی نے استفادۂ عام کے لیے ہندی روایت کو فروغ دیا تھا۔ ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانؔم نے شریعت اور طریقت کے مسائل گجری زبان میں بیان کیے۔ ان کی متعدد تصانیف میں سے ''**کلمۃ الحق**'' اور ''**رسالہ وجودیہ**'' دستیاب ہیں۔

جانؔم نے ہر چند اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔ لیکن منطق اور فلسفہ کے گہرے مسائل میں انہوں نے فارسی زبان کا سہارا بھی لیا ہے۔ اور عربی کے الفاظ سے بھی نثر کو جگمگایا ہے۔

06- شاہ میراں جی حسین خدانما (متوفی ۱۶۶۳ء):

مذہبی نثر کی روایت میں شاہ میراں جی حسین خدانما کے رسائل ''**شرح تمہیداتِ ہمدانی**''، ''**چہار وجود**'' اور رسالہ ''**قریبہ**'' کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

07- امین الدین اعلیٰ (متوفی ۱۶۷۵ء):

امین الدین اعلیٰ، شاہ میراں جی کے خاندان کے تیسرے بزرگ تھے جنہوں نے نظم کے علاوہ نثر میں بھی کتابیں تصنیف کیں۔ ''**کلمۃ الاسرار**''، ''**گفتار حضرت آمین**'' اور **وجودیہ** ایسی کتابیں ہیں جن میں اخلاق اور تصوف کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔ احسن مارہروی نے ان کے رسالے ''**گنج مخفی**'' کی نشان دہی بھی کی ہے۔ ان کی سب کتابوں کا اسلوب ایک جیسا نہیں بلکہ حضرت اعلیٰ کے ملفوظات میں مرید کاتب کے تصرفات بھی شامل ہوگئے ہیں۔ ان کے رسائل نے تبلیغی ضرورتوں کے علاوہ نثر اردو کی بھی گراں قدر خدمت کی ہے۔

08- میراں یعقوب:

میراں یعقوب نے ''**شمائل الاتقیا**'' کا ترجمہ ہندی میں کیا تھا۔ اگرچہ ان کا ترجمہ لفظی ہے لیکن اس میں میراں یعقوب کی نثر ایک خود مختار صنف کے طور پر بھی ابھری ہے۔ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول ''**اس نے اپنے الگ وجود کا احساس بھی دلایا ہے۔**'' اور مصنف نے اپنے سمندِ فکر کو آزادانہ اڑنے کی اجازت بھی دی ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند جملے ملاحظہ ہوں۔

''جھوٹ کیوں ہے۔جوں چودویں رات کا چاند۔جوں جوں دن جاتے
تیو تیو کم ہوتا۔ہور سچ جوں پہلا چاند ہے۔روز روز روشن ہوتا ہے۔''

09- ملاں وجہی:

دکنی ادب میں ملاں وجہی نے اردو نظم ونثر کا ادبی معیار قائم کیا ہے۔اور''**سب رس**'' کے ذریعے اردو نثر کو تمثیل، داستان، ترجمہ اور ادبی اسلوب سے آشنا کیا۔

''**سب رس**''اصل میں عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر **فتاحی نیشاپوری** کے فارسی قصے''**حسن ودل**'' سے اخذ واستفادہ کے بعد لکھی گئی۔ لیکن اس کا اسلوب اتنا تر وتازہ ہے کہ ملاں وجہی کی اپنی تخلیق نظر آتی ہے۔اس کتاب میں تصوف کی تعلیمات و روایات' زندگی کے تصورات، تہذیبی نقوش اور مقامی رسم ورواج کی عکاسی کے لیے عشق، حسن، عقل، ہمت، دل، حیات، طبع، مصیبت، فقر اور صبر کی تجسیم کے ذریعے ان کے داخلی اوصاف ابھارے گئے ہیں۔یہ سب اس کہانی کے کردار ہیں۔مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ:

''**قصہ بھی عجیب ہے اور طرزِ بیان بھی عجیب، مصنف نے ایک عالمگیر حقیت کو مجاز کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔**''

سب رس کی زبان اگر چہ قدیم ہے لیکن اس کی مقفیٰ اور مسجع نثر نے اسے بے حد رنگین بنا دیا ہے۔اور اس سے نثر میں نظم کا لطف پیدا ہو گیا ہے ۔ملاں وجہی کی اعطا یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان کو فارسی تہذیب کے گہوارے میں رکھ کر اس عمل میں عربی زبان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

ملاں وجہی نے جس ادبی افسانوی نثر کا آغاز کیا تھا اس کی تقلید کی صورت محمد قادری اور ابوالفضل کے طوطی ناموں کے تراجم میں ملتی ہے۔لیکن ان کے ترجموں کا کچھ اَتہ پتہ نہیں ملتا اور ان کا سنِ تالیف بھی تا حال نا دریافت ہے۔دوسری طرف مذہبی نثر کی جو روایت ''**شمائل الاتقیا**'' نے ڈالی تھی اس کی زبان کو سادہ اور آسان بنانے کی ایک کاوش **شاہ معین الدین حسین علی (متوفی ۸۵۔۱۷۸۴ء)** نے''**فتوح المعین**'' میں کی۔تصوف کی یہ کتاب فارسی رسالہ''**جامِ جہاں نما**'' کا آزاد ترجمہ ہے اور مقصد یہ تھا کہ تصوف کے مشکل مضامین پڑھنے والوں کی سمجھ میں آجائیں۔

''**سب رس**'' کی مسجع نگاری میں ادبی شان اور مقفیٰ نگاری میں شعریت آمیز روانی ہے۔اور اس سے فارسی زبان کے غلبے کا احساس ہوتا ہے۔لیکن سبرس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے اظہار وبیان کی راہیں کشادہ ہو گئی ہیں۔اور اردو نثر کو ارتقاء کے زینے پر چڑھنے کا حوصلہ ہو گیا ہے۔اس کے رویے کے خلاف ردِعمل بھی سامنے آیا جو کہ محمد باقر آگاہ نے کیا۔

10- محمد باقر آگاہ (متوفی ۱۸۰۵ء):

محمد باقر آگاہ نے دکنی زبان کی روایت کی پاسداری کی اور فارسی نثر سے''**قصہ رضوان شاہ وروح افزا**'' کو''**گلزار عشق**'' کے نام سے اردو میں منتقل کیا تو اس میں دکنی اسلوب کو برقرار رکھا اور دیباچے میں دکنی کے معترضین پر شدید تنقید کی۔مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

''مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلانِ بے معنی و ہرزہ داریانِ لایعنی زبان دکنی پر اعتراض اور گلشنِ عشق و علی نامہ پر اعتراض کرتے ہیں اور جہل مرکب نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطینِ دکن کی قائم تھی زبان ان کی درمیان ان کے خوب رائج تھی اور طعن و شماتت سے سالم تھی۔''

مندرجہ بالا اقتباس میں اگر چہ محمد باقر آگاہ نے زبانِ دکنی کی حمایت کی ہے لیکن ان کی اپنی زبان پر جدید ریختہ کا غازہ چڑھا ہوا ہے اور یہ ماضی کی طرف مراجعت کرنے کے بجائے قاری کو بے اختیار آگے کی طرف کھینچ رہی ہے۔ چنانچہ اس شعوری کوشش کے باوجود قدیم دکنی زبان کی تجدید نہ ہوسکی بلکہ کچھ عرصے کے بعد باقر آگاہ کا اپنا نظریۂ زبان بھی تبدیل ہوگیا اور ان کی دکنی زبان اردو کے فارسی آمیز اسلوب کے ساتھ ہم کنار ہوگئی۔

(ر) دکن میں اردو تنقید کا نقشِ اوّل:

دکن میں اردو کی تنقید کا آغاز ہو چکا تھا اور اس کام کے لیے محمد باقر آگاہ کا نام سامنے آتا ہے۔

01- محمد باقر آگاہ

محمد باقر آگاہ عربی، فارسی اور اردو کے صاحبِ دیوان شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ فنِ شاعری کے اسلوب سے بھی آشنا تھے۔ ان کی سوچ کا انداز منفرد، تجزیاتی، اور تنقیدی تھا اور وہ رائے عامہ میں بہہ جانے کے بجائے خود اپنا نظریہ قائم کرنے پر مائل تھے۔ انہوں نے دکنی اردو کی تجدید کی تحریک اور متعدد کتابوں کے دیباچے دکنی اور اردو میں لکھے۔ چنانچہ ''**ہشت بہشت**''، ''**مثنوی ریاض الجنان**''، ''**دیوانِ ہندی**''، ''**گلزار عشق**'' اور ''**محبوب القلوب**'' وغیرہ کتابوں کے دیباچوں میں آگاہ کے تنقیدی نظریات واضح صورت میں سامنے آتے ہیں۔ باقر آگاہ نے اپنی رائے نہ صرف تیقن اور اعتماد سے دی بلکہ اس کی اساس تحقیق و تدقیق پر رکھی۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ:

''میں بہت تحقیق و تدقیق کر کر لکھا ہوں۔ ان کتابوں سے بھی مقلدان کی مانند نہیں لیا ہوں بلکہ ان میں جو اصح تھا سو اخذ کیا ہوں۔''

''**گلزار عشق**'' کے دیباچے میں باقر آگاہ نے شعرائے اردو کے بارے میں اپنی رائے کا برملا اظہار کیا ہے۔ اور یہ تذکروں کی تاثراتی تنقید سے نہ صرف آگے کی چیز ہے بلکہ اس میں آگاہ کے تجرباتی مزاج اور شعراء کے بالاستیعاب مطالعے کا حصہ بھی ہے۔ چنانچہ باقر آگاہ نے ولی کو بانی طرزِ جدید شمار کیا اور لکھا ہے کہ۔

''جیسا ثنائی و ظہوری نظم و نثر فارسی میں بانی طرزِ جدید کے ہوئے ہیں ولی گجراتی غزل و ریختہ کی ایجاد میں سبھوں کا مبدا اور استاد ہے۔''

سوداؔ کے بارے میں رائے دی ہے کہ:

''مخفی نہ رہے کہ تمام ریختہ گویوں میں سوداؔ نے اعتبار نمایاں پایا ہے۔ درداوس کے سوداؔ کا اکثر سروں میں پیچ کھایا ہے۔ جدھر دیکھو ادھر اس کی ہواداری ہے۔''

ریختہ کی فنی بحث میں لکھا ہے کہ:

''ریختہ بجز محاورہ ہندی کے سب امور میں فارسی کا تابع ہے۔ مانند قوانین عروض وقافیہ وضائع بدیعہ ہر حال میں قدم پر اس کے قدم دھرے اور ہرگز پیروی سے اس کے عدولی نہ کرے۔''

ان دیباچوں سے باقر آگاہؔ کے تنقیدی شعور، اصول فن اور نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر **جمیل جالبی** نے لکھا ہے کہ:

''اردو کے کسی شاعر نے اردو دیوان پر اب تک اس قسم کا مقدمہ اردو میں نہیں لکھا۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی نے رائے دی کہ:

''باقر آگاہؔ کے سارے دیباچے جدید اردو تنقید کی روایت کے اوّلین نقوش ہیں۔''

چنانچہ محمد باقر آگاہؔ کو اردو کا پہلا نقاد شمار کرنا غلط نہیں ہے اور اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اردو تنقید کا نقشِ اول بھی دکن کی سرزمین ہی سے ابھرا تھا۔

☆☆☆☆☆

02- اردو ادب کا بہمنی دور

تمہید:

(بحوالہ: تاریخِ فرشتہ)

دکن میں حسن آباد، گلبرگہ اور احمد آباد کے بادشاہوں کو سلاطینِ بہمنیہ کہتے ہیں۔ غلام قاسم فرشتہ نے "**تاریخِ فرشتہ**" میں لکھا ہے کہ: دکن میں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد ایک شخص جس کا نام حسن تھا وہ دارالسلطنت دہلی میں ایک آدمی گنگو برہمن منجم کا ملازم تھا۔ یہی منجم محمد تغلق کا اس وقت مقرب خاص تھا۔ حسن کو ہمیشہ معاشی مشکلات کا سامنا رہتا تھا اور وہ اپنی تنگدستی سے کسی حد تک پریشان بھی ہو گیا تھا۔ لہٰذا ایک دن تنگ آ کر اس نے گنگو برہمن سے فکرِ معاش کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اس کو کوئی ایسی نوکری یا روزگار مل جائے جس سے وہ اپنا کفیل ہو سکے اور غربت و افلاس کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ گنگو نے اس کے ساتھ یہ ہمدردی کی کہ نواح دہلی ہی میں اس کو بنجر زمین کا ایک ٹکڑا ایک جوڑی بیل اور کام کرنے کے لیے دو مزدور دیئے تا کہ وہ اس زمین پر کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پال سکے۔ مزدوروں نے زمین کو کاشت کے لیے کھودنا شروع کر دیا۔

ایک دن مزدور زمین میں ہل چلا رہے تھے کہ ہل کی نوک زمین کے اندر پھنس گئی۔ مزدوروں نے حسن کو جا کر بتایا اور بعد میں اس حل کو نکالنے پر معلوم ہوا کہ ہل کی نوک ایک زنجیر سے پھنس گئی تھی اور زنجیر ایک بڑے برتن کے منہ سے بندھی ہوئی تھی۔ برتن کو کھول کر دیکھا تو علائی عہد کے سونے کے سکے اور اشرفیاں اس میں لبالب بھری ہوئی تھیں۔ حسن کی ایمانداری نے یہ قبول نہ کیا کہ آقا کی دی ہوئی زمین کے مال میں خیانت کرے۔ لہٰذا اس نے یہ ساری دولت اس برتن کی چادر میں باندھی اور گنگو کے مکان پر پہنچا اور اس سے سارا ماجرہ بیان کیا۔ گنگو نے حسن کی ایمانداری کی تعریف کی اور صبح ہوتے ہی اس نے یہ سارا واقعہ محمد تغلق کے سامنے لفظ بہ لفظ بیان کر دیا۔ شہزادہ محمد تُغلق کو حسن کی ایمانداری اور سچائی پر بہت حیرت ہوئی اور اس نے اپنے دربار میں حسن کو طلب کیا۔ شہزادے کو بھی حسن کا حلیہ اس کا رنگ ڈھنگ بہت پسند آیا اس نے اپنے والد سلطان غیاث الدین تغلق کو یہ تمام حالات بتائے۔ بادشاہ غیاث الدین تغلق بھی حسن کے اچھے کردار سے متاثر ہوا اور اس کو شاہانہ نوازشات سے سرفراز کیا اور یک صدی امیروں کے زمرہ میں شامل کر لیا۔

لفظ بہمنی کی اصل:

ایک دن گنگو برہمن نے حسن سے کہا کہ "**تمہاری قسمت کا زائچہ بتاتا ہے کہ تم کسی دن بہت بلند اقبال اور باعزت بنو گے اور خدا کے کرم سے کسی اونچے عہدے پر پہنچ جاؤ گے۔**" اگر خدا تمہیں دنیا میں کوئی باعزت عہدہ عطا کرے تو تم میرا نام بھی اپنے نام کا جزو بنا کر رکھنا تا کہ تمہاری وجہ سے میرا نام بھی حیاتِ جاوداں حاصل کر لے۔ اور ساتھ ہی یہ وعدہ لیا کہ خزانچی کے عہدے پر مجھے اور میرے بعد میری اولاد کے سوا کسی اور کو نہ رکھنا۔ حسن نے اپنے محسن کے دونوں وعدوں پر مہرِ صداقت ثبت کی اور بغیر کوئی بلند عہدہ ملے ہی اس نے اپنے نام کے ساتھ گنگو بہمنی لکھنا شروع کر دیا۔ اور اپنا نام "**حسن گنگو بہمنی**" رکھ لیا۔ دکن کا سلطان بننے کے بعد اس نے اپنے سارے وعدے وفا کیے اور گلبرگہ کو "حسن آباد گلبرگہ" کا نام دے دیا اور ساتھ میں اسی شہر کو اپنا دارالحکومت بنایا اور حسن گنگو کا پورا نام "**بادشاہ علاؤالدین حسن گنگو بہمنی**" مشہور ہوا۔

حسن گنگو کے بادشاہ بننے کا واقعہ:

ایک دن حضرت نظام الدین اولیاؒ کے آستانے پر ہر عام و خاص کی دعوت تھی۔محمد تغلق بھی اس دعوت میں شریک ہوا۔مگر حسن نے جانے کا اردہ کیا تھا کہ اس کو کوئی کام پڑ گیا ہوگا جس کی وجہ سے اسے وہاں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی۔جب کھانا تمام ہو چکا،مہمان جا چکے تو حسن مرشد کے آستانے پر جا پہنچا۔مرشد نے حسن کو خوش آمدید کہا اور اس کی کچھ خوبیوں کی وجہ سے اس کا استقبال بھی کروایا۔کھانا چونکہ ختم ہو چکا تھا تو مرشد نے اپنے افتار کے لیے بچی ہوئی روٹی میں سے تھوڑی سی روٹی اپنی انگلی پر رکھ کر حسن کے منہ میں ڈالی اور ساتھ میں کہا کہ یہ ملک دکن کا تاج ہے جو بڑی محنت اور مشقت کے بعد تیرے سر پر آنے والا ہے۔مرشد سے شاہی کی نوید سن کر حسن بہت خوش خوش واپس لوٹا۔

حسن گنگو بہمنی اب دن رات پیر کی بات کو سوچتا تھا اور دکن فتح کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔وہ اس سوچ میں تھا کہ وہ دکن کو کیسے فتح کرے۔حسن گنگو ابھی اسی سوچ میں تھا کہ محمد تغلق دکن گیا اور وہاں جا کر اس نے اپنے استاد تغلق خان کو دولت آباد کا فرمانروا بنا دیا اور یہ حکم عام کر دیا کہ جس کا دل چاہے خواہ وہ منصب دار ہو یا امیر،تغلق خاں کے ہمراہ دولت آباد میں قیام کر سکتا ہے۔حسن کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا اور وہ دیگر دوستوں کے ساتھ دولت آباد میں جا کر رہنے لگا۔حسن کو جاگیر میں کونجی اور رائے باغ کے کچھ حصے ملے۔

خیر ایک دن ایسا آیا جب حالات نے یاوری کی خاندان مغلیہ کی حکومت ختم ہوگئی اور 4 ربیع الثانی 747ھ کو بروز جمعہ حسن گنگو کے سر پر دستارِ سلطنت رکھی گئی۔چترّ سیاہ جو خلفائے عباسی کا قومی نشان تھا وہ برکت کے لیے حسن کے سر پر سایہ فگن کیا گیا۔دکن کی مملکت میں حسن گنگو کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور اس کے نام کا سکہ جاری ہوا۔یہ بادشاہ ''**علاؤالدین حسن گنگو بہمنی**'' کے نام سے مشہور ہوا۔گلبرگہ کو حسن نے خیر و برکت کی جگہ سمجھا اور اس کو ''**حسن آباد گلبرگہ**'' کا نام دیا۔اور گلبرگہ ہی کو دارالحکومت بنایا۔

ایفائے عہد:

علاؤالدین حسن گنگو بہمنی نے اپنے پرانے محسن کی شرط کو بھی پورا کیا اور اپنے وعدے پر قائم رہا۔گانگو بہمنی جو تغلق کی غلامی سے سبکدوش ہو کر آیا تھا اسے دکن کے خزانۂ شاہی کا مختار بنا دیا۔اور دوسرا یہ وعدہ بھی پورا کیا کہ اس کے نام کو اپنے نام کا جزو بنا لیا۔اور طغراء شاہی فرمانوں میں ہر جگہ اس کا نام بھی لکھا جانے لگا۔جو کہ یہ تھا۔''**کمترین بندہ حضرت سبحانی علاؤالدین حسن گانگوئے بہمنی**'' اور مابعد کے شاہی فرمانروائوں کے کے ناموں کے ساتھ بھی بہمنی کا نام لکھا جانے لگا۔گانگو بہمنی سے پہلے مشہور تھا کہ برہمن مسلمانوں کے ماتحت کام نہیں کرتے تھے بلکہ الگ اپنی دینی تبلیغ اور علوم نجوم کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتے تھے۔

بہمنی دور حکومت میں اردو ادب:

آٹھویں صدی ہجری سے دکن میں علم و ادب کی ابتداء ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔اس زمانے کی تصانیف کے جو نمونے اب موجود ہیں وہ زیادہ تر مذہبی کتابوں کی صورت میں ہیں اور ان کتابوں کے مصنف اس وقت کے صوفی مشرب لوگ تھے۔جن میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام حسبِ ذیل ہیں۔

-01 گنج الاسلام شیخ عین الدین

-02 خواجہ سید گیسودراز

-03 شاہ میراں جی

-04 مولانا وجہی

-05 سید شاہ میر

نوٹ:

مندرجہ بالا لوگ زیادہ تر نثر نگار تھے۔ ان کی تصنیفی خدمات کو پچھلے سوال میں تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔ وہاں سے ان کی خدمات کو یاد کرلیں اس طرح سے یہ سوال مکمل ہو جائے گا۔

☆☆☆☆☆

03- اُردُو ادب کے فروغ میں گولکنڈہ کی خدمات

تمہید:

جب بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو اس کے بعد دکن میں پانچ خود مختار ریاستیں قائم ہوئیں۔ جو مندرجہ ذیل شہروں میں حسبِ ذیل ناموں سے مشہور تھیں۔

01	گولکنڈہ	میں	قطب شاہی
02	بیجاپور	میں	عادل شاہی
03	احمد نگر	میں	نظام شاہی
04	برار	میں	عماد شاہی
05	بیدر	میں	برید شاہی

شاہانِ گولکنڈا و بیجاپور نہایت قدر دانِ فن، مذہب اور قابل بادشاہ تھے۔ خود بھی شاعر اور شاعروں کے بڑے قدر دان اور مربی تھے۔ اس زمانے میں اردو کو دکنی زبان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ زمانہ دکنی زبان کی ترقی کے لیے نہایت قیمتی زمانہ تھا۔ شاہی محلوں میں موجود ہندو رانیوں کی وجہ سے دیسی زبانوں کو اور بھی تقویت پہنچی۔ **یوسف عادل شاہ** کی بیوی جو ''**بوبو جی**'' کے نام سے مشہور تھی مکندر راؤ مرہٹہ کی بہن تھی۔ ''**بھاگ متی**'' سلطان **محمد قلی شاہ** کی محبوب بیوی تھی۔ احمد نگر کے والی **احمد نظام شاہ** کی ماں بھی ایک ہندو عورت تھی۔ ان ہندو زنانِ شاہاں کی وجہ سے دیسی زبان نے بہت ترقی کی۔

مندرجہ بالا پانچ خود مختار حکومتوں میں سے پہلی دو حکومتیں یعنی گولکنڈا کے قطب شاہان اور بے جاپور کے عادل شاہان کی ریاستیں ادبی حوالے سے نہایت اہم ریاستیں مانی جاتی ہیں۔ اب ادبی حوالے سے پہلے گولکنڈا اور پھر بے جاپور کے بارے میں تفصیل پیش کی جائے گی۔

سلطنتِ قطب شاہی

(1518ء۔1687ء)

سلطان قلی قطب الملک نے 1518ء میں جنوب میں ایک خود مختار حکومت قائم کر کے گولکنڈہ کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔اورنگزیب عالم گیر کے زمانے میں 1687ء تک یہ سلطنت علیحدہ اور آزاد رہی، جس کے بعد اورنگ زیب عالم گیر نے اس سلطنت کو فتح کر کے مغلوں کی حکومت میں شامل کرلیا۔قطب شاہیوں کے دورِ حکومت میں آٹھ حکمران تخت نشین رہے۔جن کے نام بالترتیب یہ تھے۔

شاہانِ گولکنڈا کے نام

01	سلطان قلی قطب شاہ	05	محمد قلی قطب شاہ
02	جمشید قلی قطب شاہ	06	سلطان محمد قطب شاہ
03	سبحان قلی قطب شاہ	07	عبداللہ قطب شاہ
04	ابراہیم قلی قطب شاہ	08	ابوالحسن قطب شاہ (معروف بہ **تاناشاہ**)

گولکنڈا کے ان فرمانرواؤں کے ادب کے لحاظ سے جو کارنامے ڈاکٹر انور سدیدؒ نے ''اردو ادب کی تاریخ'' میں لکھے ہیں وہ حاضر خدمت ہیں۔

01 سلطان قلی قطب الملک (1518ء۔1543ء)

سلطان قلی میر علی ترکوں کے مشہور قبیلہ بھارلو سے تعلق رکھتا تھا۔اس خاندان کے بعض افراد کا یہ دعویٰ ہے کہ سلطان قلی، میرزا جہاں شاہ مقتوں کی اولاد میں سے تھا۔بہر حال کچھ بھی ہو یہ امر مسلم ہے کہ سلطان قلی ہمدان میں پیدا ہوا۔سلطان محمد شاہ لشکری کی حکومت کے آخری دنوں میں سلطان قلی دکن میں آیا اور محمد شاہ ترکی غلاموں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔محمد شاہ کو ترکی غلاموں سے بہت دلچسپی تھی اور انہیں وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔

سلطان قلی گولکنڈہ کے لیے کوئی نیا حکمران نہیں تھا۔گولکنڈہ کی آزادی سے قبل اس نے تلنگانہ کے علاقے میں چار سال تک گورنر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔بہمنی دربار میں اس کا شمار ایسے سپاہ سالاروں میں ہوتا تھا جو بیک وقت صاحبِ علم و فضل بھی تھے اور میدان کارزار کے سرمہ بھی۔یہی سبب تھا کہ محمود شاہ بہمنی نے اسے ''**صاحب سیف وقلم**'' کے خطاب سے نوازا تھا۔

سلطان محمد شاہ نے سلطان قلی کو امارت کے درجے پر فائز کر کے اسے گولکنڈا اور اس کے مضاف کا امیر بنایا کچھ عرصے بعد ان کو اسی علاقے کا سپہ سالار مقرر کیا گیا اور شاہی فرامین میں اس کے نام کے ساتھ ''**صاحب السیف والقلم**'' کا لقب لکھنے کا حکم دیا۔

جب سلطان محمود بہمنی کی سلطنت زوال پذیر ہوئی تو ۹۱۸ھ میں سلطان قلی نے بادشاہت کا دعویٰ کیا اور اپنے آپ کو ''**قطب شاہ**'' کے خطاب سے موسوم کر کے خود مختار حکومت قائم کر لی۔خود شیعہ مکتبِ فکر کا پیرو تھا اسی وجہ سے اپنے خطبے میں سے تین

خلفاء کے اسمائے گرامی نکال دیئے اور ایران کے شاہ عباس صفوی کی پیروی میں بارہ اماموں کے اسماء گرامی کو اپنے خطبے کی زینت بنایا۔

''تاریخِ فرشتہ'' کے مطابق قطب شاہ نے بڑی لمبی زندگی پائی۔ وہ تینتیس (۳۳) سال تک تخت نشین رہا۔ اس کا بڑا بیٹا جمشید قلی اس انتظار میں تھا کہ کب اس کا باپ مرے اور وہ تخت نشین ہو۔ جمشید نے ایک گہری سازش کے تحت ایک ترک غلام کے ذریعے سے اپنے باپ کو قتل کروایا۔ ایک دن سلطان قلی قطب شاہ دریا کے کنارے بیٹھا ہوا اپنے پاس رکھی ہوئی ایک جواہرات کی صندوقچی کو دیکھ رہا تھا اور اس کا بڑا بیٹا جمشید بھی اس کے پاس بیٹھا تھا۔ ترک غلام نے پیچھے سے آ کر سلطان قلی کو ایک تلوار کے وار سے قتل کر دیا جمشید نے افشائے راز کے خوف سے اس غلام کو وہیں پر قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہوا۔ (بحوالہ ''تاریخ فرشتہ''۔ ج:۲۔ص:۴۶۰)

سلطان قلی خود بھی اردو کا کثیر الجہات شاعر تھا۔ اس نے شاعری میں ہند اسلامی تہذیب کا نقش ابھارنے کی سعی کی۔ اس کی زندگی کا زیادہ تر حصہ میدانِ جنگ میں بسر ہوا۔ لیکن اس نے ''آش خانہ'' کے نام سے ایک محل بنوایا۔ جہاں شاعر اور ادیب اکھٹے ہوتے اور ان کا کلام سُنا جاتا۔

02 جمشید قلی قطب شاہ (1543ء۔1550ء)

جمشید نے مملکت کو سیاسی اعتبار سے مضبوط بنانے میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ تاہم اپنے ساتھ سالہ عہد حکومت میں گولکنڈہ کی عوام کی نظروں میں اس کی وہ حیثیت نہ بنی جس کا وہ حقدار تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چند عام روایتوں میں اس پر اپنے بوڑھے باپ کے قتل کا الزام تھا۔ جمشید قلی خود فارسی زبان کا شاعر تھا اور شعراء کا بڑا قدر دان تھا۔ وہ فارسی میں فی البدیہہ شعر بھی کہتا تھا۔ قطب شاہی دور کا یہ دوسرا فرمانروا سات سال اور چند ماہ کی حکومت کرنے کے بعد تپ دق کی بیماری کی وجہ ۹۵۷ھ کو سفرِ آخرت اختیار کر گیا۔

03 سبحان قلی قطب شاہ (XXXX ء۔XXXXء)

جمشید کے انتقال کے بعد اس کے کم سن بیٹے سبحان قلی کو سات سال کی عمر میں تخت نشین کیا گیا۔ سبحان قلی قطب شاہ کی کم سنی کی وجہ سے اربابِ سیاست کا ایک گروہ اس کے خلاف ہو گیا تھا۔

04 ابراہیم قطب شاہ (1550ء۔1580ء)

سبحان قلی قطب شاہ کے بعد اس کے چھوٹے بھائی ابراہیم قطب شاہ نے 1550ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ ایک مبارک ساعت میں تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوا اس کے بہی خواہوں اور جانثاروں نے اس موقعے پر بڑی دولت لٹائی۔ ابراہیم نے اس روز بارہ ہزار طلائی ہون غریبوں محتاجوں اور فقیروں میں تقسیم کر کے رعایا کو خوش کیا۔

ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں ادبی کاموں نے زیادہ تیزی پکڑی۔ وہ خود صاحب علم تھا اور اپنے دربار میں علماء اور فضلاء کی محافل لگائے رہتا تھا۔ اس نے عربی، فارسی اور ترکی کے ساتھ ساتھ دیسی زبانوں یعنی تلیگو اور دکنی کی سرپرستی شروع کی اور حقیقی طور پر اس زمانے میں دکنی (اردو) کی ترقی کا آغاز ہوا۔

ابراہیم قطب شاہ تلیگو زبان کا سب سے پہلا سرپرست اور قدر دان بھی تھا۔ اس زمانے کے متعدد شاعروں نے اپنے تلیگو زبان کی

شاعری پر ابراہیم قطب شاہ کی سرپرستی کی وضاحت پیش کی ہیں۔

۹۸۹ھ میں ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہوا۔اس نے کل بتیس (۳۲) سال اور چند ماہ حکومت کی بھاگ دوڑ سنبھالی۔

''اردو ادب کی تاریخ'' کے صفحہ نمبر ۱۰۹ پر ڈاکٹر انور سدید نے **ابراہیم شیرازی** کی ''**تذکرۃ الملوک**'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''**ابراہیم قلی قطب شاہ نے اپنے بیرونی محل کا ایک حصہ شاعروں اور خوش نویسوں کے لیے مختص کر رکھا تھا جہاں ادبا تالیف و تصنیف کا کام کرتے۔ محل کا ایک حصہ ادبی تبادلۂ خیال اور شعر خوانی کے لیے مخصوص تھا۔**''

05 محمد قلی قطب شاہ (1580ء تا 1611ء)

جب ابرہیم قطب شاہ کا انتقال ہوا تو اس کے تین بیٹے بقید حیات تھے۔جن کے نام یہ ہیں۔**محمد قلی**، **خدابندہ** اور **سلیمان علی**۔ان تینوں میں محمد قلی قطب شاہ (**متوفی ۱۶۱۱ء**) سب سے بڑا تھا جو بارہ سال کی عمر میں اپنے باپ کا جانشین ہوا۔اور یہ قطب شاہی حکومت کا پانچوں حکمران تھا۔اور شاہ میرزا اصفہانی کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی۔شاہ میرزا اصفہانی ابراہیم قطب شاہ کے عہد حکومت میں میر جملگی کے منصب پر فائز رہ چکا تھا۔

محمد قلی قطب شاہ اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں **بھاگ متی** نامی ایک بازاری عورت پر عاشق ہو گیا تھا۔اور ایک ہزار سواروں کو اس عورت کے حلقۂ ملازمت میں داخل کر دیا تا کہ وہ امیروں کی طرح دربار میں آمد و رفت رکھ سکے۔اسی زمانے میں لوگ گولکنڈا کی آب و ہوا سے متنفر ہو گئے اور شہر چھوڑنے کی ٹھان لی۔تو محمد قلی نے اس شہر سے چار کوس کے فاصلے پر ایک نیا شہر تعمیر کروایا اور اس کا نام **بھاگ متی کے** نام پر ''**بھاگ نگر**'' رکھا۔یہ شہر محمد قلی کو اتنا پسند آیا کہ اس نے ''بھاگ نگر'' کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔بعد میں لوگوں نے اعتراز کیا کہ اس شہر کا نام ایک بازاری عورت کے نام پر ہے تو اس پر محمد قلی بہت نادم ہوا اور اس شہر کا نام تبدیل کر کے ''**حیدر آباد**'' رکھ دیا۔مگر اس تبدیلی کا کوئی اثر نہ ہوا اور لوگ اس شہر کو بھاگ نگر ہی کہتے رہے۔(دانیال گائیڈ میں لکھا ہے کہ یہی بھاگ نگر موجودہ حیدر آباد دکن ہے) یہ شہر پانچ کوس کے فاصلے پر پھیلا ہوا تھا اور آب و ہوا کی نسبت سے یہ اپنی مثال آپ تھا۔یہ شہر ہر عام و خاص کو پسند تھا اس کے اکثر بازار ندی کے کنارے پر واقع تھے۔بازاروں کے دونوں طرفین میں ندیاں بہتی تھیں اور ہر ندی کے دونوں طرف سایہ دار درخت تھے۔تمام بازاروں کو چونے اور پتھر سے تعمیر کیا گیا تھا۔یہ شاہی محل تعمیر کے حوالے سے واقعی بے نظیر تھے۔

قلی قطب شاہ کو اپنے بھائیوں سے بے پناہ محبت تھی وہ ہر وقت اپنے بھائیوں کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔اس کے بھائی بھی اس کے بڑے قدر دان تھے۔تیس سال کے عرصۂ حکومت میں قلی قطب شاہ ایک بار بھی اپنی بھائیوں پر ناراض نہیں ہوا۔یہ ایک ایسی خوبی ہے جو ہر بادشاہ میں نہیں پائی جاتی۔غلام قاسم فرشتہ کہتے ہیں کہ محمد قلی کو محبت اہل بیتؑ کا پورا پورا صلہ مل گیا تھا کہ ایران کے شاہ عباس صفوی نے اپنے بیٹے کے لیے محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی کا رشتہ طلب کر لیا تھا اور محمد قلی نے یہ پیشکش بارضا و رغبت قبول کر لی اور اپنی بیٹی کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

محمد قلی قطب شاہ دکن کے رنگ و جمال کا شاعر تھا۔اس کی رگوں میں ترک باپ کا خون تھا لیکن ماں (بھاگیہ ونی) دکنی تھی۔اس کی

رندی وسرمستی خالصتہً ایرانی مزاج کی ہے لیکن محبوب کے گرد چکور کی طرح گھومنے کا انداز ہندوستانی ہے۔ ہند ایرانی تہذیب کے دھارے قلی قطب شاہ کی شاعری میں گھل مل کر سامنے آتے ہیں۔

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ ایک ایران سے ایک عالم، مدبر اور شاعر **''میر مومن استرآبادی''** دکن میں آئے تھے جو 25 سال تک محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں وکیل سلطنت رہے۔ میر مومن دینوی اور دنیاوی امور میں نہایت ہی اہل علم وفضل شخص تھے۔ شعروشاعری سے انہیں کافی لگاؤ تھا اور ان کے اشعار اس زمانے میں ہر عام وخاص کی زبان پر رہتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ میر مومن سے بہت زیادہ عقیدت تھی ،اس نے تمام معاملاتِ حکومت میر صاحب کے سپرد کر رکھے تھے اور خود اپنے بھائیوں کے ساتھ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا رہا۔

قلی قطب شاہ کی شعری کلیات زبان دکنی، تلنگی اور فارسی میں ایک ضخیم کتاب کی صورت میں موجود ہے۔ اور اس کے تقریباً ۱۸۰۰ صفحات ہیں۔ اور ان میں یہ اصناف شاعری موجود ہیں: مثنویاں، قصیدے، ترجیع بند، مرثیے اور رباعیات۔

اس کلیات کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) سے زائد اشعار کہے تھے۔ ان کا کلام سادگی اور شیرینی کا نمونہ ہے اس کے علاوہ ان کے اشعار میں صوفیانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ مرقع نگاری اور مناظر قدرت جنہیں سماں باندھنا کہتے ہیں اس کی بنیاد بھی محمد قلی قطب شاہ ہی نے رکھی تھی۔

قلی قطب شاہ تعلیم تربیت میں اپنے بھائیوں سے کم تھا مگر شاعری میں مہارت رکھتا تھا۔ فارسی کے بلند پایہ شاعروں خوصاً، حافظ شیرازیؔ، خاخانی، ظہیر فاریابی اور کا اس نے بنظر غیر مطالعہ کیا تھا۔ حافظ شیرازی کی متعدد غزلوں کا اس نے دکنی اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ محمد قلی کی قادرالکلامی کا یہ حال تھا کہ وہ روزانہ اسی طرح شعر کہنے پر قادر تھے کہ جس طرح روز دریا میں موجیں اڑتی ہیں۔ لیکن اس کی روانی میں کوئی فرق ن ہیں آتا

محمد قلی کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت انداز بیان کی سادگی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات زندگی اور جذبات ومحسوسات کو سیدھے سادھے اسلوب اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کا عادی تھا۔

محمد قلی ایک کثیر المحبوب شاعر بھی ہے اور اس کے کلام میں موضوعات اور مضامین کا تنوع بھی ہے۔ اس نے اپنی متعدد محبوباؤں جیسے: گوری، سانولی، چھبیلی، ننھی، پیاری جیسے نام دے کر محبوب کے حسن وجمال کی تعریف بھی کی ہے اور مختلف نوموضوعات جیسے: حمد ومناجات، نعت ومنقبت، عید و تہوار، بسنت، نوروز، سالگرہ (برس گانٹھ)، برسات (مرگ)، ٹھنڈ کالا، خداداد محل، باغِ محمد شاہی، شاہی ہاتھی، چوگان، پھوکڑی پھو وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

محمد قلی نے ایک ایسے دور میں صنفِ غزل پر باقاعدہ اور خصوصی توجہ کی جب کہ دبستان دکن میں مثنوی کا سکہ چل رہا تھا۔ محمد قلی کی شاعری نے اپنے عہد اور ماحول کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ اس کے کلام کے مطالعے سے اس دور کی سماجی زندگی کے بارے میں بہت کچھ مواد حاصل ہوتا ہے۔ شادی بیا کی رسومات، رہن سہن کے طور طریقے مختلف موسموں عیدوں، تہواروں اور کھیلوں وغیرہ کی تفصیلات کے دلچسپ مرقعے اس کی شاعری میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔

محمد قلی کی شاعری نہ صرف اس کی منظوم سوانح حیات ہے بلکہ اپنے دور کی ایک مستند تاریخ بھی ہے جس میں چار سو سال پہلے کی زندگی کی تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اکثر مثنویاں خاص ہندوستانی پھلوں، ایک مثنوی ہندوستانی ترکاریوں اور ایک مثنوی شکاری چڑیوں کے متعلق ہے۔ بعض نظموں میں شادی بیا اور ولادت کے رسم ورواج بیان کیے گئے ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی تہوار مثلاً: ہولی، دِوّالی، بسنت، عید فطر اور بقر عید وغیرہ کا ذکر بھی نہایت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ بعض نظموں میں ہندوستانی موسموں خوصاً برسات کا ذکر ملتا ہے اور انہوں نے صراحی و ساغر کے مابین ایک دلچسپ مکالمے کو بھی نظم کی شکل میں لکھا تھا۔ ان کے اکثر قصائد حمد ونعت کی شکل میں ہیں۔ منقبت لکھنے کے ماہر تھے اور انہوں نے ایک قصیدہ باغ محمد شاہی کی تعریف میں بھی رقم کیا تھا۔ معرکہ کربلا پر نہایت پُرسوز مرثیے بھی ان کے کلیات کا حصہ ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ سے قبل اگرچہ فیروز، سید محمود اور ملا خیالی جیسے قادر الکلام شعراء موجود تھے لیکن کسی کا بھی کلام مرتبہ دیوان کی شکل میں نہیں ملتا۔ قلی قطب شاہ وہ پہلے شخص ہیں جن کی شاعری کتابی صورت میں موجود ہے۔ ہاں البتہ **ولی کو غزل کا پہلا باقاعدہ شاعر** مانا جاتا ہے کہ گولکنڈا کے شعراء کے زمانے میں نہ تو غزل اتنی عام تھی اور نہ ہی اردو زبان اتنی پختہ تھی۔ مگر پھر بھی قلی قطب شاہ وہ پہلے شخص ہیں جن کا دکنی (اردو) کا کلام طبع ہوا۔ ان کے اپنے خاندان کے علاوہ دوسرے کئی لوگ گزرے ہوں گے جن کا کلام اب ناپائید ہو چکا ہے۔

مختصر یہ کہ قلی قطب شاہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اپنے کلام کی تدوین کی اور زبان اردو کو ایسا وسیع کیا کہ آئندہ وہ ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہوگئی۔ انہوں نے ایک ایسے شعری ادب کی بنیاد رکھی جس کے پیرو اور مختتم میر و سودا، انیس و دبیر اور ذوق و غالب ہوئے۔

قلی قطب شاہ کی حکومت کے اس مختصر سے عرصے میں اس کی عطا یہ ہے کہ دکن کی عوامی زبان خواص کے قریب آ گئی۔ اس نے قصیدہ، غزل، مرثیہ، مثنوی، قطعہ، رباعی سب اصناف میں شاعری کا پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ایک دیوان حروفِ تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا۔ اور اشعار میں سترہ تخلص استعمال کیے۔ ان کو اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

بنیادی طور پر قلی قطب شاہ غزل کا شاعر ہے۔ یہاں تک کہ اس کی وہ تخلیقات بھی جنہیں تسلسل بیان کی وجہ سے عنوانات قائم کر کے نظم قرار دیا گیا ہے دراصل محمد قلی کی غزلیں ہی ہیں۔

نمونہ کلام یہ ہے:۔

؎ دل نانگ خدا کن کہ خدا کام دوئے گا
تمنن کی مرادن کے بھرے جام دوئے گا

؎ کرتے ہیں دعویٰ شعر کا سب اپنی طبع سوں
بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا (قلی قطب شاہ)

قلی قطب شاہ حواسِ خمسہ کو شرشار کرنے والا شاعر ہے۔ اس کی شعری لغت میں پنجابی الفاظ کا عمل دخل بھی نمایاں ہے۔ عورت اور فطرت کا حسن اس پر حسّی مسرت کے در وا کر دیتا ہے اور قلی قطب شاہ عیش ونشاط میں شربور ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

؎ پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج اک پل جیا جائے نا (قلی قطب شاہ)

قلی قطب شاہ نے مذہنی شاعری بھی کی لیکن اس نے مذہبی شاعری سے بھی اکتسابِ مسرت ہی کیا ہے۔

؎ نبیؐ صدقے قطب شاہ تائیں جم جم
سہادیں رنگ بھرے حساں سہانی (قلی قطب شاہ)

اس کے مرثیوں میں درد وغم کی لہر موجزن ہے اور اسے اس درد کا نمائندہ مرثیہ نگار شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

؎ لہو روتی ہیں بی بی فاطمہؑ اپنے حسینؑا تیں
او لہو لالی کا رنگ سا تو لگن اپرال چھایا ہے
خدایا قطب شاہ کو بخش توں حرمت اماماں کی
کہ ان کی مدح کا حلقہ مرے کن میں سمایا ہے (قلی قطب شاہ)

اس کے زمانے میں امن وامان قائم رہا اور ادب کو ترقی کے مواقع میسر آئے۔ محمد قلی خود دکنی اور تلیگو میں شعر کہتا تھا۔ دکنی شاعری میں اس کا تخلص ''**قطبؔ**'' اور تلیگو شاعری میں اس کا تخلص ''**معانیؔ**'' تھا۔ اس نے اپنے دربار میں بہت سے اہل علم جمع کر رکھے تھے۔ اس دور میں **مرزا محمد امین** نے ''**خمسہ نظامی**'' کا جواب لکھا اور کئی مثنویاں 'شیریں'، 'خسرو' اور 'لیلیٰ مجنوں' جیسی داستانیں تحریر کیں۔

ڈاکٹر انور سدیدؒ کی ''اردو ادب کی تاریخ'' کے صفحہ **۱۰۹** پر لکھا ہے کہ:

''قطب شاہی عہد کا سب سے بڑا ادبی المیہ یہ ہے کہ ۱۶۱۴ء میں محمد قلی قطب شاہ کا تعمیر کردہ خداداد محل جس میں ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا جل گیا اور اس کے ساتھ ہی اس عہد کے بہت سے ادبی آثار صفحہ عالم سے مٹ گئے۔''

06 سلطان محمد قطب شاہ (1611ء - 1625ء)

سلطان قلی کے بعد ۱۶۱۱ء میں اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ (متوفی ۱۶۲۵ء) جانشین ہوا جس نے چودہ برس تک حکمرانی کی۔ سلطان محمد قطب 1592ء میں گولکنڈا میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو فن تعمیر سے خصوصی دلچسپی تھی اس نے اپنے عہد میں مندرجہ ذیل عمارتیں تعمیر کروائیں۔ **الٰہی محل**، جامع مسجد معروف بہ **مکہ مسجد**، **محمدی محل** اور **دال محل** وغیرہ۔

اردو اور فارسی کی نظم ونثر میں خوب لکھتے تھے۔ ان کے دو دیوان ہیں ایک فارسی میں ہے اور دوسرا دکنی زبان میں ہے۔ ان دو اوین میں شاعری کی اکثر اصناف موجود ہیں۔ وہ فارسی میں: **ظل اللہ** اور اردو میں: **قطب شاہؔ** تخلص کرتے تھے۔

سلطان محمد قطب سے پہلے سلطان محمد قلی بھی اپنا تخلص ''قطب شاہؔ'' کرتے تھے۔ ان دونوں بادشاہوں کے تخلص میں یکسوئی ہونے کی وجہ سے ان کا کلام خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔ ان کا یہ تخلص اردو شاعری کے لیے اور سلطان محمد قلی کا تخلص فارسی شاعری کے لیے مخصوص تھا۔ ان

دونوں شاہوں کے دیوان حیدرآباد میں نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

سلطان محمد قطب شاہ خود فارسی اور اردو کا شاعر تھا۔علم دوست ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ و مذہب کا دلدادہ بادشاہ تھا۔انہیں کتابیں جمع کرنے اوران پر اپنی رائے تحریر کرنے اور اپنے دستخط نسب کرنے کا بہت شوق تھا۔گولکنڈا کے شاہی کتب خانہ کی تصنیفات پر محمد وقطب شاہ نے دیباچے اور نوٹ لکھے ہیں۔جس سے اس کی **تنقیدی بصیرت** کا پتہ چلتا ہے۔اس کا بڑا کارنامہ قلی قطب شاہ کے دیوان کی تدوین اوراس کا منظوم دیباچہ ہے اور یہی اس کے اردو کلام کی یادگار ہے۔قلی قطب شاہ کی شاعری کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ:

؎ سو کچھ شاعری بیچ شہہ دھر کمال بچن کہہ کے موتیاں نمن صدف ڈھال
کہے نیں کہیں شعر میں وصف اپس جو اچھ شعر کے فن میں ایتا سو بس
نہ کرتے تھے ہرگز سو ختمِ کلام بغیر اُن علّی کا لئے باج نام

ان کا نمونہ کلام یہ ہے:۔

؎ سکھ تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ
محبت پر نظر رکھ بسر غیظ (سلطان محمد قطب)

؎ دو لب ترے رنگیلے یاقوت کر دیئے رنگ
لے بھیک رنگ عقیقاں رنگیں ہوئے یمن میں (سلطان محمد قطب)

اس دور کو اردو کے لیے سنہری دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اسی دور میں ملاں وجہی، غواصی، قطبی، ابن نشاطی اور جنیدی وغیرہ جیسے شعراء اور نثر نگار بہت مشہور ہوئے۔

07 عبداللہ قطب شاہ (1625ء .1672ء)

محمد قطب شاہ کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ (متوفی ۱۶۷۲ء) تخت نشین ہوا۔وہ 1614ء میں پیدا ہوا اور اپنے باپ کی وفات کے بعد 1625ء میں تخت نشین ہوا۔تخت پوشی کے وقت عبداللہ کمسن تھا اور اس وقت اس کی عمر صرف 12 برس تھی چنانچہ اس کی ماں حیات بیگم اصل حکمران تھی۔عبداللہ قطب شاہ تقریباً 35 سال تک سریر آرائے سلطنت رہا۔بدقسمتی سے وہ بڑا ہو کر عیاش نکلا اور یوں مغلوں کو گولکنڈا پر حملہ کرنے کا پہلا موقع ملا۔اس نے شاہ جہان کے سامنے گردن اطاعت خم کی اور ایک سالانہ رقم بطور خراج تحسین دینا منظور کی۔

اس بادشاہ کے زمانے میں بھی اردو ادب کو فروغ ملا۔عبداللہ خود ایک حسن پرست، جمال پسند شاعر تھا اور صاحب دیوان بھی تھا۔وہ کوزہ گر کے بجائے گلِ گوزہ میں دلچسپی لیتا تھا۔اگرچہ اس کا عہد سیاسی ابتری کا شکار رہا لیکن پھر بھی مجلسی اور تہذیبی اعتبار سے یہ دور بے حد رنگین نظر آتا ہے۔عبداللہ فارسی اور دکنی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا اور **''عبداللہ''** تخلص کرتا تھا۔ان کے دیوان اردو اور فارسی دونوں میں موجود ہیں۔ان کے اشعار بہت صاف اور شیریں ہیں۔ان کے عہد میں اکثر کتابیں انہی کے نام سے لکھی گئیں۔مثلاً: برہان قاطع اور لغاتِ فارسی وغیرہ۔

عبداللہ قطب شاہ نے مروجہ اصناف میں شاعری کی مگر اس کا حقیقی رنگ غزل میں کُھلتا ہے۔وہ نشاط کو اپنے اوپر نچھاور کرتا ہے اور حسن کے

ساتھ ساتھ متعلقاتِ حسن کو یوں اجاگر کرتا ہے کہ ایرانی شراب دیسی پیالوں میں چھلکنے لگتی ہے۔لیکن تہہ داری اور مزیّت کا فقدان پیدا ہو جاتا ہے۔

- میں اے لالا' دکھی فالا' ہنگام آلا ہے ڈھپکالا ہے متوالا توں پی پیالا ہو خوش حالا نہ کر چالا
- سکھی آ مل کے تِل تِل ذوق کر لیں دنیامیں کوئی نئیں آیا دوبارا
- لٹکتے آج پھولاں کے چمن میں پیا کے ہات میں لے ہات گُمنا

تری پیشانی پر ٹیکا جھمکتا
تماشا ہے اُجالے میں اُجالا

- آبِ حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث
- جو کچھ راز پردہ میں ہیں غیب کے سو مخفی نہیں اس پہ ہیں آشکارا

اسی دور میں ملا وجہی نے ''سبرس'' لکھی۔اسکے ساتھ **ملا عبدالحکیم** جیسے مورخ، **برہان تبریزی** جیسے فرہنگ نگار بھی اسی دربار سے وابستہ تھے۔اسی دور میں گولکنڈا میں طرحی مشاعروں کو بھی فروغ حاصل ہوا اور ادبی نثر کی صورت نکھر کر سامنے آئی۔

نوٹ: ملا اسداللہ وجہی، غواصی اور ابن نشاطی اسی دور کے شاعر اور ادیب ہیں۔اسی دور میں غواصی کو ''ملک الشعراء'' کے عہدے تک پہنچنے کا موقع ملا۔

08 ابوالحسن تاناشاہ (1687ء - 1672ء)

سلطان عبداللہ کی اولاد نرینہ نہیں تھی چنانچہ اس کا داماد ابوالحسن تاناشاہ تخت نشین ہوا۔یہ گولکنڈا کا آخری تاجدار تھا اور نہایت نازک مزاج تھا اس کے دور میں مغلوں نے ایک اور حملہ کر کے گولکنڈہ سے قطب شاہی حکومت کو ختم کر کے گولکنڈا کو مغل حکومت کا حصہ بنالیا۔گولکنڈہ سات ماہ کے محاصرے کے بعد 1687ء میں فتح ہوا اور سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ قرار پایا تو ابوالحسن قید کر لیا گیا اور اس کی باقی عمر قید میں گزری۔مشہور ہے کہ اس کو حقہ پینے کو بہت شوق تھا لہٰذا اس نے قید خانے میں بھی حقہ پینے کی اجازت طلب کی۔

تاناشاہ عالموں کا مربی اور فاضلوں کا قدردان تھا۔وہ خود بھی اردو کا اچھا شاعر تھا۔اس کا دیوان تو ابھی تک دریافت نہیں ہوا لیکن تذکروں میں اس کی دو ایک غزلوں کا پتا چلتا ہے۔اس کی غزل زبان کے نئے اسلوب اور تخیل کی بلند پروازی کی مثال ہے۔

- اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ جیوں گل شگفتہ ہو کر مری انجمن میں آ
  اے جانِ بوالحسن توں اچھے خوش لٹک ستے بندِ قبا کوں کھول کے صحنِ چمن میں آ

تاناشاہ کے مرثیہ میں بلا کا حزن وغم پایا جاتا ہے۔مثال ملاحظہ کیجئے۔

- کیوں پڑا اندھ کار جوں تو شمع تھا فاطمہؑ کے انجمن کا یاحسینؑ
  کیوں نہ مر جائے ترے بن خلق سب جیو ہے تو جگ کے تن کا یاحسینؑ

اب قطب شاہی سلطنت اگرچہ زوال آمادہ ہو چکی تھی لیکن اس دور میں بھی شاعری کی شمع جگمگاتی رہی۔چنانچہ غلام علی نے ''پدماوت''

کا ترجمہ غلام علی برمیؔ کی فارسی کتاب سے اردو میں کیا۔ فائزؔ نے مثنوی ''رضوان شاہ روح افزاء'' لکھی۔ سیوکؔ نے مثنوی ''جنگ نامۂ محمد حنیف'' کا ترجمہ کیا۔ فتاحی نے ''مفید الیقین''، ''خاص الفقہ'' اور ''معراج نامہ'' لکھ کر دکن کی تبلیغی روایت کو تقویت دی۔ طبعیؔ نے مثنوی ''بہرام وگل اندام'' لکھی۔ محبّ نے ''معجزہ فاطمہؑ'' لکھی۔ شغلیؔ نے ''پند نامہ'' لکھی۔ محمود بحریؔ کی مثنوی ''من لگن'' اور ''بنگام نامہ'' میں مقامی محاورے کی تخلیقی حیثیت کو ایک مرتبہ پھر نمایاں کرنے کی کاوش نظر آتی ہے۔ بحریؔ کو دکن سے جو وابستگی تھی اس کا اظہار یوں ہوا۔

بحریؔ کو دکھن یوں ہے کہ جیوں نل کو دمن ہے
پس نل کو ہے لازم جو دمن چھوڑ نہ جانا

سلطنتِ قطب شاہی کے دیگر شعراء ونثر نگار:

گذشتہ صفحات میں سلطنتِ گولکنڈا کے شہنشاہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب آئندہ صفحات میں اس دور کے مشہور شعراء اور نثر نگاروں کی ادبی خدمات زیرِ قلم لائی جائیں گی۔

ابن نشاطی (شیخ فخر الدین نشاطی):

اس زمانے کے شعرائے دکن میں سے ابن نشاطی بہت مشہور ہوئے ہیں۔ گولکنڈہ کے رہنے والے تھے اور سلطان عبداللہ شاہ کے درباری شاعر تھے۔ ''**مثنوی پھول بن**'' ان کی مشہور مثنوی ہے۔ اس مثنوی کی زبان دکنی ہے اور اس میں عشق وعاشقی کا ایک قصہ ہے۔ اس مثنوی کا نام اس کی ہیروئن کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اور ایک خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مثنوی ایک فارسی کتاب ''**بسامین**'' کا ترجمہ ہے۔ اس میں سکندر اور لقمان وغیرہ کی حکایات بھی ہیں۔ اور ایک فرضی شہر کا ذکر کیا گیا ہے جس شہر کا نام کنچن پاٹن ہے۔ اس مثنوی کا 130 صفحات کا ایک قلمی نسخہ ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتب خانے میں موجود ہے۔ معمولاً حمد ونعت اور منقبت سے اس کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس کے بعد سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تعریف ہے۔ پھر اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ اس قصہ میں انسانوں کے قالب بدلنے اور جانوروں کے قالب میں آ جانے کا ذکر ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ سرور نے اسی کے مطالعہ کے بعد فسانہ عجائب لکھی ہو۔ اس کی تصنیف ۱۰۷۶ھ میں ہوئی۔

غواصیؔ:

غواصی گولکنڈہ کے رہائشی تھے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ نصرتی نے اپنی گلشن عشق میں اس کا ذکر کیا ہے۔

؎ پڑی کچھ غواصی تنی کر خیال
کیا تازہ باغِ بدیع الجمال

غواصی نے دکنی زبان میں ایک مثنوی لکھی ہے جس میں مصر کے شہزادے سیف الملوک اور چین کی شہزادی بدیع الجمال کے عشق کا ذکر کیا ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے۔ غواصی مذہباً شیعہ تھا اور عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس کا قصہ سیف الملوک غالباً الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ اس مثنوی کے شروع میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد شاعر کی تعریف کی گئی ہے جس کا ذکر مثنوی کے اٹھارہویں

شعر میں ہے۔

غواصی نے ایک اور مثنوی بھی لکھی جس کا نام طوطی نامہ ہے جو ۱۰۴۹ھ میں تمام ہوئی۔اس مثنوی کو سر چارلس لائل نے غلطی سے ابن نشاطی کی طرف منسوب کر دیا۔اصل میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ضیاء بخشی کے فارسی قصہ طوطی نامہ کو غواصی نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔اس کا مآخذ اصل میں سنسکرت کی کتاب ''رسوگا ستبتی'' بتایا جاتا ہے۔فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مدرس حیدر بخش نے غواصی کے اس قصہ سے طوطی نامہ کے نام سے ۱۸۰۱ء میں ایک کتاب لکھی تھی۔

ملا اسداللہ وجہی:

ملک الشعراء اسداللہ وجہی قطب شاہی عہد کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور باکمال نثر نگار ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کا ایک بلند پایہ عالم، فلسفی اور حکیم بھی تھا۔دکنی اردو کے دوسرے شعراء کی طرح وجہی کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا کوئی خاص پتہ نہیں چلتا۔غالباً وہ گولکنڈہ کے چوتھے حکمران ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوئے اور پھر ابراہیم کے علاوہ اس نے مزید تین قطب شاہی عہد کے فرمانرواں محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔

وجہی اپنے دور کا ایک بلند پایہ شاعر و ادیب تھا۔اس لیے فطری طور پر اس کے ہم عصر اور زمانہ مابعد کے شعراء نے اس کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے۔سب رس کے ایک قلمی نسخے کی ترقیم سے پتا چلتا ہے کہ وجہی، سلسلہ چستیہ کے ایک صوفی بزرگ حضرت شاہ علیم الدین دکنی کا مرید تھا۔

وجہی نے ''**مثنوی قطب مشتری**''، ''**سب رس**''، ''**تاج الحقائق**'' اور فارسی دیوان کے علاوہ چند دکنی غزلیں اور مرثیے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔وجہی کی دکنی غزلوں اور فارسی کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں اس پر کسی وقت شاہی تاب نازل ہوا تھا۔جس کی وجہ سے اس کو تندستی، مفلسی اور فاقہ کشی کے دن بھی دیکھنے پڑے تھے۔

مثنوی قطب مشتری:

محمد قلی قطب شاہ نے وجہی کو اپنے دربار کا ملک الشعراء مقرر کیا تھا۔اس دور میں وجہی کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔وہ بادشاہ وقت کا دست راست بن گیا تھا۔اسی دور میں اس نے اپنی شاہکار مثنوی ''**قطب مشتری**'' لکھی تھی۔یہ وجہی کی طبع زاد مثنوی ہے جو 1018ھ میں صرف 12 دن کے عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔اس دور کی دیگر مثنویوں کی طرح اس مثنوی کا آغاز بھی حمد و مناجات اور نعت و منقبت سے ہوتا ہے۔اس کے بعد مدح بادشاہ ہے اور پھر وجہی نے شاعری کے متعلق اپنے نظریات اختصار کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

قطب مشتری ایک معرکۃ الآرا مثنوی ہے جس میں وجہی نے بادشاہ وقت سلطان محمد قلی قطب شاہ کو قصے کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔یہ صرف ایک فرضی داستان ہے جس میں قدیم زمانے کے قصوں کی طرح دیوؤں اور پریوں کا ذکر اور محیر العقل واقعات بھی ملتے ہیں۔

تاہم اس مثنوی کے مطالعے سے محمد قلی کے مزاج و کردار پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔اور اس کے عالم شباب کی مصروفیتوں کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔اس مثنوی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے کم و بیش تمام کرداروں کے نام محمد قطب شاہ کے خاندانی نام ''**قطب**'' کی

مناسبت سے تاروں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ جیسے: مشتری، عطارد، زُہرا، مہتاب اور مریخ وغیرہ۔

وجہی کو زبان و بیان پر غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ اس مثنوی میں اس نے انسانی جذبات کی تصویر کشی، کردار نگاری اور منظر نگاری کے بڑے دلکش مرقعے پیش کیے ہیں۔

تاج الحقائق

وجہی اپنے دور کا ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ بلند پایہ نثر نگار بھی تھا۔ اس نے ''تاج الحقائق'' اور ''سبرس'' جیسی اہم تصانیف بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ''تاج الحقائق'' تصوف کے موضوع پر ایک نثری رسالہ ہے جس کا تذکرہ سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے ''سبرس'' کے مقدمے میں کیا تھا۔ اس کتاب میں سلوک اور معرفت کے مسائل کو عام فہم لیکن دلنشین اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ **ڈاکٹر جاوید وششت** تاج الحقائق کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''تصوف کا یہ نثری رسالہ وجہی کا نقش اول ہے اور سب رس نقش ثانی۔ سب رس کے نقطۂ عروج تک پہنچنے کے لیے وجہی کو تاج الحقائق کی منزل سے گزرنا لازمی تھا۔''

سب رس

وجہی کی دوسری نثری تصنیف **''سب رس''** ہے۔ اس کتاب کو وجہی نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1045ھ بمطابق 1635ء میں لکھا تھا۔ ''سب رس'' کا قصہ محمد یحییٰ ابن سبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی نثری تصنیف **''قصۂ حسن و دل''** سے ماخوذ کیا گیا ہے۔

انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری مولوی عبدالحق نے اس کتاب کو عوام الناس سے متعارف کروایا اور انہوں نے اس کتاب کی یہ خوبی بیان کی ہے کہ یہ ایک مسلسل قصہ ہے اور اس کی عبارت ایک ادبی شان رکھتی ہے۔ اور فارسی میں **ظہوری** کے رنگ کی مانند اس کتاب کی اردو نثر مقفیٰ ہے۔ اس کی زبان بہت صاف اور سادہ ہے۔ اور قصہ میں روانی پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کے اشعار کی زبان ویسی ہی ہے جیسی کہ قطب شاہیوں کے کلیات کی زبان ہے۔

تاہم وجہی نے اپنی بے پناہ علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کتاب کو ایک تخلیقی تصنیف کا درجہ دے دیا ہے۔ وجہی نے پیچیدہ اور خشک فلسفیانہ مسائل کو ادبی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سب رس کا اردو نثر کی دو یا تین منتخب کتابوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا اسلوب مقفیٰ ہوتے ہوئے بھی سادہ و پُر کار ہے۔ بعض مقامات پر وجہی نے حقائق حیات کے متعلق صوفیانہ اور حکیمانہ نکات پیش کیے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ کتاب اردو نثر کے لازوال نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔ ''سب رس'' میں انسانی جذبات و احساسات اور انسانی صلاحیتوں اور قوتوں جیسے: عشق، عقل، حسن، غمزہ، عشوہ، ناز، ناموس، ہمت، دل نظر، خیال، وہم، صبر، طمع اور وفا وغیرہ کو کرداروں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

''سب رس'' کا قصہ ایک تمثیلی داستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کے سارے کردار تمثیلی ہیں۔ اس کا قصہ دو سطحوں پر آگے بڑھتا

ہے۔ایک سطح ظاہری کہانی کا انداز لیے ہوئے ہے اور دوسری سطح علم باطنی سے متعلق ہے۔گویا ''سب رس'' کے قصے میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کا بیان ایک ساتھ پہلو بہ پہلو ہوا ہے۔''سب رس'' میں ایک طرف عربی آیات واحادیث، فارسی اشعار اور معقولے ملتے ہیں تو دوسری طرف روزمرہ محاورے اور ضرب الامثال بھی کثرت سے ملتے ہیں۔

''سب رس'' کی زبان مقفیٰ ہے یعنی چھوٹے چھوٹے جملوں میں قوافی کا اہتمام کیا گیا ہے۔تاہم ان قافیوں کو وجہی نے اس قدر مہارت اور ہنرمندی کے ساتھ استعمال ہے کہ کہیں تصنع تک کا شائبہ نہیں ہوتا۔وجہی نے نظم اور نثر کے امتزاج سے ایک نئی طرز کی بنیاد ڈالی ہے چنانچہ وہ کہتا ہے۔

''آج لگن اس جہان میں ہندوستان میں، ہندی زبان سوں، اس لطافت اس چھنداں سوں، نظم ہور نثر ملا کر گلا کرئیں بولیا۔اس بات کوں اس نبات کوں یوں کوئی آبِ حیات میں نئیں گھولیا۔یوں غیب کا علم نئیں بولیا۔'' (ملا وجہی)

ملا غواصی

ملک الشعراء ملا غواصی قطب شاہی دور کا ایک عظیم المرتبت اور بلند قامت شاعر ہے۔اس تاریخ پیدائش، تعلم وتربیت، سن وفات اور خاص طور پر آخری زمانے کے حالات پردۂ تاریکی میں ہیں۔اس کے کلام میں داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوا۔محمد قلی قطب شاہ کے دور میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔اور پھر اس نے محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کا دور غواصی کے شاعری کا عہد زریں ہے۔اس بادشاہ نے نا صرف غواصی کی سرپرستی کی اور اس کو اپنے دربار کا ملک الشعراء بنایا بلکہ قطب شاہی سفیر کی حیثیت سے اس کو بیجاپور روانہ کیا۔اور ''فصاحت آثار'' کے خطاب سے بھی نوازا۔غواصی میراں سید شاہ حیدر ولی اللہ (متوفی 1033ھ) کا مرید تھا۔جن کی مداح میں اس نے متعدد اشعار لکھے ہیں۔

غواصی کی چار مثنویوں ''مینا ستونتی'' (Mena-Satt-Wanti)، سیف الملوک وبدیع الجمال، طُوطی نامہ، اور مثنوی طریقت کے علاوہ غزلوں، نظموں، قصیدوں، مرثیوں اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی منظر عام پر آیا ہے۔

جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے، غواصی کی غزلیں تاثر کی فراوانی، نغمگی وموسیقیت، سوز گداز اور حقیقت نگار کے نقطہ نظر سے اردو غزل کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔مثنوی نگاری کے میدان میں بھی غواصی کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔مینا ستونتی اس کی پہلی مثنوی ہے۔

غواصی کی مثنوی میناست ونتی:

میناست ونتی غواصی کی پہلی مثنوی ہے۔اس مثنوی کے سن تصنیف کا کہیں اتہ پتہ نہیں ہے۔اس مثنوی میں شاعر نے اپنے آپ کو اہل علم کے سامنے ایک نو وارد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔میناست ونتی کو قصہ ہندوستانی اصل کی عشقیہ کہانی سے ماخوذ ہے۔لیکن غواصی کا بیان ہے کہ اس نے ایک فارسی رسالے کو دکنی اردو کا جامہ پہنایا ہے۔اس وقت تک اس قبیل کے صرف ایک ہی قصے ''عصمت نامہ'' کا پتہ چلتا

ہے جو حمیدی کی تصنیف ہے۔اس لیے گمان غالب ہے کہ ''عصمت نامہ'' ہی میناست ونتی کے قصے کا مآخذ ہے۔

اس مثنوی میں غواصی نے مشرقی عورت کی عفت وعصمت کو اجاگر کیا ہے۔ میناست ونتی کا مرکزی خیال عصمت، حیا اور عفت کی اقدار ہیں، جنہیں کہانی کے روپ میں انسانی کرداروں کی زندگی میں دکھایا گیا ہے۔مثنوی کی ابتداء حسب معمول حمد ونعت وغیرہ سے ہوتی ہے۔اس کے بعد بادشاہ بالا کنور کی حسین وجمیل لڑکی چندہ کی داستان عشق ہے۔ جو ایک نوجوان چرواہے لورک پر عاشق ہو جاتی ہے۔ میناست ونتی در اصل ایک ہندوستانی الاصل قصہ تھا۔ جو ساتویں صدی ہجری میں ایک عوامی کہانی کی حیثیت سے مقبول ہوا تھا۔اور جسے قدیم ہندی بھاشا میں داود نے ''چندابن'' میں فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں لکھا اور میاں سادھن نے ''میناست'' میں اس قصے کو موضوع سخن بنایا۔سارے دکنی ادب کی طرح اس مثنوی کی بھی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ فارسی قصے کو سامنے رکھ کر ترجمہ اخذ کرنے کے باوجود غواصی نے اسے دکنی مزاج اور رنگ وروپ میں ڈھال دیا ہے۔ قصے کو پڑھتے وقت نہ ماحول اور فضاء سے اور نہ کردار ومعاشرت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ قصہ فارسی سے اردو میں آیا ہے۔

مثنوی میناست ونتی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ان اشعار میں کٹنی مینا کو اس کے شوہر کے خلاف بہلا پھسلا رہی ہے۔

بتا کیوں تو گوال پرمن دھری
بتا کیوں ترا جان اس پر کری
تو آخر ہے گندی جنم کھوئے گی
برا کھا برے گود میں سوئے گی
بدل گڑ گڑاوے گرجئے سیٹی
یلیکی سینا پھٹ مرے کانپٹی
تجے بولتے میخ پکی اہے سینا
تو اب بھاوتی ہے تجھے کیا کنا

غواصی کی مثنوی سیف الملوک وبدیع الجمال:

مثنوی سیف الملوک وبدیع الجمال 1035ھ کی تصنیف ہے۔اس کا قصہ الف لیلہ کے ایک فارسی نثری ترجمے پر مبنی ہے۔جس میں مصر کے شہزادے سیف الملوک اور جنوں کی شہزادی ''بدیع الجمال'' کی عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔ یہ مثنوی صرف غواصی کی ہی ایک بے نظیر مثنوی نہیں بلکہ دکنی اردو کی شاہکار مثنویوں میں بھی شمار کی جاتی ہے۔''سیف الملوک وبدیع الجمال'' میں غواصی نے جذبات نگاری، سراپا نگاری، رزم نگاری اور منظر نگاری کے بڑے خوبصورت نمونے پیش کیے ہیں۔اس مثنوی کی قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ یہ مثنوی صرف تیس دن یعنی ایک ماہ میں مکمل کی گئی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ: مثنوی ''سیف الملوک وبدیع الجمال''، وہ مثنوی ہے جس نے بیجاپور میں مثنوی نگاری کو نہ صرف رواج

دیا بلکہ اس کے رخ اور انداز کا دھارا بھی موڑ دیا۔ یہ مثنوی اپنے دور میں ایک نمونہ اور ایک مثال کی حیثیت رکھتی تھی۔ مزید ڈاکٹر جمیل جالبی کی ایک اقتباس ہے کہ:

دلچسپ بات یہ ہے کہ مثنوی ''سیف الملوک بدیع الجمال'' کی ہیت' ترتیب اور رنگ ڈھنگ کم و بیش وہی ہے جو وجہی کی ''**قطب مشتری**'' میں ملتا ہے۔ اس میں حمد، نعت، منقبت اور مدحِ عبداللہ قطب شاہ کے بعد وجہی کی قطب مشتری کی طرح اور حسب حال خود گوید کے عنوان کے تحت شاعرانہ دعوے کئے گئے اور اس چوٹ کا جواب دیا گیا ہے جو وجہی نے غواصی پر کی تھی۔

''سیف الملوک بدیع الجمال'' کی پہلی خصوصیت جو آج بھی متاثر کرتی ہے' سادگی ہے۔ غواصی اپنی بات عام زبان میں بغیر مبالغے کے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے ہاں جذبات میں وہ شدت نہیں ہے جو وجہی کی مثنوی کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ''سیف الملوک بدیع الجمال'' سے غواصی کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسے مختلف کیفیات و مناظر حسن و قدرت بیان کرنے پر پورا عبور حاصل ہے۔ وہ مناظر کے بیان سے قصے کو ابھارنے کا کام لیتا ہے اور سراپا کی تصویریں مثنوی کی فضا بنانے کے لئے اختصار کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔

وجہی کے ہاں تفصیل ہے۔ غواصی کے ہاں اختصار ہے۔ وجہی کے ہاں شاعرانہ بیان پر زور ہے۔ غواصی کے ہاں قصے پر زور ہے۔

غواصی کی مثنوی طوطی نامہ:

یہ مثنوی بھی غواصی کی ہے جس میں 45 کہانیاں ہیں۔ یہ مثنوی 1049ھ کی تصنیف ہے۔ اس کا قصہ سنسکرت کی مشہور تصنیف ''شکاسب تتی'' (طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں) کے فارسی ترجمے پر مبنی ہے۔ شکاسب تتی کو مولانا ضیاالدین بخشی نے فارسی میں منتقل کیا تھا۔ اور انہوں نے ستر کہانیوں میں سے باون (52) کا انتخاب کیا۔ غواصی کے طوطی نامے کا ماخذ بخشی کا طوطی نامہ ہے۔ غواصی نے بھی اختصار سے کام لیتے ہوئے باون کہانیوں میں سے صرف پنتالیس (45) کو اپنی مثنوی کے لیے منتخب کیا ہے۔

طوطی نامے کا قصہ اگرچہ غواصی کا طبع زاد نہیں ہے لیکن قصے کی جزیات انسانی نفسیات کی مرقع کشی اور مناظر فطرت کے بیان میں غواصی نے اپنے شاعرانہ کمال کا اس درجے مظاہرہ کیا ہے کہ قدیم اردو کا یہ عظیم فن پارہ محض سنسکرت یا فارسی کا ترجمہ ہی نہیں رہ جاتا ایک منفرد تصنیف کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

اس مثنوی میں طوطے کی زبان سے کہانیاں بیان کرائی گئی ہیں اس میں حکایات کے ذریعے سے اخلاق و محبت' یاد الٰہی' خواب گراں سے بیداری اور علائق دینوی سے حتی الوسع دور رہنے کا سبق دیا گیا ہے۔ اس میں عشق حقیقی اور تصوف کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ مثنوی غواصی کی آخری تصنیف ہے اور اس دور میں لکھی گئی ہے جب غواصی فارغ البالی کی زندگی گزار رہا تھا۔

طوطی نامہ میں اثر آفرینی کا عنصر بھی اس لیے بڑھ گیا ہے کہ اب غواصی کو اپنی بات اختصار سے کہنے میں زیادہ قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ اور فارسی الفاظ و اسلوب کے اثر نے اس پر ایک رچاوٹ پیدا کر دی ہے۔ بھرتی کے الفاظ جو اس کی دوسری مثنویوں میں نظر آتے ہیں یہاں کم ہو گئے ہیں۔ بیان میں تیزی اور احساس و خیال کو گرفت میں لا کر لفظوں کے ذریعے بیان کرنے کی قدرت بھی بڑھ گئی ہے۔ رنگوں کی شوخی اور کم ہو گئی ہے۔ سلاست و روانی نے اس میں طرز و ادا کی سطح پر ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ یہاں بیان کی کشتی متلاطم لہروں پر نہیں

تیر رہی بلکہ پرسکون لہروں پر ڈولتی چلی جارہی ہے۔ یہاں غواصی وہ غواصی نہیں رہتا جو دوسری مثنویوں میں نظر آتا ہے۔طوطی نامہ میں وہ قناعت پسندی، دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے، عشق الٰہی کے بحر عرفان میں غوطہ زنی کرنے اور خواب گراں سے بیدار ہونے کا درس دیتا ہے۔اب وہ فانی دنیا کے علائق سے دل توڑ کر ازلی وابدی حیات کا غواص ہونا چاہتا ہے۔دنیا کو وہ ایک ایسی برقعہ پوش عورت سے تشبیہ دیتا ہے جس کا ایک ہاتھ انسان کے لہو میں ڈوبا ہوا ہے اور دوسرا ہاتھ مہندی سے رچا ہوا ہے۔وہ ایک ہاتھ سے لوگوں کو مارتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے انہیں بہلاتی ہے۔

مثنوی طریقت (غیر مطبوعہ)

میناست ونتی اور طوطی نامہ کے علاوہ غواصی کی اور اور مثنوی طریقت کا پتہ چلتا ہے جو کہ غیر مطبوعہ ہے۔

غواصی دبستان دکن کا ایک باکمال غزل گو اور مثنوی نگار ہی نہیں تھا بلکہ بلند پایہ قصیدہ گو، بے نظیر رباعی نگا اور کامیاب مرثیہ گو بھی تھا۔ اس پر مستزاد اس کی نظمیں ہیں۔نظم نگاری کے میدان میں وہ محمد قلی کے بعد دکنی اردو کا دوسرا اہم شاعر ہے۔

ابن نشاطی:

قطب شاہی دور کے اہم اور بلند پایہ شاعروں میں ایک اور نام ابن نشاطی کا ہے۔اس کا پورا نام ''محمد مظہر الدین شیخ فخر الدین ابن نشاطی'' ہے۔جس کی مثنوی ''پھول بَن'' دکنی اردو کی چند منتخب مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ابن نشاطی بنیادی طور پر ایک انشاء پرداز تھا۔ لیکن اس کی انشاء پردازی کا کوئی نمونہ منظر عام پر نہیں آیا۔

مثنوی پھول بَن:

مثنوی پھول بَن سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں صرف تین ماہ میں لکھی گئی۔اس مثنوی کا آغاز حمد ونعت اور منقبت سے ہوتا ہے۔اس کے بعد سلطان عبداللہ شاہ کی مدح وستائش کی گئی ہے۔اس کے بعد کنچن پٹن کے بادشاہ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔یہ مثنوی داستان در داستان کے اسلوب میں الف لیلہ کی طرز پر نظم کی گئی ہے اور محاورات، ضرب المثل، تشبیہات اور کنایات وغیرہ کا استعمال انتہائی دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔مصنف کو منظر نگاری، کردار نگاری اور واقعہ نگاری پر دسترس حاصل ہے۔

ابن نشاطی فارسی اور دکنی کا بہت بڑا عالم، فاضل اور ماہر عروض و بلاغت بھی تھا۔اسے فن شاعری میں مہارت حاصل تھی۔خوصاً صنائع بدائع کے استعمال میں وہ کافی مہارت رکھتا تھا۔ پھول بن کی زبان سلیس وسادہ ہے۔اس مثنوی کے مطالعے سے شاعر کی قادر الکلامی اور کلام فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مثنوی اگرچہ فارسی تصنیف ''بساتین الانس'' کے قصے پر مبنی ہے لیکن ابن نشاطی نے اصل قصے بہت کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔اور اسے متعدد ابواب میں تقسیم کر کے ہر باب کا آغاز ایک ایسے شعر سے کیا ہے جس میں اس باب کا خلاصہ آجاتا ہے۔ اور اگر تمام ابواب کے صرف عنوانی اشعار کو یکجا کر دیا جائے تو پوری مثنوی کا لب لباب پیش نظر ہو جاتا ہے۔

پھول بَن'' کہانی قصہ در قصہ آگے بڑھتی ہے اور اس میں تین قصے اور چند ذیلی کہانیاں شامل ہیں۔1744 اشعار پر مشتمل اس مثنوی

میں ابن نشاطی نے جذبات نگاری، کردار نگاری اور منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

ابن نشاطی نے پھول بن میں عشق اور عشق بازی کے راز کھولے ہیں۔

تحسین الدین:

ممکن ہے کہ اس بزرگ کا اصل نام تحسین الدین ہو یا کوئی خطاب ہو۔ غرضیکہ کہ انہوں نے ایک مثنوی لکھی جس کا نام ''کامروپ کلا'' ہے۔ کلا شاہ لنکا کی بیٹی قصے کی ہیروئن ہے اور کامروپ شاہ اودھ کا بیٹا ہیرو ہے۔ قصہ یہ ہے کہ یہ دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ جیسا کہ الف لیلہ میں چین والی شہزادی کی نسبت لکھا ہے۔ کامروپ اپنی نادیدہ بلکہ خواب دیدہ معشوقہ کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا ہے جہاں عجب عجب واقعات پیش آتے ہیں۔ اور بالآخر اس کی شادی کلا کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ مصنف مسلمان ہے اور اشخاص قصہ سب ہندو ہیں۔ اسی مثنوی کو گارسن ڈیٹاسی نے ۱۸۳۶ء میں قصہ کامروپ کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مشہور جرمن شاعر کیٹے نے اس نظم کا ترجمہ کروا کے سُنا اور اس سے بہت محظوظ ہوا۔

ملا قطبی:

انہوں نے ۱۰۴۶ھ میں تحفۃ النصائح کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب شیخ یوسف دہلوی نے ۷۹۵ھ میں اپنے بیٹے کی تعلیم کے واسطے تصنیف کی تھی۔ یہ 786 بند کا ایک قصیدہ ہے۔ جسے ملا قطبی نے اسی بحر میں اور اسی ردیف و قافیہ میں ترجمہ کیا۔

جنیدی:

ان کے حالات اس سے زیادہ کہیں نہیں ملتے کہ انہوں نے ایک مثنوی ''**ماہ پیکر**'' لکھی تھی۔ جس کا سن تصنیف ۱۰۶۴ھ ہے۔

طبعی:

طبعی گولکنڈہ کے رہنے والے تھے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ ان کی مثنوی ''بہرام و گل اندام'' مشہور ہے۔ اس کا مضمون ہفت پیکر نظامی سے ماخوذ ہے۔ سنہ تصنیف ۱۰۸۱ھ ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ شاہ راجو حسینی کے نام سے ہے جو کہ حضرت شاہ گیسو درازؒ کے جد بزرگوار تھے۔ اس مثنوی کے خاتمے پر ابوالحسن تانا شاہ کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ مثنوی تقریباً تیرہ چودہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔

نوری:

سید شجاع الدین نوری گجرات کے معزز خاندان سادات سے تھے وہ سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے وزیر کے بیٹے کو پڑھاتے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اِن کو نام کی مماثلت کی وجہ سے ملاں نوری سے نہیں ملانہ چاہئے جو فیضی کے دوست تھے۔ اور جن کا ایک شعر قائم نے اپنے تذکرے میں نقل کیا ہے۔ گارسن ڈیٹاسی اور سر چارلس لائل نے نام کے التباس کی وجہ سے دھوکہ کھایا ہے اور دونوں کو ایک سمجھا ہے۔

فائزؔ:

یہ گولکنڈا کے رہنے والے تانا شاہ کے عہد کے شاعر تھے ۱۰۹۴ھ میں انہوں نے قصۂ **رضوان شاہ و روح افزاء** کا فارسی نثر سے اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ یہ **مثنوی قصہ رضوان شاہ** کے نام سے مشہور ہے مگر کتب خانۂ آصفیہ میں **مثنوی روح افزا** کے نام سے ہے۔

شاہیؔ:

شاہی کا اصل نام شاہ قلی خان تھا اور بھاگ نگر موجودہ حیدر آباد دکن کے رہنے والے تھے۔ شاہیؔ تانا شاہ کے ملازم تھے اور آہستہ آہستہ تانا شاہ کے ندیمِ خاص ہوگئے۔ انہوں نے شمالی ہند کی سیر بھی کی تھی ان کا ذکر تذکرۂ میر حسن میں موجود ہے۔

مرزاؔ:

اصل نام ابوالقاسم تھا اور مرزاؔ تخلص کرتے تھے۔ حیدر آباد کے رہنے والے تھے اور تانا شاہ کے مصاحب خاص تھے۔ تانا شاہ کی سلطنت ختم ہونے کے بعد یہ فقیر ہوگئے تھے اور باقی زندگی حیدر آباد میں بسر کی اور وہیں انتقال کیا۔ ان کا ذکر تذکرہ میر حسن میں موجود ہے۔

فیروزؔ شاہی / فیروزؔ بیدری

فیروز کا اصل نام قطب الدین قادری تھا۔ وہ دراصل بِیدَر کا باشندہ تھا جو ابراہیم قطب شاہ دور میں گولکنڈہ چلا آیا۔ اس کے کارناموں میں ایک مثنوی ''پرّت نامہ'' اور چند غزلوں کا پتا چلتا ہے۔ یہ مثنوی فیروز نے اپنے پیر و مرشد شیخ محمد ابراہیم مخدوم جی کی مدح میں لکھی تھی۔ گولکنڈہ پہنچنے کے بعد فیروزؔ کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ گولکنڈہ کے بلند پایہ شعراء محمد قلی، وجہیؔ اور ابن نشاطیؔ نے اپنے کلام میں جس انداز سے فیروز کا تذکرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شاعروں نے فیروز کے آگے زانوءِ ادب تہہ کیا تھا۔

فیروزؔ کی گولکنڈہ میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے کہ بعد کے زمانے میں ولیؔ کا سفر دلی۔ فیروز شاہی نے مثنوی بھی لکھی ہے اور اپنے عہد کے ایک غزل نگار بھی ہیں۔ ان کی غزل کا نمونہ حسبِ ذیل ہے۔

؎ سنگار بن کا سرو ہے سو خط ترا اے شہ پری — مکھ پھول تے نازک دِسے تو حور ہے یا استری
خوباں منیں ورساز توں، خوش شکل، خوش آواز توں — بہو رنگ کرتی ناز توں، چنچل سلکھن چھند بھری

؎ سرو قدت سہاوے جو نوبہار بن میں — نازک نہال پنچیا اس جیو کے بن میں
جس بزم میں بھی جھمکے میرا جو چاند سب نس — روتا اچھوں وجلتا جیوں شمع انجمن میں

؎ تیری کمر کے ہادی سکھ سکھ ہوا جو دبلا — جیوں تار پیرہن کا، یہ تار پیرہن میں
فیروزؔ جے صد کا دیکھن جمال صوری — ہر حال اس صنم کا آکھیں خیال من میں

ڈاکٹر جمیل جالبی فیروز کی غزل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

’’فیروز کی غزلوں میں تصور عشق مجازی ہے‘ لیکن اس کا رخ عشق حقیقی کی طرف بھی ہے۔ یہاں ہندوی و فارسی اثرات ایک نئے توازن کے ساتھ گلے مل رہے ہیں۔‘‘

سلطنتِ گولکنڈہ کے مشہور شعراء اور مصنفین :

نمبر	شعراء و مصنفین	تصنیفات	نمبر	شعراء و مصنفین	تصنیفات
01	فیروز	توصیف نامہ	16	بلاقی	معراج نامہ
02	محمود	------	17	ابن نشاطی	مثنوی پھول بن
03	ملاں خیالی	------	18	طبعی	مثنوی بہرام وگل اندام
04	ملاں وجہی	مثنوی قطب مشتری، سبرس، تاج الحقائق	19	شاہ راجو	سہاگن نامہ، چکی نامہ، چرخہ نامہ،
05	سلطان محمد قلی	کلیات	20	ابوالحسن تانا شاہ	نظم
06	سلطان محمد	------	21	محبّ	مثنوی معجزہ فاطمہؓ
07	سلطان عبداللہ	شاعری کی کلیات	22	کبیر	قصہ شمیم انصاری
08	غواصی	مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ ، چندہ ولورک، کلیات	23	اولیاء	مثنوی قصہ ابوشحمہ
09	احمد	مثنوی مصیبتِ اہل بیت، مثنوی لیلیٰ مجنوں	24	خواصی	قصہ حسینی
10	عاجز	لیلیٰ مجنوں	25	غلام علی	پدماوت
11	میراں جی خدانما	نظم	26	سیوک	جنگ نامہ
12	قطبی	تحفۃ النصائح	27	فائز	قصہ رضوان شاہ
13	سلطان	دیوان	28	لطیف	ظفر نامہ
14	جنیدی	مثنوی ماہ پیکر	29	افضل	محی الدین نامہ
15	شیخ عبداللہ	نظم	30	فتاحی	مفید الثقلین، شعبِ ایمان

قطب شاہی عہد میں مثنوی:

مثنوی کی تعریف:

لفظ ''مثنوی'' مثنیٰ سے منسوب ہے۔اور مثنیٰ کے معنی ہیں دو دو ۔اصلاح میں ان اشعار کو مثنوی کہا جاتا ہے جن میں دو مصرعے باہم مقفیٰ ہوں ۔دوسرے لفظوں میں مثنوی نظم کی وہ صورت ہے جس کا ہر شعر بلحاظ ردیف و قافیہ جداگانہ اور بلحاظ مضمون ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے۔ **پوری مثنوی ایک ہی بحر میں ہوتی ہے**۔مثنوی میں اشعار کا تسلسل ہونا ضروری ہے۔اس کے اشعار کی حد مقرر نہیں ہے۔

یہ صنف سخن (مثنوی) عربی سے فارسی میں آئی ہے اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی ہے۔اس صنف سخن میں تقریباً ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔البتہ غالب کے دور تک اس صنف کو زوال ہو چکا تھا۔لیکن پھر بھی شعراء اپنے ذوق اور مطالب کے اظہار کے لیے کبھی کبھی اس صنف شعری میں اظہار خیال کرتے رہے۔اس صنف میں شاعر کے لیے بہت سی دعاتیں ہیں ۔نہ کسی خاص بحر کی پابندی ہے نہ تعداد اشعار کی اور نہ ہی یہ صنف سخن کسی خاص موضوع سے مقید ہے۔چنانچہ عشقیہ، مذہبی، صوفیانہ، رزمیہ، بزمیہ ہر قسم کی مثنویاں بہت بڑی تعداد میں لکھی گئیں۔یہاں تک کہ ہجویہ اور منظریہ بھی۔

فارسی میں مولانا **جلال الدین رومی** کی مثنوی اور **ابوالقاسم فروری** کی مثنوی **شاہ نامہ فردوسی** اور **فریدالدین عطار** کی مثنوی **شاہ نامہ فردوسی** اور **فریدالدین عطار** کی مثنوی **الطیر** صوفیانہ خیالات اور اخلاقی نکات سے بھرپور ہیں۔

مولانا عبدالسلام نے اپنی کتاب ''**شعرالہند**'' میں مثنوی کو ان الفاظ میں تعریف کیا ہے۔

> ''مثنوی شاعری کی ایسی عام صنف ہے جس میں عشق و محبت کے جذبات بھی ظاہر کئے جاتے ہیں۔مدح و ستائش بھی کی جاتی ہے' باغ و داغ اور دشت و جبل کے مناظر بھی دکھائے جاتے ہیں۔نوحہ و ماتم بھی کیا جاتا ہے۔تاریخی واقعات بھی بیان کیے جاتے ہیں۔اس لئے اس میں غزل' قصیدہ' وصف' مرثیہ اور واقع نگاری کے تمام اصول و قواعد کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک مسلسل نظم ہے۔اور اس کے اشعار ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں جس طرح زنجیر کی ایک کڑی دوسری کڑی سے وابستہ ہوتی ہے۔''

قلی قطب شاہ کی مثنویاں:

قلی قطب شاہ ایک کثیر الجہات شاعر ہے۔اس نے اپنے عہد میں ہر عام و خاص بات کو شاعری کی زبان میں کہا ہے۔ان کے دیوان میں شاید ہی کوئی صنفِ شاعری ہو جو موجود نہ ہو۔انہوں نے مثنویاں بھی لکھیں۔ان کی اکثر مثنویاں خاص ہندوستانی پھلوں، ایک مثنوی ہندوستانی ترکاریوں اور ایک مثنوی شکاری چڑیوں کے متعلق ہے۔

شیخ احمد گجراتی کی مثنوی یوسف زلیخا:

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شیخ احمد گجراتی کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' کو دریافت کیا۔ یہ مثنوی چار ہزار (4000) اشعار پر مشتمل ہے۔ اور اسلامی روایات کے مطابق نظم کی گئی ہے۔ قصہ یوسفؑ زلیخا اسرائیلی روایات میں ملتا ہے اور اس سے بھی کئی گنا خوبصورتی سے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اس قصے کو **''احسن القصص''** کہا گیا ہے۔

شیخ احمد گجراتی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں:

شیخ احمد گجراتی کی اس مثنوی کو مولانا حافظ محمود شیرانی نے دریافت کیا تھا۔ یہ مثنوی پانچ سو (500) اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی بھی مندرجہ بالا مثنوی کی طرح اسلامی روایات پر لکھی گئی ہے۔ لیلیٰ مجنو کا قصہ عربی ادب سے فارسی ادب میں اور فارسی سے دکنی میں زبان میں آیا ہے۔ اس قصے کی زبان دکنی بول چال کے مطابق ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی کثرت نہیں ہے۔

ملا وجہی کی مثنوی قطب مشتری:

ملا وجہی، سلطان عبداللہ قطب شاہ کا درباری تھا۔ اس نے ''قطب مشتری'' کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی۔ آج یہ مثنوی صرف تاریخی اہمیت کی حامل ہے لیکن اگر اس مثنوی کو آج سے چار سو سال پہلے کے دور میں رکھ کر دیکھا جائے اور اس کا مقابلہ اس دور کی شاعری سے کیا جائے تو وجہی شعراء کی صف میں صفِ اوّل کا شاعر اور اس کی یہ مثنوی اس دور کا عظیم کارنامہ معلوم ہوتی ہے۔

قطب مشتری کے کلام کا نمونہ:

اچھین تین اس کیس کالے منے
کہ دو مچھلیاں دو سینٹریاں ہیں جالے منے
دسے لالک اس نین بچ یوں سنور
کہ سرخی مٹی کی سفید آب پر
سٹے لال لوریاں سوں پتلی کجل
کہ مریخ کے گھر میں آیا زحل
یوں عیش تے پھول جیوں کھل کر
پلنگ پر وہ بیٹھے دونوں میل کر
محبت میں شاہ و گدا برابر ہیں
محبت میں ہوتا جہاں جگ اسیر
برابر ہے واں بادشاہ و فقیر

ڈاکٹر انور سدیدؒ اس مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''وجہی نے قطب مشتری میں سلطان علی قطب شاہ کا بھاگ متی سے عشق کا قصہ رمزیہ انداز میں پیش کیا ہے اور اس عمل سے ارض دکن کی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔اس کی اضافی خوبی اس کا دیباچہ ہے، جس میں وجہی نے شاعری کے فن پر دلچسپ بحث کی ہے۔''

جنیدی کی مثنوی ماہ پیکر:

ماہ پیکر جنیدی کی مثنوی ہے۔اس کا سال تصنیف 1653ء ہے۔اس کا شمار عشقیہ مثنویوں میں ہوتا ہے۔

فتاحی کی مثنوی مولود نامہ:

یہ ایک نعتیہ انداز کی مثنوی ہے۔اس میں حضور اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔احوال ولادت کے ساتھ اس میں سیرت طیبہ بھی لکھی گئی ہے۔

محبّ کی مثنوی معجزہ فاطمہؓ:

معجزہ فاطمہ محبّ نامی ایک شخص کی مثنوی ہے۔محبّ ابوالحسن قطب شاہ کے دور کا شاعر تھا۔اس مثنوی میں محبّ نے ابوالحسن کی مدح سے اورنگزیب کی طرف سے پھیلائی گئی غلط اطلاعات کی تردید کی ہے۔اس مثنوی کی خصوصیت اس کا زور بیان اور صفائی وسادگی ہے۔ بیان واسلوب کے حوالے سے محبّ کے ہاں جدت نمایاں ہے۔

فائز کی مثنوی قصہ رضوان شاہ وروح افزاء:

فائز نے ایک فارسی قصے کو سامنے رکھ کر یہ مثنوی لکھی ہے۔اس میں اڑھائی ہزار (2500) اشعار شامل ہیں۔لیکن اس مثنوی میں کسی بادشاہ کی تعریف یا مدح بیان نہیں کی گئی بلکہ حمد، نعت اور صحابہ کرام کی تعریف وتوصیف کے بعد قصے کا اظہار کیا گیا ہے۔اس مثنوی کی زبان دکنی ہے اور ریختہ سے قریب تر دکھائی دیتی ہے۔کیونکہ اس مثنوی میں فارسی وعربی الفاظ کے ذریعے اسلوب کو بہتر بنایا گیا ہے۔

طبعی کی مثنوی بہرام وگل اندام:

اس مثنوی کا خالق طبعی، عبداللہ قطب شاہ کا معاصر تھا۔یہ مثنوی اس سے قبل امیر خسرو ''**ہشت بہشت**''، امین ودولت شاہ، بہرام حسن بانو اور ملک خوشنود، ''**جنت سنگار**'' کے نام سے فارسی سے ترجمہ کر چکے تھے۔طبعی نے اپنی مثنوی کی بنیاد نظامی کی 'ہفت پیکر'' پر رکھی اور اس کی بحر بھی نظامی سے ہی مستعار لی ہے۔زبان وبیان کے حوالے سے اس میں جدید اسلوب دکھائی دیتا ہے۔فنی اعتبار سے بھی اس میں پختگی پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

''فنی اعتبار سے اس میں ایک توازن، ناپ تول اور ہیئت کے طول وعرض کے تناسب کا احساس ہوتا ہے۔ قصے میں تسلسل بھی ہے اور ترتیب بھی۔ ان تمام چیزوں نے مل کر ادبی فنی اعتبار سے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔'' بہرام وگل اندام'' اس دور کی بہترین مثنوی ہے جس نے فنی سطح کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی نئی روایت کی طرف آگے بڑھایا ہے۔''

ضیفی کی مثنوی ہدایت الہند:

ضیفی اپنے دور کے عالم فاضل اور شاعر تھے اور جو بہت سی مذہبی کتب کے مصنف بھی تھے۔ مذکورہ مثنوی فقہ کے متعلق ہے جس میں شریعت، طریقت، حقیقت اور وحدت ومعرفت کی قرآن وحدیث کی روشنی میں صراحت کی گئی ہے۔ اس مثنوی کی زبان رواں اور گفتگو کے قریب ہے۔

اولیاء کی مثنوی قصہ ابوشحمہ:

اس مثنوی میں اولیاء نے حضرت عمر فاروق کے بیٹے ابوشحمہ کا ذکر کیا ہے۔ جس نے نشہ کی حالت میں ایک عورت سے مباشرت کی تھی اور حضرت عمر نے ''عدل فاروقی'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو زنا کی حد کے مطابق سزا دی تھی۔ اس قصے کی زبان سادگی، سلاست اور روانی کی خوبیوں سے متصف ہے۔

فیروز شاہی کی مثنوی پرت نامہ:

فیروز بیدری کی دریافت بھی کلی قطب شاہ، ابن نشاطی اور ملا وجہی کے ان اشعار سے ہوئی جن میں فیروز کی تعریف اور حوالہ موجود ہے۔ اب حال ہی میں ڈاکٹر نذیر احمد نے فیروز کی مثنوی ''پرت نامہ'' شائع کی ہے۔ اس مثنو کے 120 اشعار ہیں۔ جن میں شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ ابراہیم کی مدح درج ہے۔ فیروز جمال پسند اور حسن کا عبادت گزار نظر آتا ہے۔ اس کے اشعار میں جذبے کی داخلی حدت بے حد نمایاں ہے۔

قطب شاہی عہد میں غزل:

سید محمود

فیروزؔ کی طرح سید محمود بھی قطب شاہی عہد کے اولین شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ سید محمود، ملا خیالی اور فیروزؔ بیدری کے ہم عصر شاعر تھے۔ زمانہ مابعد کے بلند پایہ شاعروں میں وجہیؔ، محمد قلی اور ابن نشاطیؔ نے محمود کو قطب شاہی دور کی ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔

محمود کے کلام کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک پرگو اور قادرالکلام شاعر تھا۔ اس نے دکنی اردو کے علاوہ پنجابی اور افغانی میں بھی شعر کہے ہیں لیکن صرف اردو شاعری کی وجہ سے اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔

ان کا کلام بھی اگرچہ عرصے تک نایاب رہا تاہم ان کے ادبی آثار کی دریافت کا سہرا ڈاکٹر جمیل جالبی کے سر ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں محمود کی چند غزلیں اور بعض غزلوں کے منتخب اشعار شائع کیے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ:

''محمود شمال سے دکن گیا تھا اور شاہ شہباز کا مرید تھا اس نے اردو کے علاوہ فارسی افغانی اور پنجابی میں بھی شاعری کی تھی لیکن اس کی اصل شہرت اردو کلام کی وجہ سے تھی''

(ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو۔ جلد 1۔ ص:401)

محمود کی بیاض میں غزل، دوہا، گیت، قصہ، کبت اور دوہڑا کی اصناف میں تخلیقات موجود ہیں۔ محمود کی شاعری میں روانی تازگی اور توائی ہی نہیں بلکہ موضوعاتی تنوع اور تخلیقی حسن بھی نمایاں ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر ہے۔ سادگی، روانی، برجستگی نغمگی اور موسیقیت اس کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کی غزل سے دکنی ادب میں ایک صحت مند تبدیلی کا سراغ بھی ملتا ہے۔

؎ ڈرتا ہوں میں اس مست سیر چشم سوں آخر — بے دیں کریں محمود سے سجادہ نشیں کوں
؎ نا کفر پچھانے دلِ حیراں و نہ دیں کوں — از نقشِ چپ و راست خبر نیں ہے نگیں کوں
؎ حسن لیلیٰ کا تماشا دیکھ مجنوں مکھ منے — کیوں گزرتا سر بسر از آفتابِ عاشقاں
؎ شیخ و میں ہم مشرباں ہیں لیک ہنگام بہار — دو چپچا ہوئے شراب ہور میں پیوں پیدا شراب
؎ ظاہر گنگا کے جل سیتی نہانا سواد طاہر ہوا — خون جگر کے نیر سوں نہایا سواد طاہر ہوا

سلطان محمد قلی قطب شاہ

گزشتہ صفحات میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس کی غزل کا نمونہ دیا جا رہا ہے۔

؎ جاسوس کہہ منج یار کوں مو چھوڑ کر کس سات ہے — اس شہر کا دے منج نشاں او باٹ کہہ کس دھات ہے
؎ وقت صبوحی ہے کرو یاراں صبوحی سب تمہیں — میری صبوحی جیوں کی اس وصف کا ابیات ہے

؎ دل نانگ خدا کن کہ خدا نام دوے گا　　تمن کی مرادن کے بھرے جام دوے گا
؎ تمہارا حسن سو قدرت تھی روشنی پایا　　حوراں کا حسن تیرے حسن رنگے چراغ

سلطان عبداللہ قطب شاہ

عبداللہ قطب شاہ مزاج اور طبع کے لحاظ سے اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ جیسا تھا۔ دونوں کو حسن و عشق نے متاثر کیا۔ دونوں موسیقی اور شاعری میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ دونوں ہی شعراء کے بڑے قدردان تھے۔

؎ سب رات خوش صبا تلک یک رنگ اے سجن　　خلوت تمام تج سوں منج بے حجاب تھا
؎ تری پیشانی پر ٹیکا جھمکتا　　تماشا ہے اجالے میں اجالا
؎ ترے ہونٹاں اتے میٹھے ہیں موہن　　کہ اپوچ اس انگے لگتا ہے کھار
؎ آبِ حیات سے زیادہ یہ لب ترا　　کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث
؎ یو دنیا دو دن کی ہے مہماں' اسے کچھ ٹھہر نئیں　　دل نہ بھانداس سات' تو خوشحال رہ یاں غم نہ کھا

ملا خیالی

خیالی، ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا ایک ممتاز شاعر ہے۔ غالباً اس کا تعلق دربار شاہی سے تھا۔ اس لیے اس نے 1665ء میں اپنے نام ایک دومنزلہ مسجد تعمیر کروائی تھی۔ قلعہ گولکنڈہ کے شمال مشرق کی جانب فصیل سے متصل نئے قلعے میں ہتیان کے درخت درخت کے قریب ملا خیالی کی خوبصورت مسجد اور اس کا قطبہ آج تک موجود ہے۔ ابن نشاطی اور سید اعظم نے اپنے کلام میں جس انداز سے خیالی کا تذکرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ اور پر گو شاعر تھا۔ لیکن افسوس کہ ملا خیالی کی صرف ایک ہی غزل دستیاب ہوئی ہے۔

ملا خیالی کی غزلیں دکنی زبان میں ہیں لیکن ان میں سے فارسی کا رنگ جھلکتا ہے۔

؎ بالی سروپ سودھن جوں پوتلی نین میں　　صاحب جمال ایسے سکھی نہ کوئی لنکھن میں
؎ سنار کے چتارے لکھنے ملیں ہیں سارے　　مکھ دیکھ سند بسارے گم ہو رہے اپن میں
؎ تجھ کیس گھونگر والے بادل بیٹاں ہے کالے　　تس مانگ کے اجالے بجلیاں اٹھیاں لگن میں

ملا وجہی

ملا وجہی قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ سب رس، قطب مشتری اور دیوان وجیہ کے علاوہ قدیم دیوانوں میں کچھ غزلیات بھی ان سے منسوب پائی گئی ہیں۔ ملا وجہی کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں۔

؎ کھانا برہ کہتی ہوں میں ، پانی انجوں پیتی ہوں میں
تجھ تے بچھڑ جیتی ہوں میں ' کیا سخت ہے دل رے پیا　　(وجہی)

شیخ احمد گجراتی

شیخ احمد گجراتی غزل کے میدان میں فارسی کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔اردو کے قدیم اور جدید اسلوب ان کے ہاں ملے جلے ہوئے ملتے ہیں۔ ہندی اسلوب ان کی غزلوں سے خارج ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور فارسی اسلوب ان کی غزلوں کی زینت بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ احمد شاہ کے غزلیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

؎ میٹھے بچن ترے سن نا بات کرے سمجیا شیریں لباں یو تیرے جوں شات کرے سمجیا
دشمن کے بولنے کا نئیں اعتبار مجھ کن یک بات میں دوتن کے گھات کرکے سمجیا
گالاں اپر موہن کے بکھرے گئے سو زلفاں آب حیات اوپر ظلمات کرکے سمجیا
احمد دکن کے خوباں ہوتیاں ہیں پر ملاحت تو توں دکن کوں اپنا گجرات کرکے سمجیا

؎ موہن کے غم سوں گل گل کرنیں سوں رات دن میرے
کہ پانی ہوکے مجہ سارا کلیجہ ہوا جگر نکلے
عجب کچھ حق کی قدرت ہے ' نہیں دم مارنے جاکا
دیکھو حکمت سوں کیوں رب کی بشر میں سے بشر نکلے

سلطان محمد قطب شاہ

سلطان محمد قطب شاہ فارسی میں ظل اللہ اور دکنی میں قطب شاہ تخلص کرتا تھا۔اس کے دو دیوان ہیں۔ایک فارسی زبان میں ہے اور دوسرا دکنی (اردو) زبان میں ہے۔اس کا کلام شریں نفیس اور رواں ہے۔مثال ملاحظہ کیجئے۔

؎ وہ لب ترے رنگیلے یاقوت کو دیئے رنگ
لے بھیک رنگ عقیقاں ہوئے یمن میں
؎ سکھی توں ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ
محبت پر نظر رکھ کر بسر غیظ

غواصی

غواصی عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔اس نے دیگر اصناف سخن کے علاوہ غزل پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔وہ غزل میں مسلسل کیفیت کو نظم کی شکل میں پیش کرتا ہے۔اس کی غزل میں قناعت اور دردمندی کا عنصر نمایاں ہے۔ اس کی غزل کا نمونہ مندرجہ ذیل ہے۔

؎ کھلے سر تھے گلزار الحمدللہ
اٹھیا جگ میں مہکار الحمدللہ

؎ جہاں کا تہاں آج دیتے ہیں جلوا
سعادت کے آثار الحمدللہ

؎ سوئے بخت میرے جو تھے آج لگ سو
دیئے جاگ یک بار الحمدللہ

☆☆☆☆☆

اردو ادب کے فروغ میں بیجاپور کی خدمات

تمہید:

جب بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو اس کے بعد دکن میں پانچ خودمختار ریاستیں قائم ہوئیں۔ جو مندرجہ ذیل شہروں میں حسبِ ذیل ناموں سے مشہور ہیں۔

01	گولکنڈہ	میں	قطب شاہی
02	بیجاپور	میں	عادل شاہی
03	احمدنگر	میں	نظام شاہی
04	برار	میں	عمادشاہی
05	بیدر	میں	بریدشاہی

شاہانِ گولکنڈہ و بیجاپور نہایت قدر دانِ فن، مذہب اور قابل بادشاہ تھے۔ خود بھی شاعر اور شاعروں کے بڑے قدر دان اور مربی تھے۔ اس زمانے میں اردو کو دکنی زبان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ زمانہ دکنی زبان کی ترقی کے لیے نہایت قیمتی زمانہ تھا۔ شاہی محلوں میں موجود ہندو رانیوں کی وجہ سے دیسی زبانوں کو اور بھی تقویت پہنچی۔ **یوسف عادل شاہ** کی بیوی جو ''**بوبوجی**'' کے نام سے مشہور تھی مکندر راؤ مرہٹہ کی بہن تھی۔ ''**بھاگ متی**'' سلطان **محمد قلی شاہ** کی محبوب بیوی تھی۔ احمدنگر کے والی **احمد نظام شاہ** کی ماں بھی ایک ہندو عورت تھی۔ ان ہندو زنانِ شاہاں کی وجہ سے دیسی زبان نے بہت ترقی کی۔

مندرجہ بالا پانچ خودمختار حکومتوں میں سے پہلی دو حکومتیں یعنی گولکنڈہ کے قطب شاہان اور بے جاپور کے عادل شاہان کی ریاستیں ادبی حوالے سے نہایت اہم ریاستیں مانی جاتی ہیں۔ گزشتہ صفحات میں ادبی حوالے سے گولکنڈہ عہد حکومت کا جائزہ پیش کیا جا چکا ہے۔ اب بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں کی ادبی خدمات کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔

سلطنتِ عادل شاہی

(1489ء - 1686ء)

شاہانِ بے جاپور کے نام

01	یوسف عادل شاہ	04	ابراہیم عادل شاہ (اوّل)	07	محمد عادل شاہ
02	اسماعیل عادل شاہ	05	علی عادل شاہ (اوّل)	08	علی عادل شاہ (ثانی)
03	ملو عادل شاہ	06	ابراہیم عادل شاہ (ثانی)	09	سکندر عادل شاہ

اب ذیل میں ان بادشاہوں کے ادوارِ حکومت اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

01 یوسف عادل شاہ (1489ء تا 1510ء)

عادل شاہی خاندان کا بانی ابوالمظفر سلطان یوسف عادل شاہ سلاطین روم یعنی آل عثمان کی نسل سے تھا۔اس فرمانروا کے حالات یوں بیان کیے جاتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے فرمانروا مراد کا 54 ہجری میں انتقال ہوگیا اور اس کا بڑا بیٹا سلطان محمد باپ کا جانشین ہوا۔سلطان محمد کی علم دوستی اور ہنر پروری ضرب المثل کی طرح تمام دنیا میں مشہور ہے۔فارسی کے مشہور شاعر مولانا عبدالرحمٰن جامؔی نے بھی اس عظیم المرتبت بادشاہ کی مدح میں چند قصیدے لکھے ہیں۔

سلطان محمد کی تخت نشینی کے بعد ارکان دولت نے بادشاہ سے عرض کیا کہ سلطان مراد مرحوم کے عہد میں ایک شخص گزرا ہے جو سلطنت کا دعویدار تھا۔وہ اپنے آپ کو یلدرم بایزید کا بیٹا بتا کر ملک میں فتنہ وفساد کا بازار گرم کرنے کا خواہاں تھا۔سلطنت کے اس جھوٹے دعویدار کی وجہ سے حکومت کی بنیادیں کھوکھلی ہوگئیں۔آخر کار بڑی مشکلوں سے اس فتنے کو فرد کیا گیا۔اس لیے اب مناسب یہی ہے کہ ولی عہد کے علاوہ تمام عثمانی شہزادوں کو تہ تیغ کر دیا جائے تا کہ ملک میں کوئی فتنہ وفساد برپا نہ ہو۔

سلطان محمد نے اراکینِ دولت کے مشورے کو معقول ومناسب سمجھا۔لہٰذا اس نے اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ یوسف کو قتل کرنے کی اجازت دیدی۔درباری امراء شاہی حرم سرا کے دروازے پر آئے تا کہ بے گناہ یوسف کو قتل کر کے اس کی لاش کو باہر لائیں اور رعایا پر یہ واضح کر دیں کہ شاہِ وقت کے بعد ولی عہد کے علاوہ کوئی ایسا شخص موجود نہیں رہا کہ جس کی رگوں میں عثمانی خون دوڑ رہا ہو اور وہ سلطنت کا دعویدار ہو سکے۔

سلطان محمد کی ماں کو اپنے چھوٹے بیٹے یوسف سے بہت محبت تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ بڑے بیٹے کی سلطنت کی ہوس میں اس چھوٹا بیٹا قتل کر دیا جائے۔جب بیگم کو اطلاع ہوئی کہ شاہی امراء شہزادے یوسف کو قتل کرنے کے لیے آئے ہیں تو وہ خود چل کر حرم سرا کے دروازے پر آ گئی اور امراء سے التجا کی کہ میرے بیٹے کو تم لوگوں نے مار تو دینا ہی ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ آج کی رات میرے معصوم بچے کو قتل نہ کرو میں اس سے بہت پیار کرتی ہوں اور رات بھر اپنے جگر کے ٹکڑے کو جی بھر کے دیکھنا چاہتی ہوں۔امراء نے ملکہ کی منت سماجت پر اس کے

بیٹے کو ایک رات کے لیے زندہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور طے ہوا کہ کل صبح اس بچے کو قتل کیا جائے گا۔

اب ملکہ کی مامتا بے چین ہوئی اس نے ''سادہ'' کے رہائشی ایک سوداگر خواجہ عماد الدین محمود گرجستانی کو بلوایا۔ خواجہ عماد وہ مشہور سوداگر تھا جو ایران سے بیش قیمت اشیاء رسد کر کے عثمانی حرم سرا میں فروخت کیا کرتا تھا۔ ملکہ نے اس سے کہا ''اگر تمہارے پاس چند ایسے غلام ہوں جو قابلِ فروخت ہوں تو انہیں میرے پاس لے آؤ''۔ ملکہ کے حکم پر خواجہ عماد نے پانچ **''گرجی''** اور دو **''چرکسی''** غلام اس کی خدمت میں پیش کیے۔ چرکسی غلاموں میں سے ایک شہزادہ یوسف سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔ ملکہ نے چوری چھپے اس غلام کو خرید لیا۔ اور یوسف کو خواجہ عماد کے سپرد کر دیا اور اس کو ساری حقیقت بتائی اور کہا کہ اگر تمہیں حقوق نمک کا کچھ احساس ہے تو تم میری مدد کرو خواجہ یوسف کو اپنے غلاموں میں شامل کر کے اسے جلدی سے بلادِ عجم پہنچا دو۔ میں اس خدمت کے صلے میں تمہیں مالا مال کر دوں گی۔ خواجہ عماد نے حق نمک کی پاسداری میں یا پھر انعام کے لالچ میں اس خدمت کو انجام دینے کی ہامی بھر لی۔ اس نے شہزادہ یوسف کو اپنے ہمراہ لیا اور راتوں رات قافلے کے ساتھ بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔ خواجہ عماد نے ایک مَنت بھی مانی تھی کہ اگر وہ شہزادے کو لے کر بلادِ عجم کی حدود میں داخل ہو جائے گا تو اپنے مال کا پانچواں حصہ حضرت شیخ صفیؒ کے مزار اور خانقاہ کے مصارف کے لیے نذر کر دے گا۔

دوسرے دن صبح سلطان محمد کے درباری امراء جلاد کے ہمراہ یوسف کو قتل کرنے کے لیے حرم سرا آئے تو ملکہ نے ایک عثمانی امیر کو دولت کا لالچ دے کر اندر بلوا لیا اس عثمانی امیر نے ''چرکسی'' غلام کو قتل کیا اور شاہی رواج کے مطابق غسل دے کر کفن میں چھپا کر لڑکے کو محل سے باہر لایا۔ دیگر عثمانی امیروں نے بھی لاش کی شناخت کرنی ضروری نہیں سمجھی کیونکہ شہزادے کو قتل کرنے والا امیر خاندانِ عثمانیہ کا ایک معتبر آدمی تھا۔

بعد میں ملکہ نے وقتاً فوقتاً شہزادے یوسف کی خبر گیری لینی جاری رکھی۔ خواجہ عماد سب سے پہلے یوسف کو لے کر اردبیل پہنچا اور اس نے اپنی منت ادا کی اور شہزادہ یوسف کو بھی ہمیشہ کے لیے شیخ صفیؒ کا معتقد بنایا۔ دربار سے واپس ہو کر عماد **''سادہ''** میں آیا اور ساتھ ہی یوسف کو اخفائے راز کرنے سے سختی سے منع کیا۔ خواجہ عماد نے اپنے بیٹوں کے ساتھ شہزادے کو بھی مکتب میں داخل کروا دیا۔

ملکہ نے یوسف کی دائی اور اس کے بیٹے کو چوری چھپے یوسف کے خبر گیری کے لیے بہت سارا مال و متال دے کر سادہ روانہ کیا۔ جب دائی اور اس کا بیٹا غضنفر سادہ پہنچے تو خواجہ عماد وہاں موجود نہیں تھا وہ کاروبار کی غرض سے ہندوستان گیا ہوا تھا۔ دائی اور غضنفر کی باتوں سے عماد کے گھر والوں پر راز افشاء ہو گیا کہ یوسف، غلام نہیں بلکہ شہزادہ ہے۔ پھیلتی پھیلتی یہ خبر سادہ کے حکمران تک جا پہنچی۔ حاکم سادہ نے غضنفر اور اس کے ساتھیوں سے لالچ میں آ کر چار سو تومان وصول کیے۔ ادھر سورتحال یہ تھی کہ اس واقعہ سے دو دن قبل شہزادہ یوسف کسی سنارے کے لڑکے سے لڑ کر سادہ چھوڑ کے قُم روانہ ہو گیا تھا۔ یوسف نے یہ طے کر لیا تھا کہ جب تک سادہ میں موجودہ حکمران ہے وہ سادہ نہیں جائے۔ وہ کاشان اور اصفہان کی سیر کرتا ہوا شیراز پہنچا۔ کچھ دنوں تک اس نے شیراز کے فطری مناظر سے دل بہلایا۔ اسی دوران اس کو خبر ملی کہ سادہ کے حکمران کو معزول کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر سن کر شہزادے نے واپس سادہ جانے کا ارادہ کیا تھا کہ رات کو اسے خواب میں حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت ہوئی اور حضرت خضر علیہ السلام نے یوسف کو ابھی کچھ دن سادہ نہ جانے کی نصیحت کی اور ساتھ میں یہ خوشخبری بھی سنائی کہ اللہ ایک دن تمہیں بہت بڑا عہدہ دے گا۔

جب شہزادے کی آنکھ کھلی تو اس نے سادہ جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور 864 ہجری میں بحری راستے سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ جہاز مصطفٰے آباد لوایل میں لنگر انداز ہوا۔ شہزادہ جہاز سے اترا اور بندرگاہ میں قیام پذیر ہو گیا۔ وہ روزانہ بندرگاہ کے باغات اور سبزہ زاروں میں گھوم پھر کر وقت گزارنے لگا۔ ایک دن اس کی ملاقات ایک بوڑھے شخص سے ہوئی جو اس کو شربت کا ایک پیالہ دے کر غائب ہو گیا اور یوسف کا خیال تھا کہ ہو نہ ہو یہ حضرت خضر علیہ السلام ہی تھے۔

الغرض خواب اور بیداری دونوں عالم میں خضر علیہ السلام کی زیارت سے فیض یاب ہو کر شہزادہ خواجہ عماد کے ہمراہ احمد آباد بیدر کی طرف روانہ ہوا۔ جب شہزادہ یوسف احمد آباد بیدر پہنچا تو اس کی عمر 17 سال تھی اور ابھی اس کے چہرے پر داڑھی کے بال نہیں نکلے تھے۔ بیدر جانے کے بعد شہزادے کو معلوم ہوا کہ بادشاہ پر ترکی غلاموں کا زیادہ اثر ہے اور سلطنت کے تمام امور انہی کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں تو یوسف نے خواجہ عماد سے درخواست کی کہ اسے بھی بادشاہ کے ترکی غلاموں میں شامل کروا دیا جائے۔ پہلے تو خواجہ عماد نہ مانا لیکن یوسف کے اسرار پر اس نے ساری بات محمود کاواں کے گوش گذار کی۔ محمود نے شہزادہ یوسف کی فن موسیقی اور فن سپاہ گری سے متاثر ہو کر اس کو خرید لیا۔ اور اپنے ترکی غلاموں میں شامل کر لیا۔

جب بہمنی حکومت کا شیرازہ بکھرا تو محمد یوسف نے کثیر سپاہ کے زور سے ایک مشہور مثل ''جو مارے اسی کی تلوار اور جو غالب اسی کا ملک'' کے تحت 97-896ھ میں بیجاپور میں ایک خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور چتر شاہی سر پر رکھا۔ تقریباً پانچ ہزار ترکی اور آفاقی اشخاص نے اس کی بادشاہت کو تسلیم کر لیا۔ یوسف نے سلطان محمد کے بہت سے مقبوضہ قلعوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ نیز دریائے بھورہ سے بیجاپور اور دریائے کشتہ سے زائچور تک کا علاقہ اس کی تحویل میں آ گیا۔ یوسف نے اپنے لقب میں ''خان'' کی جگہ ''شاہ'' کا لفظ استعمال کیا اور اپنے آپ کو ''یوسف عادل شاہ'' کے نام سے مشہور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس خاندان کا ہر بادشاہ ''عادل شاہ'' کے لقب سے پکارا جاتا رہا۔

908ھ میں یوسف عادل شاہ نے ایک مجلس جشن منعقد کی اس مجلس میں سید احمد صدری اور دیگر شیعی علماء کو مدعو کیا گیا۔ ان سب کے سامنے یوسف نے کہا کہ ''اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے میں جب کہ میں جلاوطن ہو کر بازاروں میں بکتا پھر رہا تھا تو حضرت خضر علیہ السلام نے خواب میں مجھے یہ بشارت دی تھی کہ خدا تعالےٰ مجھے قعرِ مذلت سے نکال کر تخت سلطنت پر بٹھائے گا حضرت خضرؑ نے مجھے یہ نصیحت کی تھی کہ میں عنانِ اقتدار ہاتھ میں لے کر اپنے خدا کو فراموش نہ کروں، ہمیشہ ساداتِ کرام اور محبان اہل بیت کی عزت و توقیر کروں اور شیعہ مذہب کو دنیا میں پھیلانے کی زندگی بھر کوشش کرتا رہوں۔'' اور مزید کہا کہ:

میں نے اس خواب کی وجہ سے خداوند تعالیٰ سے یہ عہد کیا تھا کہ بادشاہت کے درجے پر پہنچ کر بارہ اماموں کے اسمائے گرامی خطبے میں داخل کروں گا اور شیعہ مذہب کو رواج دوں گا۔ اس کے علاوہ تمراج کی شورشوں اور ہنگاموں کے زمانے میں جبکہ ملک اور سلطنت میرے ہاتھوں سے نکلے جا رہے تھے، میں نے دوبارہ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر میں دشمن پر غالب آ گیا تو میں ملک میں شیعہ مذہب کو رواج دینے کی پوری کوشش کروں گا۔ اس پر کچھ درباریوں نے تو مثبت رائے دی لیکن کچھ کا خیال تھا کہ یوسف شاہ کو حکومت کا اعلان کیے ہوئے

ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ ابھی تک محمود شاہ بہمنی کو بھی برائے نام بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مزید برآں احمد نظام الملک بحری اور فتح اللہ عمادی جیسے نامی گرامی امراء سُنی مذہب کے پیرو ہیں، خود حضور (یوسف) کے بہت سے عسکری سپہ سالار چار خلفاء کو مانتے ہیں اور حنفی عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تبدیلی مذہب کے اعلان سے ملک میں کوئی نیا ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔

یوسف عادل شاہ نے اس دور اندیش جماعت کی رائے کو بہت غور سے سُنا۔ تھوڑی دیر تک سوچا اور پھر کہا۔ ''چونکہ میں خداوند سے عہد کر چکا ہوں اس لیے میں بدعہدی کو اپنا شعار نہ بنا سکوں گا، اس سلسلے میں جو مشکلات پیش آئیں گی، ان کو حل کرنے میں خدا ہی میری مدد کرے گا۔'' اتفاق سے اسی زمانے میں ایران سے شاہ اسماعیل صفوی بارہ اماموں کے اسماء گرامی کا خطبہ جاری کر کے ملک میں شیعہ مذہب کو رواج دینے کی کوشش کر رہا تھا، یوسف عادل شاہ یہ خبر سن کر بہت خوش ہوا اور اپنے ارادے پر اور زیادہ پختہ ہو گیا۔

اسی سال ذی الحجہ کے مہینے میں بروز جمعہ یوسف عادل شاہ قلعہ ارک کی جامع مسجد میں آیا۔ مدینہ منورہ کا ایک صحیح النسب سید خطبہ پڑھنے کے لیے ممبر پر گیا، سب سے پہلے تو اذان میں کلمہ '' علیاً ولی اللہ '' کا اضافہ کیا گیا۔ اس کے بعد بارہ اماموں کے اسمائے گرامی خطبے میں داخل کر کے باقی صحابہ کرام کے اسمائے گرامی نکال دیئے گئے۔

مورخین نے تحریر کیا ہے کہ یوسف عادل شاہ پہلا بادشاہ ہے کہ جس نے ہندوستان میں بارہ اماموں کے نام کا خطبہ پڑھوا کر ملک میں شیعہ مذہب کو رائج کیا۔ ان حالات میں صحابہ کرام کی شان میں کوئی گستاخانہ الفاظ استعمال نہیں کیے جاتے تھے۔ یوسف عادل شاہ نے بڑی احتیاط سے کام لیا جس کی وجہ سے تعصب کو فروغ نہ ہوا اور سُنی و شیعہ ایک دوسرے سے مل کر رہنے لگے۔

یوسف کے عہد حکومت میں شیعہ مذہب کے رواج کے بعد شیعی، حنفی، اور شافعی علماء ایک دوسرے سے بڑی محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے اور آپس میں کسی قسم کا بغض اور کینہ نہیں رکھتے تھے۔ ہر مذہب کے لوگ اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق اپنی اپنی عبادت گاہوں میں خداوند تعالیٰ کی بندگی کرتے تھے۔ کوئی شخص اپنے فرقے کی فضیلت اور دوسرے فرقے کی توہین کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ علماء اور مشائخ اس اتحاد و یک جہتی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے اور اس مذہبی اتحاد کو یوسف عادل شاہ کی حکمت عملی کا بہترین نمونہ سمجھتے تھے۔

اس شیعہ حکمران کا یہ وہ زمانہ تھا کہ ہر کسی کو مذہبی آزادی تھی۔ یہاں تک کہ یوسف عادل شاہ نے تمام حنفی المذہب امراء کو یہ ہدایت کی کہ وہ اپنی جاگیروں میں اپنے عقیدوں کے مطابق اذان دیں، اس کے علاوہ یوسف نے تمام حکام کو یہ فرمان بھجوا دیا کہ وہ اہل سنت کے طریقۂ عبادت میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ کریں۔ اس سلسلے میں بادشاہ نے بڑی احتیاط سے کام لیا جگہ جگہ پر ہرکارے مقرر کیے جو ذرا ذرا سی باتوں کی بادشاہ کو اطلاع کرتے تھے۔

جو امراء مذہب کی تبدیلی کی وجہ سے یوسف عادل شاہ سے ناراض ہو چکے تھے، ان میں میاں محمد عین الملک بہت قوی اور صاحب اقتدار تھا۔ یوسف کو اس امیر سے کچھ خوف پیدا ہو گیا۔ لہٰذا از راہ احتیاط اس نے عین الملک کو سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دیا، اس کی جاگیر، جو بہادر گیلانی کے بعد اسے عطا ہوئی تھی، ضبط کر لی گئی اور اس کی بجائے اہتکری اور بلگوان کے پرگنے عطا کیے گئے۔

محمود شاہ بہمنی نے امیر برید کے مشورے سے گردونواح کے فرمانرواؤں کے پاس قاصد بھیج کر مدد کی درخواست کی، ان فرماں رواؤں

میں قطب الملک، فتح اللہ عماد الملک، خداوند خاں حبشی اور ملک احمد نظام الملک بحری تھے۔ ان لوگوں سے یوسف عادل کا مقابلہ کرنے کی درخواست کی گئی۔ فتح اللہ عماد الملک اور خداوند خاں حبشی ایک دوسرے سے رنجیدہ اور خائف تھے اس لیے انہوں نے محمود شاہ سے معذرت طلب کی اور اپنے علاقوں سے باہر نہ نکلے۔

قطب الملک ہمدانی اگرچہ بباطن شیعہ تھا اور اس مذہب کی اشاعت کا دل و جان سے خواہاں تھا لیکن مصلحت وقت سے مجبور ہو کر تلنگانہ کے امراء کے ساتھ محمود شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ احمد نظام الملک بحری بھی خواجہ جہاں دکنی حاکم پرندہ اور زین خاں حاکم شولا پور کو ساتھ لے کر بارہ ہزار سواروں اور ان گنت توپ خانوں کے ساتھ احمد آباد بیدر پہنچ گیا۔

جب یوسف عادل شاہ دشمن کے غلبے میں آچکا تو فتح اللہ عمادی نے اس سے کہا کہ:

> ''احمد نظام الملک اور محمود شاہ دونوں کٹر حنفی ہیں اور مذہب کا بہانہ کر کے تمہیں تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں اس وقت مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ دشمن کا مقابلہ بھی کروں اور تمہاری دوستی کا دم بھی بھروں، اس لیے میری رائے یہ ہے کہ تم بظاہر شیعہ مذہب سے توبہ کر کے اور مجھ سے ناراض ہو کر برہان پور چلے جاؤ میں قطب الملک سے مشورہ کر کے معاملے کو سلجھا لوں گا۔''

اس کے بعد یوسف عادل شاہ نے عماد الملک کی رائے پر عمل کیا اور اسی وقت بیجاپور میں ایک فرمان لکھ کر بجھوایا کہ ابھی سے بارہ اماموں کے اسمائے گرامی والا خطبہ بند کر کے چار خلفاء کے ناموں کا خطبہ دیا جائے اور دکھاوے کے لیے خود عماد الملک سے جنگ کر کے برہان پور چلا گیا۔

تو اس کے بعد عماد الملک نے نظام الملک کے نام ایک خط لکھا جس میں اس نے کہا کہ: امیر برید، یوسف عادل شاہ کی حکومت ختم کر کے خود بیجاپور پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے نزدیک عادل اور برید ایک ہی جیسے ہیں۔ لیکن برید کا کردار اب پوری طرح واضح ہو چکا ہے وہ پانچ کوس علاقے کا مالک ہے لیکن اس نے محمود شاہ کو شاہِ شطرنج بنا کر بہمنی خزانے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ ہمارے خلاف جو چاہتا ہے، کرتا ہے لیکن ہم اس کے سامنے کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر بیجاپور جیسے وسیع الملک پر برید کا قبضہ ہو گیا تو پھر ہمارا اور ہماری اولاد کا دکن میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ یوسف شاہ نے میرے سامنے شیعہ مذہب کو ترک کر کے سُنی مذہب کو ترویج کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور ایک فرمان کے ذریعے شیعہ مذہب کی ترویج کو رکوا دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ نہ مناسب ہے کہ اب ہم یوسف عادل شاہ پر حملہ کریں اور محمود بہمنی کے پردے میں برید کی خواہش کو پورا کریں۔ بہتر یہی ہے کہ اب ہم اس معاملے سے الگ ہو جائیں اور اپنے اپنے ملکوں میں واپس چلے جائیں۔

ملک احمد نظام الملک اور قطب الملک ہمدانی سیاسی امور میں فتح اللہ عمادی کی رائے کو فوقیت دیتے تھے۔ انہوں نے عمادی کے مشورے پر عمل کیا اور راتوں رات اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے گئے۔ دوسرے دن صبح میدان جنگ خالی نظر آیا۔ محمود شاہ اور امیر برید نے زمانے کے انقلاب کو بڑی حیرت کی نظروں سے دیکھا۔ ان دونوں نے بیجاپور کی مہم کے لیے فتح اللہ عمادی سے مدد مانگی اور اس کے پاس قاصد روانہ کیا۔ عمادی ادھر اُدھر کی باتوں سے برید کے قاصد کو ٹالتا رہا اور خود ایک قاصد یوسف عادل شاہ کے پاس بھیج کر اسے بلوایا۔ یوسف

واپس آیا اور دونوں سرداروں نے فوج کو ترتیب دیا اور برید محمود سے معرکہ آرا ہونے کے لیے روانہ ہو گئے۔

محمود اور برید نے ان دونوں کو صف آرا دیکھ کر میدان جنگ چھوڑ کر پتلی گلی اختیار کی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ یوسف عادل شاہ نے دشمن کے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا اور فتح اللہ عمادی سے رخصت ہو کر بیجاپور واپس آیا اور یہاں آ کر اس نے دوبارہ شیعہ مذہب کو رواج دیا اور بارہ اماموں کے اسمائے مقدسہ کا خطبہ جاری کیا۔

یوسف عادل شاہ نے جب مکٹ وراؤ مرہٹہ پر حملہ کیا تو اس کے قبضے میں کچھ قیدی آئے۔ ان قیدیوں میں مکٹ راؤ کی ایک سولہ سالا بہن بھی تھی۔ جو عقل وخرد، حسن ونزاکت اور جمال وجلال میں اپنی مثال آپ تھی۔ یوسف شاہ نے اس کو اپنے حرم میں شامل کر لیا۔ اس لڑکی کو مسلمان بنایا اس کا نام پونجی خاتون رکھا اور خود اس سے نکاح کر کے اسے اپنی بیوی بنا لیا۔ اس عورت کے بطن سے یوسف کو اللہ نے چار اولادیں عطا کیں۔ ان میں ایک بیٹا اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ جن کے نام بالترتیب یہ ہیں۔

01 اسمٰعیل عادل شاہ (جو باپ کی وفات کے بعد اس کا جانشین بنا)

02 مریم سلطان (جو برہان نظام شاہ سے بیاہی گئی)

03 خدیجہ سلطان (جس کی شادی شیخ علاؤالدین عمادالملک سے ہوئی)

04 بی بی ستی (زوجہ احمد شاہ بہمنی)

یوسف عادل شاہ نے بیس برس اور دو مہینوں تک بڑی خوش اسلوبی اور استقلال سے حکومت کی۔ 916ھ کو ایک مرض میں مبتلا ہو کر 75 سال کی عمر میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ اس کی وصیت کے مطابق لاش کو قصبہ کرگی میں ایک شیعہ بزرگ شیخ جلال، المشہور بہ شیخ چندا کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ شیخ چندا کا شجرہ نسب امام زین العابدین تک جا ملتا ہے جو کہ تاریخ فرشتہ میں ص:111 پر ترتیب سے لکھا ہوا ہے۔

مندرجہ ذیل مصرعے سے اس کی تاریخ وفات اخذ ہوتی ہے۔

؎ ”بگفتا نماندہ شہنشاہ عادل“

یوسف عادل شاہ کے عہد میں ادب

یوسف عادل شاہ خود بھی شاعر تھا اور شاعروں کا بڑا قدردان تھا۔ خود فارسی اور ترکی زبان میں شعر کہتا تھا۔ اس کو علم وفن سے خاصی دلچسپی تھی۔ اس کے زمانے میں عراق وایران سے کئی علماء اور فضلاء بیجاپور آئے۔ بادشاہ شیعہ مکتب فکر کا پیرو تھا لہٰذا اس کے دربار میں وقتاً فوقتاً مجالس عزاء اور محافل جشن کا اہتمام ہوتا رہتا تھا۔ مولانا سید احمد صدریؒ کے ساتھ متعدد علماء وشعراء ان مجالس میں شرکت کرتے تھے۔ یہ دور زیادہ تر مذہبی تصنیفات اور مذہبی شاعری کا تھا۔

02 اسمٰعیل عادل شاہ (1510ء تا 1534ء)

یوسف عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے اسماعیل عادل شاہ نے تخت سنبھالا اور پچیس (25) سال تک حکمران رہا۔ وہ بھی علم دوست تھا اور شعر وسخن کا دلدادہ ہونے کی وجہ سے علماء فضلاء کی صحبت کا شائق تھا۔ خود شاعر تھا اور ”وفائی“ تخلص کرتا تھا۔

03 ملوعادل شاہ (1534ء تا اسی سال معزول ہو گیا)

اسماعیل کے بعد اس کا بیٹا ملو عادل شاہ تخت نشین ہوا لیکن وہ جوانی ہی سے عیش وعشرت کا شوقین تھا۔ جس کی وجہ سے اسے معزول کر کے اس کے بھائی ابراہیم عادل شاہ اوّل کو تخت پر بٹھایا گیا۔

04 ابراہیم عادل شاہ اوّل (1534ء تا 1558ء)

ابراہیم کی ساری زندگی جنگ وجدل میں گزری۔ تاہم اس نے ''دکنی'' کو سرکاری زبان بنا دیا۔ اس نے شیعہ مسلک کی بجائے سنی مسلک اختیا کر لیا اور ایرانی اثرات کی کو ختم کرنے کی کوشش کی اور سخت گیری سے کام لیا۔ اس کے دور میں دکنی زبان میں رسالے لکھے گئے۔

05 علی عادل شاہ اوّل (1558ء تا 1580ء)

ابراہیم عادل شاہ اول کے بعد علی عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ علم وادب کا بہت شوقین تھا اور دوران سفر بھی چار سو صندوق اس کے ساتھ موجود رہتے تھے، جن میں کتابیں بھری ہوئی ہوتی تھیں۔ اس کے پیش رو کے زمانے میں اردو یا دکنی سرکاری زبان بنا دی گئی تھی۔ علی عادل نے اس کی جگہ دوبارہ فارسی کو رائج کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

06 ابراہیم عادل شاہ ثانی معروف بہ ''جگت گرو'' (1580ء تا 1627ء)

علی عادل شاہ اوّل کو اس کے ایک غلام نے قتل کر دیا۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی، اس لیے اس کے بھتیجے ابراہیم عادل شاہ ثانی کو تخت پر بٹھایا گیا۔ جس کی عمر صرف دس سال تھی۔ جوان ہو کر سلطان نے اپنے نائبین سے تمام نظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اپنی ہمسایہ حکومتوں اور مغلوں سے جنگیں لڑنے کے باوجود اسے علم وفن اور شعروادب سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کے دور میں بہت سے شعراء دربار کی زینت تھے۔

01 مشہور مورخ ابوالقاسم فرشتہ نے اپنی کتاب **''تاریخ فرشتہ''** اسی دور میں لکھی۔

02 ظہوری نے **''سہ نثر ظہوری''** لکھی۔ (ظہوری 1580ء میں ہندوستان آیا تھا اور 1616ء میں اس نے وفات پائی۔)

03 ملک قمی نے **''مخزن اسرار نظامی''** کا جواب لکھا۔

04 اسی دور میں **''عجائب المخلوقات''** کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔

05 رفیع الدین شیرازی نے **''روضۃ الصفاء''** کا خلاصہ ترتیب دیا۔

یہ زمانہ اردو یا دکنی کے لیے بھی سنہرا دور تھا اور شعراء میں **عبدل، مقیمی، صنعتی، میر سنجر** اور **ملک قمی** وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

ظہوری کی دو کتابیں ''خوان خلیل'' اور ''گلزار ابراہیم'' اسی ابراہیم عادل شاہ کے نام پر ہیں۔ اور اس کی تین مشہور نثریں ''سہ نثر ظہوری'' کے نام سے مشہور ہیں۔ دراصل یہ نثریں ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف ''نورس'' کا دیباچہ ہیں۔

''نورس''، فن موسیقی کی ایک منظوم کتاب ہے جو ہندی میں لکھی گئی تھی۔ ابراہیم عادل شاہ کو فن موسیقی سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کے فن موسیقی میں مہارت کی وجہ سے اس دور کے مشہور گویئے اسے **''جگت گرو''** کہا کرتے تھے۔

''گل رعنا'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

''موسیقی کا شوق ایسا بڑھا کہ اطراف ہندوستان سے بلا کر تین چار ہزار گویئے بیجاپور میں جمع کئے اور 1008ھ میں بیجاپور کے قریب نورسپور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا جس میں گرو اور چیلوں کے لیے بڑی بڑی محل سرائیں بن کر تیار ہو گئیں۔ شاہی محل سرا کا نام نورس محل، شاہی مہر پر نورسی ،سکہ پر نورس، علم و نشان کے نام نورسی۔ بعض شاعروں نے اپنا تخلص بدل کر نورسی قرار دیا۔''

07 محمد عادل شاہ (1627ء تا 1657ء)

ابراہیم کے بعد اس کے بیٹے محمد عادل شاہ کو حکومت کے دوران کئی دشمنوں سے لڑنا پڑا۔ لیکن اس نے بھی اپنے باپ دادا کی طرح علم و ادب کی سرپرستی کی۔ اس دور میں:

01 حکیم آتش نے ''خمسہ نظامی'' کا جواب دیتے ہوئے پانچ مثنویاں لکھیں۔

02 ملا ظہور نے ''محمد نامہ'' ترتیب دیا۔

03 ملا محمد حسین نے ''احوال سلاطین'' کو مکمل کیا۔

04 رستمی نے خاور نامہ لکھا۔

05 محمد ابراہیم صنعتی، مقیمی، مرزا دولت اور ملک خوشنود نے بھی کتابیں تحریر کیں۔

08 علی عادل شاہ ثانی (1657ء تا 1672ء)

محمد عادل شاہ کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ (ثانی) حکمران بنا۔ اس دور میں بھی تصنیف و تحریر اور ترجمے کا کام ہوتا رہا۔ علی عادل شاہ خود بھی ایک شاعر تھا اور شاہیؔ تخلص کرتا تھا۔ نصرتی اسی زمانے میں بیجاپور آیا تھا۔ نصرتی کے علاوہ رستمی، ایاغی، شاہ ملک، سیوا، مومن، ہاشم اور مرزاؔ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں:

01 قاضی نوراللہ نے تاریخ عادل شاہی لکھی۔

02 نصرتیؔ نے گلشن عشق اور علی نامہ جیسی کتب تحریر کیں۔

03 دیگر شعراء کے کلام میں شغلیؔ، ایاغیؔ اور شاہ ملکؔ کا کلام آج بھی دستیاب ہے۔

دولتؔ اس دور کا ایک دکنی شاعر ہے اس نے ''شاہ بہرام و بانوئے حسن'' کے نام سے ایک قصہ لکھا تھا۔

اس دور میں ایک اور شاعر ''شاہ ملک'' سامنے آتے ہیں۔ شاہ ملک بیجاپور کے باشندے تھے۔ انہوں نے دکنی زبان میں ایک منظوم رسالہ ''احکام الصلوٰۃ'' لکھا تھا جس میں اس نے نماز کے فرائض و احکام بیان کیے ہیں۔ یہ رسالہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے اور 1077ھ میں تمام ہوا۔

شیخ امین الدین اعلیٰ جو شاہ امینؔ کے نام سے مشہور ہیں۔اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے مریدوں نے ان کے ارشادات کو جمع کیا اور ''جواہرالاسرار'' کے نام سے انہیں چھپوایا۔دواور رسالے بھی ان کی یادگار ہیں:

رسالہ قربیہ

رسالہ وجودیہ

09 سکندر عادل شاہ (1672ء تا 1686ء)

علی عادل شاہ ثانی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سکندر تخت نشین ہوا جو کہ اس وقت کم سن تھا۔اس دور میں یہ ریاست، مغل بادشاہ اورنگ زیب زیب عالم گیر کی ہوس ملک گیری کا شکار ہو کر ختم ہوگئی۔یہ 1686ء کا زمانہ تھا۔

عادل شاہی حکمرانوں کے دوسو سالہ دور حکومت میں مندرجہ ذیل شعراء اور نثر نگار سامنے آئے ہیں۔

عادل شاہی شعراء و مصنفین کی فہرست

سیریل	شاعر/نثر نگار	ادبی خدمات
01	شاہ برہان الدین جانم	وصیت الہادی مغز مرغوب سک سہلا منفعت الایمان
02	ابراہیم عادل شاہ ثانی	نورس
03	عبدلؔ	ابراہیم نامہ
04	آتشی	آتشی کا کلام دستیاب ہے۔
05	محمد مقیم مقیمیؔ	چندر بدن ومہیار
06	امین	بہرام وگل اندام
07	حسن شوقی	فتح نامہ نظام شاہ میزبانی نامہ
08	محمد ابراہیم صنعتی	قصہ بے نظیر گل دستہ
09	ملک خوشنود	ہشت بہشت بازار حسن
10	کمال خان رستمی	خوار نامہ
11	دولت	تکملہ بہرام وگل اندام مثنوی قصہ شاہ بہرام وبانوئے حُسن
12	علی عادل شاہ (شاہیؔ)	کلیات
13	محمد نصرت نصرتیؔ	گلشن عشق علی نامہ تاریخ اسکندری

14	شاہ ملک	شریعت نامہ
15	امین الدین اعلیٰ	محبت نامہ رموز السالکین دیوان
16	ظہوری	غزل
17	سید میراں ہاشمی	یوسفؑ زلیخاؑ
18	ایاغی	نجات نامہ
19	شغلی	پند نامہ
20	علی	پند دل بند
21	کریم	نظم مدحیہ وغیرہ
22	مرتضیٰ	وصل نامہ
23	حسینی	دیوان
24	مختار	معراج نامہ مولود نبیؐ
25	قدرتی	قصص الانبیا (علیہم السلام)
26	مومن	اسرار عشق
27	قادر	غزل معجزہ خاتون جنت
28	شاہ مومن	شجرہ الاتقیاء
29	معظم	دیوان گنج مخفی گلزار جنت

عادل شاہی عہد میں مثنوی:

01 عبدلؔ کی مثنوی

مثنوی ابراہیم نامہ

یہ مثنوی ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور کے ایک مشہور شاعر عبدلؔ کی تخلیق ہے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار میں فارسی کے علماء وفضلاء بڑی کثرت سے جمع تھے۔عبدلؔ دربار میں شعر صرف اس خوف سے نہیں کہتا تھا کہ کہیں وہ ان کے مقابلے میں ناکام نہ ہو جائے۔تو ایک دن بادشاہ نے عبدلؔ کو کہا کہ تم اپنے ملک کی زبان میں شعر کہو،عشق کے اسرار ہر زبان میں ہوتے ہیں اور شاعری کے حسن وکمال کو دیکھنے والے اسے دیکھ لیتے ہیں۔بادشاہ کے اس فرمان سے اس کی ہمت بندھی اور عبدلؔ اپنے ملک کی زبان میں مثنوی لکھنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔اس مثنوی کو لکھتے وقت عبدلؔ کے ذہن میں دو باتیں تھیں۔ایک یہ کہ وہ کوئی ''نوی بات'' کہے اور دوسرا یہ کہ اس ''نوی بات'' کو بالکل انوکھے انداز میں کہے کہ اس سے پہلے کسی نے یہ انداز نہ اپنایا ہو۔تو اس کے لیے عبدلؔ نے قصیدے کو مثنوی کا جامہ پہنانے کی سوچی۔اس کا خیال تھا کہ ایک تو خود بادشاہ نے فرمائش کی ہے اور اوپر سے اگر مثنوی میں بادشاہ کا قصیدہ لکھ دیا جائے تو وہ زیادہ خوش ہوگا اور اس سے مجھے بھی شعراء میں اچھا مقام ملے گا۔

یہ مثنوی فارسی ہیت اور فارسی بحر میں لکھی گئی ہے اور 713 اشعار پر مشتمل ہے۔یہ مثنوی حمد،نعت،در مدح یاراں در تعریف گیسوں دراز کے عنوان سے شروع ہوتی ہے اور بعد میں بادشاہ کی ذات،معمولات پسند وناپسند،محفل سرائی،شعر وموسیقی،تقریبات اور دیگر موضوعات پر گفتگو جاری رہتی ہے۔

مثنوی ابراہیم نامہ کے مطالعے سے اس دور کی زندگی،طور طریقے،رسم ورواج،ادب وآداب،انداز نشست وبرخاست،لباس و زیورات،عمارات وآرائش،مجلس زندگی،تقریبات،تفریحات،رقص وموسیقی کا عام ذوق اور بادشاہِ وقت اور اس دور کے شرفاء کے معمولات کی ایک واضح تصویر نظر آتی ہے۔

اس مثنوی میں منظر کو دیکھیں کہ مثلاً ایک جگہ پر دکھایا گیا ہے کہ محفل جمی ہوئی ہے اور بادشاہ تشریف فرما ہیں۔آرائش اور سجاوٹ سے محل کا حسن دوبالا ہو رہا ہے اور اسی اثنا میں ناچنے گانے والیاں حاضر ہوتی ہیں۔اس واقعے کا منظر دیکھئے!

؎ کوئی بالوں درمیاں یوں مانگ چیر
دِسے جیوں کسوٹی میں سونے کی کیر
کریا تار زر جیوں ، سہاون دکھائے
پڑیا سیاہ ریشم کے درمیان آئے
کوئی باندھ جوڑا دِسے یوں نمائے
سونے کے سرو پر بیٹھا مور آئے

کر یا ببیں کویل جو شمشاد پر
پکڑ پھول گل لعل مکھ چونچ کر (عبدلؔ)

02 محمد ابراہیم صنعتیؔ

مثنوی قصہ بے نظیر

یہ مثنوی محمد ابراہیم صنعتی کی ہے۔ صنعتی اس مثنوی کو فارسی میں لکھنا چاہتے تھے، مگر عزیز و اقارب کے اصرار پر اسے دکنی زبان میں پیش کیا ۔اس قصے کی بنیاد حضرت تمیم انصاری کو سات سال چار ماہ تک درپیش مشکلات کی تصویر کشی اور مافوق الفطرت واقعات پر ہے۔ حمد، نعت، منقبت، سخن، مدح محمد عادل شاہ کے بعد قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس قصے کی صداقت کو واضح کرنے کے لیے شاعر نے حدیث نبویؐ کو حضرت علیؑ کی روایت سے پیش کیا ہے۔ اور حضرت تمیم انصاری جس دُعا کو پڑھ کر بلاؤں کا مقابلہ کرتے تھے اس دعا کو بھی لکھا گیا ہے۔ مثنوی میں یہ کردار آئے ہیں، مثلاً: دجال، حضرت الیاسؑ، حضرت خضرؑ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؑ اور تمیم انصاری وغیرہ کی تفصیل بھی عام روایت سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔ مثنوی میں دلچسپی کو شروع سے آخر تک برقرار رکھا جاتا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے یہ مثنوی داستانی عناصر سے مرکب ہے۔ اس میں قصہ در قصہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ غیر معمولی واقعات کو روایت کے سہارے سے قابل یقین بنایا گیا ہے۔ جس طرح لمبی داستانوں میں طویل ہجر کے بعد وصال ہوتا ہے اسی طرح اس مثنوی میں بھی حضرت تمیمؓ سات سال اور چار ماہ تک لاپتا رہے اور پھر اپنی بیوی سے ان کا ملنا ہوا۔ استعجابت، ڈرامائی انداز اور نا قابل یقین باتوں کو قابل یقین بنا کر فطری طریقے سے پیش کرنا اس مثنوی کی وہ خوبیاں ہیں جو اس دور کسی اور مثنوی میں نہیں ملتیں۔ زور بیان کے حوالے سے بھی یہ مثنوی اس دور کی مثنویوں سے ممتاز نظر آتی ہے۔ پوری مثنوی کے مزاج پر اس کے اسلوب و آہنگ پر، ذخیرہ الفاظ اور تراکیب پر فارسی کا رنگ غالب ہے۔ یہاں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیا اسلوب نیا معیار سخن بن کر تخلیق کی راہوں کو کشادہ کرتا ہے۔

03 مرزا محمد مقیم مقیمیؔ کی مثنویاں

مثنوی فتح نامہ بکھیری

یہ مثنوی مرزا محمد مقیم کی ہے جو فارسی کے بڑے خوش گو شاعر تھے۔ ان کے دیوان میں قصائد، غزلیات، ترجیع بند رباعیات، قطعات، ساقی نامہ اور مثنوی شامل ہیں۔ اردو میں مثنوی ''فتح نامہ بکھیری'' ہے۔ یہ مثنوی سلطان محمد عادل شاہ اور راجہ امیر بعدرا کے درمیان لڑی جانے والی ایک لڑائی کی داستان ہے۔ اس دور میں یہ مثنوی اس لیے قابل توجہ ہے کہ اس میں فارسی طرز ادا اسلوب اور لہجے کا رنگ بہت نکھر کر سامنے آتا ہے۔ اس میں فارسی، عربی کے الفاظ کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے مصرعے فارسی آمیز اردو یا خالص فارسی کے ہیں۔ ترکیب اور بندش پر فارسی کا گہرا اثر ہے۔ اکثر جگہ پر اضافت بھی فارسی طریقے سے بنائی گئی ہے۔ مرزا مقیم نے محاورے اور ضرب المثال کو جا بجا استعمال کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنی مادری زبان (فارسی) کی طرح دکنی اردو پر بھی قدرت حاصل ہے۔

اس مثنوی میں بیجاپور کا اسلوب واضح طور پر فارسی اسلوب کے زیر اثر ہو جاتا ہے۔

مثنوی چندر بدن ومہیار

یہ مثنوی بھی مرزا محمد مقیم مقیمؔی کی ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ یہاں اس قصے کو موضوع سخن بنایا گیا ہے جو لیلیٰ مجنوں اور شریں فرہاد کی طرح سارے دکن میں مشہور تھا۔ یہ بیجاپور کی پہلی عشقیہ مثنوی ہے۔ یہاں مروجہ فارسی اسلوب میں قصے کے مختلف سروں کو خوش اسلوبی سے جوڑنے میں مقیمؔی کامیاب نظر آتے ہیں۔اس مثنوئ عشق کا قصہ عجیب وغریب اور دلچسپ ہے۔اس میں ازمنہ وسطیٰ کے داستانی مزاج، مافوق الفطرت عناصر سے ایک ایسی دلچسپی اور حیرت نا کی پیدا کی گئی ہے کہ سننے والے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ازمنہ وسطیٰ کے داستانی کردار عام طور پر شہزادے،شہزادیاں،سوداگر،تاجر اور درویش ہوتے تھے۔یہی کردار چندر بدن ومہیار میں نظر آتے ہیں۔

04 محمد عاجزؔ کی مثنویاں

مثنوی لیلیٰ مجنوں

یہ مثنوی شیخ احمد گجراتی کے بیٹے محمد عاجزؔ کی تصنیف ہے۔محمد عاجز نے اپنے والد کی دو مثنویوں ''لیلیٰ مجنو'' اور ''یوسف زلیخا'' کے موضوعات کو رواج زمانہ کے مطابق موضوع سخن بنایا۔ان دونوں باپ بیٹے میں فرق یہ ہے کہ شیخ احمد گجراتی جزئیات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور محمد عاجز قصے کو اولیت دیتے ہیں۔عاجز کی مثنوی لیلیٰ مجنوں کی بنیاد ہاتفی کی فارسی مثنوی ہے۔تاہم اسے محض ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عاجز نے اس میں بہت کچھ تبدیل کر دیا ہے۔لیلیٰ کا کردار، انداز عشق ومحبت، کیفیات ہجر ووصال، معیارات حسن وجذبات، سبھی کچھ برعظیم سے وابستگی کا تاثر دیتا ہے۔

مثنوی یوسفؑ زلیخاؑ

یہ مثنوی بھی عاجز ہی کی تصنیف ہے۔اس میں بھی معمولات کے مطابق حمد،نعت اور منقبت کے بعد بادشاہ کی تعریف ہے اور پھر اصل قصے کی ابتداء ہوتی ہے۔

05 حسن شوقیؔ کی مثنویاں

مثنوی فتح نامہ نظام شاہ

اس مثنوی میں حسن شوقیؔ نے حسین نظام شاہ کو اصل فاتح دکھایا ہے۔اس اعتبار سے احمد نگر کا نقطہ نظر،جنگی تیاریاں،رام راج سے دشمنی اور دوسرے حالات وکوائف کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔مثنوی کے ابتدائی حصے میں اس اتحاد کی طرف اشارہ کیا ہے جو چاروں سلطنتوں کے درمیاں ہوا تھا۔اور پھر اس کے بعد نظر کے تیور، بیان اور تفصیل اس طور پر سامنے آتے ہیں کہ باقی سارے بادشاہ غائب ہو جاتے ہیں۔اور مثنوی پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ صرف حسین نظام شاہ بحری اور رام راج کے درمیان ہی لڑی گئی۔فتح نامہ

نظام شاہ کی ہیت وہی ہے جو عام طور پر مثنویوں میں ملتی ہے۔حمد اور نعت کے بعد مختلف عنوانات قائم کیے گئے ہیں جو سب کے سب جیسا کہ اسی زمانے میں اور بعد تک دستور رہا۔مثنوی میں دکن کے سیاسی حالات کو بیان نہیں کیا گیا۔

مثنوی میزبانی نامہ

یہ مثنوی بھی حسن شوقی ہی کی تخلیق ہے۔اس میں محمد عادل شاہ کی مظفر علی خان کی لڑکی سے ہونے والی شادی کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔یہ مثنوی 1214 اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں ہندو مسلم ثقافت کو بھرپور طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔شعریت اور تخیل کی فروانی سے اس میں روانی اور رنگینی کا احساس بڑھ گیا ہے۔زبان،تلفظ اور املا کے حوالے سے یہ مثنوی ''فتح نظام شاہ'' سے ایک قدم آگے ہے۔

06 محمد نصرت نصرتی

نصرتی کا اصل نام محمد نصرت تھا۔وہ کرناٹک سے بیجاپور آیا تھا۔نصرتی کرناٹک کے فرمانروا کا رشتہ دار تھا۔بیجاپور میں علی عادل شاہ نے اس کو اپنا مقرب بنایا اور عہدہ و منصب عطا کیا۔نصرتی سنی المذہب تھا۔خواجہ گیسو دراز بندہ نواز کے مریدوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کا سن وفات 1095ھ بتایا جاتا ہے۔

مثنوی تاریخ سکندری

نصرتی کی یہ مثنوی 554 اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں سلطنت عادل شاہی کے آخری فرمانروا سکندر عادل شاہ کی تخت نشینی،سیاسی انتشار،ملکی حالات کے علاوہ دو دن کی لڑائی کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔تاریخ سکندی میں رزمیہ شاعری پائی جاتی ہے۔

مثنوی علی نامہ

''علی نامہ'' نصرتی کی ایک تاریخی مثنوی ہے۔اس مثنوی کا سن تصنیف 1076ھ بمطابق 1665ء ہے۔اس مثنوی پر نصرتی کو ''ملک الشعراء'' کا خطاب دیا گیا۔اس مثنوی میں شیواجی مرہٹہ اور مغلیہ سلطنت کے علاوہ علی عادل شاہ ثانی کے بدنور،تورگل،اور زاپکور کے معرکوں کا ذکر کیا گیا ہے۔نصرتی نے اپنی اس مثنوی کو ''شاہنامۂ دکن'' قرار دیا ہے۔اس مثنوی کی زبان صاف،سادہ،عام فہم اور سلیس ہے۔اس میں کنایات،تشبیہات،محاورات اور ضرب الامثال کو نہایت فنکاری سے استعمال کیا گیا ہے۔مصنف کو واقعات نگاری،منظر کشی اور کردار نگاری پر دسترس حاصل ہے۔

مثنوی گلشن عشق

یہ مثنوی 1068ھ بمطابق 1657ء میں تحریر کی گئی تھی۔یہ ایک عشقیہ داستان ہے اس کے ہیرو اور ہیروئن کے نام: کنور پسر سورج بھان اور مدھ مالتی ہیں۔عاقل خان رازی نے بھی اس قصہ کو **''شمع پروانہ''** کے نام سے فارسی میں نظم کیا تھا۔رنگین تشبیہوں اور استعاروں کی وجہ سے یہ مثنوی اپنی مثال آپ ہے۔گلشن عشق کے بعض الفاظ تو نہایت صاف ہیں اور بعض نہایت دقیق ہیں۔کہیں عربی و فارسی کی فروانی ہے تو کہیں بھاشا کی بھرمار نظر آتی ہے۔اس کے دیباچے میں حسب معمول علی عادل شاہ کی تعریف کی گئی ہے۔

گلدستۂ عشق

یہ مثنوی 1650ء سے 1670ء کے درمیان لکھی گئی۔ گلدستۂ عشق کے بارے میں شمس اللہ قادری لکھتے ہیں کہ یہ نصرتی کی تیسری مثنوی ہے اور گارسن ڈیٹاسی کے مطابق یہ مثنوی نہیں بلکہ عشقیہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔

07 ملک خوشنود

مثنوی جنت سنگھار

یہ مثنوی ملک خوشنود کی تصنیف ہے۔ ملک خوشنود قطب شاہیوں کے ہاں ایک غلام کی حیثیت سے رہتا تھا۔ جب خدیجہ سلطان کی شادی محمد عادل سے ہوئی تو ملک خوشنود سامان وغیرہ کی حفاظت کے لیے اس کے ساتھ بیجاپور روانہ ہوا۔ اس کے غیر معمول انتظامی اوصاف کے سبب ملکہ خدیجہ نے اسے حکومت میں عہدیدار بنادیا۔ ایک وقت ایسا آیا جب محمد عادل شاہ نے ملک خوشنود کو اپنے سفیر کے طور پر گولکنڈہ بھیجا۔

ملک خوشنود اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ مثنوی ''جنت سنگھار'' میں حمد، نعت، صفت معراج منقبتِ چار یار، مدح میر مومن اور محمد عادل شاہ کی توصیف وستائش کے بعد اصل قصہ شروع ہوجاتا ہے۔ اظہار کی جو قوت مثنوی کے ابتدائی حصے میں ہے وہ بعد میں مفقود ہوجاتی ہے۔ جس کی وجہ شاید ترجمہ کی مجبوری ہے۔ تاہم جہاں کہیں ترجمے کے علاوہ بات چل نکلتی ہے۔ خوشنود کا فن بلندی کی طرف گامزن ہوجاتا ہے۔

08 کمال خان رستمیؔ

مثنوی خاور نامہ

کمال خان رستمیؔ کے والد کا نام اسمٰعیل خان ہے۔ خدیجہ سلطان کی فرمائش پر کمال خان رستمی نے ابن حسام کی مثنوی ''خاور نامہ'' کا ترجمہ کیا۔ بیس ہزار اشعار پر مبنی رستمی کا یہ ترجمہ ان کا ایک شاندار ادبی کارنامہ ہے۔ یہ ترجمہ متن کے مطابق کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں توضیحات کے لیے دو چار شعر زیادہ ہیں۔ اس مثنوی میں حضرت علی علیہ السلام کی معرکہ آرائیوں کو ''داستان امیر حمزہ'' کی طرز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس قصے میں مافوق الفطرت عناصر کی فروانی ہے۔ ترتیب، ربط، تسلسل اور توازن نے اسے دلچسپ اور رنگین بنادیا ہے۔ اس مثنوی کی زبان سادہ ہے اور اس میں نثر کی طرح روانی پائی جاتی ہے۔

09 ہاشمیؔ

ہاشمی کا اصل نام سید میراں بتایا جاتا ہے۔ بیجاپور کے رہائشی تھے اور مادرزاد اندھے تھے۔

مثنوی یوسفؑ زلیخاؑ

ہاشمی نے اپنے مرشد سید شاہ ہاشم علویؒ کی فرمائش پر ''یوسفؑ وزلیخاؑ'' کی ایک عشقیہ مثنوی لکھی۔ اس مثنوی کی زبان دکنی ہے اور 1099ھ میں تمام ہوئی تھی۔ اس میں 6000 سے زیادہ اشعار ہیں۔ دکنی ادب میں یہ مثنوی ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

10 بحری:

بحرؔی کا اصل نام قاضی محمود اور بحرؔی تخلص تھا۔ والد کا نام بحرالدین تھا۔ بحرؔی دکن کے ایک صوفی مشرب شخص تھے۔ 1095ھ کے قریب اپنے وطن سے بیجاپور چلے گئے۔ اور وہاں دوسال تک سکندر عادل شاہ کے دربار میں رہے۔ جب 1057ھ میں سلطنت تباہ ہوگئی تو بحرؔی نے حیدرآباد کا رخ کیا۔ فارسی اور دکنی زبان میں مثنویاں، غزلیات، رباعیات اور قصائد لکھے۔ جن کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار (50,000) کے قریب تھی مگر یہ سب ذخیرہ راستہ میں تلف ہوگیا۔

مثنوی من لگن

یہ مثنوی تصوف کے عنوان پر لکھی گئی۔ اس کی زبان دکنی ہے اور سن تصنیف 1112ھ بتایا جاتا ہے۔ اس کی زبان مشکل اور الفاظ سخت ہیں۔

ان تمام شعراء کے علاوہ عادل شاہی دور میں سید محمد فیاض ولؔی، دکن کے رہنے والے تھے۔ ایک اور شاعر فقراللہ آزاؔد بھی تھے۔ جو حیدر آباد کے باشندے تھے۔

عادل شاہی عہد میں غزل:

عادل شاہی عہد میں غزل کے شعراء بھی موجود ہیں۔ان میں سے اکثر کے کلام کے نمونے آج بھی دستیاب ہیں۔عادل شاہی عہد کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

''اس سرزمین پر علم وادب کا پودا ایسا پھلا پھولا کہ خود سلطنت کو چار چاند لگ گئے۔''

اس دور میں مثنوی اگر چہ غالب رہی ہے مگر غزل کا ذائقہ پھر بھی پھیکا نہ ہونے پایا۔اکثر شعراء نے مثنوی کے ساتھ ساتھ غزل کو اپنے دامن میں سموئے رکھا۔اس دور کی غزل میں عاشقی اور معشوقی کو ہی موضوع بنایا گیا۔اس دور کی غزلوں میں عشق مجازی ہے۔عورتوں کا ذکر ہے اور کہیں کہیں عورتوں کی سراپا نگاری ہے تو کئی جگہوں پر ان کے جنسی اعضاء کی تعریف کی گئی ہے۔اس کے علاوہ عشق حقیقی بھی ان غزلوں میں نظر آتا ہے۔اس عہد کی بعض غزلوں پر ہندی رنگ کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔مثلاً شاہیؔ، ہاشمیؔ اور نصرتیؔ کی غزلیں۔بعض شعراء کی غزلوں پر تصوف اور اخلاق کا رنگ بھی غالب دکھائی دیتا ہے۔مثلاً: امین الدین اعلیٰ، قادرؔ اور سید شہبازؔ حسینی وغیرہ۔

01 علی عادل شاہ ثانی متخلص بہ شاہیؔ:

سلطان محمد عادل شاہ کے فرزند اور عادل شاہیوں کے آٹھویں بادشاہ علی عادل شاہ ثانی شعر وسخن کے ماحول میں پلے بڑھے۔اور خود اپنے زمانے میں بھی علم وادب کی خاصی آبیاری کی۔اس کی سرپرستی میں اردو نے ترقی کی کئی منزلیں طے کیں۔فارسی کے علاوہ اس کو اپنی مادری زبان یعنی دکنی اردو سے خاصہ لگاؤ تھا۔اس کی غزلوں میں حسن اور شوخی کی گہری چھاپ نمایاں ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

''اس کی شاعری میں ایک جشن، ایک طرب اور ایک سرمستی کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ بسنت، بہار، موتی، ہیرے، سونا چاندی، رنگ ساز، شراب وشاقی، محبوب ووصل کے کنایے شاعری کی فضاء کا رنگ بھرتے ہیں۔'' (تاریخ ادب اردو)

شاہی کی غزل کا نمونہ دیکھئے:

پریت کی ریت سوں موہن کہے ہنس ہنس سنو شاہیؔ
عجب شہرت ہوئی جگ میں ہماری عشق بازی کی
بھرے چشمے ادھر مد کے لبوں میں لب ملاتے ہیں
نین سودھن چھکے ہو رہے نظارے پئے پیالے

02 حسن شوقیؔ:

شوقی کا نظام شاہی سلطنت سے تعلق تھا، مگر جب مغلوں نے 1600ء میں اس سلطنت پر قبضہ کر لیا تو شوقیؔ عادل شاہی سلطنت میں

آ گئے، جہاں سے وہ سلمان محمد عادل کے سفیر کی حیثیت سے گولکنڈہ گئے۔اعلیٰ سطح کے شاعر تھے۔ان کی دو مثنویاں اور 31 غزلیات ہیں۔
شوقؔی کی غزل گوئی کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

''وہ غزل کو عورتوں سے باتیں کرنے اور عورتوں کی باتیں کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔''

ان کا ایک شعر دیکھئے۔

شوقؔی شکر غزل کی کھنڈیاں سوں بانٹتا ہے
طوطی طبع کوں میرے یک من شکر نہ بھیجا

03 سلطان ابوالحسن تانا شاہ:

تانا شاہ کی غزل میں نکھار اور تازگی ہے۔اس کی غزل پڑھ کر ولیؔ دکنی کی غزل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔اس کی غزل میں زبان صاف، عام فہم، سادہ اور سلیس ہے۔اس کی غزلیں مترنم ہیں۔

؎ اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ
جیوں گل شگفتہ ہو کر مری انجمن میں آ

؎ کب لگ رہے گا جیوں لب تصویر بے سخن
اے شوخ خود پسند تو ٹک بھی سخن میں آ

؎ چاہتا ہوں وصف قد میں کروں فکر شعر کی
اے معنی بلند شتابی سوں من میں آ

؎ اے جان بوالحسنؔ تو اچھے خوش لٹک ستی
بند قبا کوں کھول کے صحن چمن میں آ (ابوالحسنؔ تانا شاہ)

04 سید میراں میاں خاں ہاشمی:

ہاشمی علی عادل شاہ کے دور کا شاعر تھا۔ بیجاپور اس کا وطن تھا۔بچپن ہی سے اندھے پن کا شکار ہو گیا تھا۔میراں میاں اپنے مرشد شاہ ہاشم علویؒ یا (شاہ ہاشم مہروی) کی نسبت سے ہاشمی کہلاتا تھا۔اس کا انتقال 1109ھ میں بتایا جاتا ہے۔وہ ایک قادرالکلام اور پرگو شاعر تھا۔
اس کی تصانیف میں:

مخمس در نعت و مدح مہدی جونپوری	معراج نامہ	مثنوی یوسف زلیخا

اور دیوان ہاشمی شامل ہیں۔

ہاشمی کی غزلوں میں اشعار کی حد چالیس بیالیس تک ملتی ہے۔اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہاشمی کے زمانے تک غزل کو محدود نہیں کیا گیا تھا مثنوی کی طرح غزلیں بھی لمبی لمبی ہوتی تھیں۔ ہاشمی کی غزل نصرتیؔ اور شاہیؔ کی غزلوں کے مزاج کو آگے بڑھا رہی ہے۔اور

یہاں بھی رنگ رلیاں منانے ،کھیل کھیلنے اور داد وعیش دینے کا جذبہ کارفرما ہے۔ ہاشمی کا تصورِعشق یہاں بولہوسی کی سطح پر رہتا ہے۔ان کی غزلوں میں دکن کی عورتوں کا ماحول، سامان آرائش، لباس، طور طریقے، زیوارات کھانے پینے کی چیزیں، موسیقی کے مخصوص ومقبول راگ، تفریح وچہل اور زبان ومحاورہ محفوظ ہوگئے ہیں۔ ہاشمی کے غزلوں کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

''یہ غزلیں دکن کی ضعیف اور زوال پذیر تہذیب کی پوری طرح آئینہ دار ہیں۔''

ہاشمی کی غزلوں کی محبوبہ ایک سانولی سلونی، سخت سینہ، گداز جسم، دلربائی میں کافر اور سیج پر کھیل کھیلنے والی عورت ہے۔جس کے اندر جنسی ہیجان اور عشقیہ جذبات کی شدت ہچکولے لے رہی ہے اور جسم کا انگ انگ انگڑائیاں لے رہا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

''عورت اپنے پورے خدوخال کے ساتھ اسی طور پر ہاشمی کی
غزلوں میں ابھری ہے کہ مصور اس کی تصویر بنا سکتا ہے۔''

یہی وجہ تھی کہ ہاشمی کی غزلیں عورتوں اور مردوں میں یکساں مقبول تھیں۔ان کی غزلوں میں جسم اور جنس کے ہزار روپ ملتے ہیں۔

پیا ایسے میں آئے تو گلے لگ کر گرم ہوں گی — کرم میں رب کی ہوؤنگی دو دانا دان ٹھنڈ کالا
تیرے سنگار کے بن میں تماشا میں نول دیکھا — سرو کے جھاڑ کو مزمل اناراں سے دو پھل دیکھا
تیرا قد نیشکر جانوں مکیاں جوبن چنے کیاں دوں — تیرے سینے کے جل میانے کسچن کے دو کنول دیکھا

05 محمد امین ایاغیؔ:

علی عادل شاہ ثانی کے دور کے اس شاعر نے اصلاحِ معاشرہ کے لیے بادشاہ کی ذات میں مثبت تبدیلوں کو ضروری جانا اور عیش و عشرت کی دنیا میں مگن بادشاہ کو سدھارنے اور راہ راست پر لانے کے لیے شاعری کو بطور ذریعہ استعمال کیا۔ایاغیؔ مذہبی شخص تھا اور شریعت کا سخت پابند تھا۔اسی وجہ سے انہوں نے پند ونصائح کو موضوع بنا کر علی عادل شاہ ثانی (شاہیؔ) کے سامنے ایک مثنوی پیش کی جس میں بادشاہ کو نیکی اور انسانیت کا درس دے کر عاقبت کا خوف دلایا۔ایاغیؔ کی غزلوں میں سادگی، سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔اس کی غزلوں میں درویشانہ مزاج پایا جاتا ہے اور اس کے عشق کے جذبات جنسی اور بوالہوسی سے پاک اور مبرا ہیں۔

- گند کیا ہوا ہے سو معلوم نہیں — مجھے دیکھ کے آج انجان ہے
- زمین پر سورج کوئی دیکھیا نہیں — ایاغی تجھے دیکھ حیران ہے
- مرے من منے آج او دھیان ہے — کہ اس مست خوں ریز کا دھیان ہے
- جداں تے ترا زلف دیکھیاں ہوں میں — تداں تے مرا من پریشان ہے
- ہوا باد و باراں مرا جیو آج — ترے عشق کا دل میں طوفان ہے
- تجے جیو تے میں زیادہ منگوں — ترے پر مرا جیو قربان ہے
- دیاں ہوں محبت منے جیو میں — محبت میرا جیو ایمان ہے (امین ایاغیؔ)

06 مولانا محمد نصرت نصرتی:

نصرتی کا نام شیخ محمد نصرت اور وطن بیجا پور ہے۔ ان کے آباؤ اجداد بیجا پور میں فوجی ملازم اور والد رکاب شاہی کے سلحدار تھے۔ نصرتی نے اس وقت کے مشہور علماء وفضلاء سے تعلیم حاصل کی۔

نصرتی کی تصانیف میں گلشن عشق، علی نامہ، تاریخ اسکندری اور غزلیات، قصائد، مخمس، ہجو، اور رباعیات پر مشتمل ''دیون نصرتی'' شامل ہے۔ نصرتی غزلوں میں عورتوں پر فدا نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی (بحوالہ تاریخ ادب اردو):

''اس کی غزلوں میں ایک ندیدہ پن اور عورت کو دیکھ کر رال ٹپکنے کا احساس ہوتا ہے۔''

ؔ ہے نصرتی جگت میں جنم حسن کا بھوکا — نعمت تجہ ایسی پائے پر رہے دل صبور کیا
ؔ فارغ بکٹ ہیں مہر جو کرنا سو بیگ کر — اجنوں توں دیکھتی ہے عبث گھور گھور کیا
ؔ چاکھیا ہوں جب ادھر تے تیرے شہر ناب میں — مٹتا نہیں تب تے زمیں پر جلاب میں
ؔ چل وصل کا شربت چکا مجہ بیگ پنچابی — بدھا کی اجل جو مبادا تلک آوے
ؔ عالم کی تب تے نصرتی پروا سٹیا مدام — جب تجہ شراب حسن کی سنی اسے چڑی
ؔ کشتی میری امید کی تھی بہرہ کے طوفان میں — تس پر مدن گرداب ہو پھر پھر ڈباتا سارے
ؔ پرت کے مد کے بے سد کون نہ پوچھ بات سد بد کی — کہ جیو سرمست ہونے میچ ہی ٹلتا ہے سب جس سوں

اُردُو ادب کے دبستان

لفظ ''دبستان'' کے لیے لغات میں کوئی خاص ایسا لفظ نہیں تھا جو کہ اس لفظ (دبستان) کی توضیح کے لیے کافی سمجھا جاتا۔ سب سے پہلے مولانا الطاف حسین حالیؔ نے دبستان کے لیے دی اسکول آف تھاٹ (The School Of Thought) کا لفظ استعمال کیا۔ یعنی کسی مکتبِ فکر کو دبستان کہتے ہیں۔

اب شاعری کے لیے ہمارے پاس تین مکاتبِ فکر ہیں۔

۱ ۔ شاعری کا دہلوی مکتبِ فکر یعنی دبستانِ دہلی

۲ ۔ شاعری کا لکھنوی مکتبِ فکر یعنی دبستانِ لکھنو

۳ ۔ شاعری کا لاہوری مکتب فکر یعنی دبستانِ لاہور

چونکہ ہمارے گومل یونیورسٹی کے نصاب میں پہلی ٹرم میں صرف دو دبستان (دلی ولکھنؤ) شامل ہیں چنانچہ ہم انہی دو دبستانوں کی وضاحت دیکھتے ہیں۔ دبستانِ لاہور کو آئندہ ٹرم میں (اقبال کے خصوصی مطالعہ میں) پڑھیں گے۔

دبستانِ دہلی: (Dehli School Of Thought)

دلی میں مغلوں کا دورِ زوال اردو شاعری کے عروج کا زمانہ ثابت ہوا۔ اردو شاعری کو معاشرتی بے اطمینانی، معاشی بدحالی اور سیاسی عدم استحکام نے متاثر کیا تھا۔ چنانچہ شعراء کی آنکھیں زمین سے ہٹ کر آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ جسم سو گیا لیکن عقل بیدار ہوگئی۔ دہلی کی شاعری میں جذبہ داخلی نوعیت کا اور عشق کا تصور اعلیٰ اور ارفع ہے اور شعراء نے اسے صدقِ خیال سے شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ تصوف نے دلی کی شاعری میں عمودی جہت پیدا کی' کعبہ و مے خانہ اور دَیر و حرم میں بھی حدودِ امتیاز قائم رکھی گئیں اور ذہن و دل کی طہارت کو فوقیت دی گئی۔ چنانچہ دلی کا شاعر اس شمع کی طرح تھا جو آہستہ آہستہ جلتی اور اپنے آنسوؤں میں نہاتی ہے۔ تغزل میں مضامینِ عشق کو اہمیت حاصل ہے لیکن زیادہ جلوے حقیقت کے ہیں جو روح کو جھنجھوڑ ڈالتے ہیں۔ دلی کی سادہ زبان داخلی طور پر توانا اور جذبے کے تحرک سے آشنا ہے۔ اس کی سادگی میں جاذبیت اور صفائی میں روانی ہے۔ نورالحسن ہاشمی نے اس افتادِ ذہنی اور مزاجِ شعر و ادب کو دہلویت کا نام دیا ہے۔ (ڈاکٹر انور سدیدؒ)

نوٹ:

سادہ لفظوں میں دہلی کے دبستان سے مراد دہلی کے شعراء کا کلام اور اس زمانے کی ثقافت کی عکاسی ہے۔

دبستان دہلی کے نمائندہ شعراء:

میر محمد تقی میرؔ	مرزا محمد رفیع سوداؔ	خواجہ میر دردؔ

کہا جاتا ہے کہ کسی نے میر محمد تقی میرؔ سے پوچھا کہ دلی میں کتنے شعراء ہیں تو انہوں نے کہا کہ دلی میں اڑھائی شاعر ہیں۔ جب پوچھنے والے نے وضاحت طلب کی تو بتایا کہ ایک میں (یعنی میرؔ) ایک سوداؔ اور آدھا شاعر میر دردؔ ہے۔ تو اس شخص پوچھا کہ میر سوزؔ کے بارے میں کیا خیال ہے تو میر تقی میرؔ نے کہا کہ چلو میاں تمہارے اسرار پر مان لیتے ہیں کہ دلی میں پونے تین شعراء ہیں۔

اس ساری بات سے میرؔ کا اپنی شاعری پر فخر سامنے آتا ہے کہ ان کے سامنے کوئی شاعر جچتا ہی نہیں تھا۔ ان کی نظر میں دردؔ آدھا شاعر تھا اور میر سوزؔ تو ایک شاعر کا ایک چوتھائی حصہ تھا۔ بعد کے ادیبوں اور نقادوں نے بھی سوداؔ اور میرؔ کی عظمت کو قبول کیا اور ان کے زمانے کو انہی کے نام سے منسوب کر دیا یعنی ان کے عہد میں ہونے والی شاعری میرؔ و سوداؔ کے عہد کی شاعری کہلاتی ہے۔

میرؔ و سوداؔ کے دور کے تخلیقی رجحانات

(1706ء سے 1810ء تک)

یاد رہے کہ میرؔ اور سوداؔ کا زمانہ 1706ء سے 1810ء تک کے عرصے پر محیط ہے اور یہ سوال مندرجہ ذیل عنوانات سے آتا ہے۔:

01 میرؔ و سوداؔ کا زمانہ

02 اردو شاعری کا زریں عہد

03 شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کی صبح صادق

اٹھارہویں صدی عیسوی برصغیر کے تہذیبی زوال اور انتشار کی صدی تھی۔ پورا ملک ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر ٹکڑا اپنی انفرادی بقاء کے لیے جنگ لڑ رہا تھا۔ مغرب میں ابدالی اور دُرانی اور مشرق میں انگریز تاجر دندانِ آز تیز کر رہے تھے۔ معاشی بدحالی کی وجہ سے عدم اطمانیت عام تھی اور زندگی کی معنویت رنج والم سے عبارت تھی۔ اس نا آسودہ فضاء میں خواجہ میر دردؔ، مرزا سوداؔ اور میر تقی میرؔ تین ایسے شعراء پیدا ہوئے جنہوں نے روح عصر کو زبان دے دی اور اس زوال آمادہ دور کو اعلیٰ پائے کی شاعری کا سرچشمہ بنا دیا۔

یہ تینوں اساتذۂ ادب کمالِ فن میں اپنی مثال آپ تھے۔ خواجہ میر دردؔ خاص صوفی شاعر تھے۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ قصیدے کے شہنشاہ تھے اور غزل کے میدان میں میر تقی میرؔ کو ''سرتاج شعرائے ہند'' اور ''خدائے سخن'' کا درجہ حاصل تھا۔ خواجہ میر دردؔ کے گھر پر جو مشاعرے ہوا کرتے تھے ان میں شاعری کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی زور دیا جاتا تھا۔ پھر یہ مشاعرے دردؔ کے گھر سے میر تقی میرؔ کی بیٹھک پر منتقل ہو گئے۔ میرؔ اور ان کے رفقاء کی اعطاء یہ ہے کہ زبانِ اردو جو ابھی تک کچی زبان تھی اس میں مضبوطی اور روانی پیدا کرنے کے لیے ان لوگوں نے فارسی ترکیبوں اور فارسی الفاظ کو اردو میں شامل کر لیا۔ میرؔ اور سوداؔ کے معاصر شعراء میں مرزا مظہر جان جاناںؔ، تاباںؔ، یقینؔ اور قائمؔ چاندپوری شامل ہیں۔ آیئے اب ان شعراء کا کلام اور ان کے دور میں پائے جانے والے شعری رجحانات کا جائزہ لیتے ہیں۔

خواجہ میر دردؔ (متوفی ۱۷۸۴ء)

خواجہ میر دردؔ کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ حضرت محمد زبیری نقشبندی کے مرید اور سعد اللہ گلشنؔ کے پیرِ صحبت تھے۔ والدہ درویش مزاج محمد حسینی قادری کی دختر تھیں۔ خواجہ میر دردؔ دلی میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں وفات پائی۔ دردؔ نے اپنے علم کو فیضانِ علم لدنی لکھا ہے۔ لیکن اس میں ان کے والد گرامی کی اعلیٰ تربیت اور تعلیم بھی شامل ہے۔ وہ سپاہی پیشہ تھے، انہوں نے عین جوانی میں خرقۂ درویشی پہن لیا اور فقر استغناء اور توکل وقناعت کی دولت عمر بھر تقسیم کی۔ دلی کے بادشاہوں کے مضبوط قلعے منہدم ہوتے رہے لیکن میر دردؔ کا آستانہ قائم رہا۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

01 شمعِ محفل	02 آہِ سرد	03 نالہ مورد
04 واردات	05 دردِ دل	06 علم الکتاب

دردِ دل تک ان کی تصنیفات عارفانہ مسائل کے توضیحی رسالے ہیں لیکن ''علم الکتاب'' کو تصوف کی عالمانہ کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر انور سدیدؒ لکھتے ہیں کہ:

''خواجہ میر دردؔ کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جو صاحبِ سخن کی دیدار نمائی کرتا ہے۔''

چنانچہ جب لوگ زندگی کے طوفان میں جینے کے ہاتھوں مر رہے تھے جو میر دردؔ نے کہا!

؎ پھوٹے گا اس زمین میں بھی گلزار معرفت
میں یاں زمینِ شعر میں وہ تخم بو گیا (دردؔ)

انہیں رتبۂ شاعری بنانے اور نتیجۂ ظاہری حاصل کرنے کی فکر نہیں تھی نہ کبھی کسی کی مدح کی، نہ ہجو لکھی۔ شعر نہ آورد پر موزوں کیا نہ کسی کی فرمائش پر لکھا۔ شاعری ان کی تصوف کی زبان اور صریر خامہ نوائے سروش تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نکات تصوف کو نئی معنویت مل گئی اور جز و خود کل کے روبرو محسوس کرنے لگا۔

؎ وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آسکے
آئینہ کیا مجال تجھے مُنہ دکھا سکے

؎ کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بُو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے جس دل میں تو نہ ہو (دردؔ)

دردؔ کی شاعری میں دنیا کی بے ثباتی کا تصور ان کے احساس و تجربے سے پیدا ہوا اور یہ تجربہ انہوں نے عین قعرِ دریا میں رہ کر حاصل کیا۔ دوسری طرف انہوں نے مجاز سے حقیقت کی، قطرے سے دریا کی اور جزو سے کل کی صورت نمائی کی۔ اور یوں ازل کا ناتا ابد کے ساتھ باندھ دیا۔

؎ لے کر ازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے
گر درمیاں حساب نہ ہو ماہ و سال کا

؎ میں نہیں ازل سے پر تا ابد ہوں باقی
میرا حدوث آخر جا ہی بھڑا عدم سے (دردؔ)

دردؔ کی شاعری کا رخ مجاز کی طرف بھی ہے۔اوراس قسم کے اشعار وارفتگی، معصومیت اور بے ساختگی کا پرتو لیے ہوئے ہیں۔

؎ اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
؎ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
؎ دل بھلا ایسے کو اے دردؔ نہ دیجئے کیوں کر ایک تو یار ہے اور تِسپہ طرح دار بھی ہے (دردؔ)

دردؔ کی زبان سادہ اور شائستہ ہے۔انہوں نے محاورہ اور روزمرہ کثرت سے استعمال کیا لیکن میر کی طرح عوام سے گفتگو نہیں کی۔ان کے اشعار کی دھیمی موسیقی دردمندی کی داخلی لہر کو اجاگر کر دیتی ہے۔انہوں نے رباعی میں بھی اظہار کیا ہے۔ڈاکٹر انور سدیدؒ کے مطابق:

''ان کی بنیادی اعطایہ ہے انہوں نے غزل کی تہذیبی روایت پیدا کی اور اسے ارتقاء کے اگلے زینے پر چڑھنے کا راستہ دکھایا۔دردؔ اس دور کے اہم ترین شعراء میں شمار ہوتے ہیں اور میر تقی میرؔ کا انہیں آدھا شاعر کہنا محض افسانہ نظر آتا ہے۔''

مرزا محمد رفیع سوداؔ (متوفی ۱۷۸۱ء)

مرزا محمد رفیع سوداؔ کے اجداد بخارا سے وارد ہندوستان ہوئے تھے۔ان کے والد مرزا محمد شفیع تاجر تھے۔سوداؔ شاہجہان آباد میں پیدا ہوئے۔خان آرزوؔ کو یقین تھا کہ سوداؔ اردو میں کہیں گے تو یکتائے زمانہ ہوں گے۔وہ سمجھ گئے اور فوراً اس پر عمل کرنے لگے۔قائمؔ اور میرؔ کے خیال میں سوداؔ ملک الشعراء کا اعزاز و امتیاز رکھتے تھے۔آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ گئے اور وہیں وفات پائی۔سوداؔ کو زندگی میں عسرت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اس لیے دوسرے شعراء کی بہ نسبت ان کا ردِ عمل طغیانی تھا۔یہ ردِ عمل ہجو میں ظاہر ہوتا تو دریا کے دونوں کنارے کاٹتا چلا جاتا۔قصیدہ میں رواں ہوتا تو مدح کے نئے صفت خواں طے کر جاتا انہیں میر تقی میرؔ سے محبت بھی تھی اور چشمک بھی تھی۔اور میرؔ، ضاحکؔ، فدویؔ، قائمؔ، بقاءؔ، میرزاؔ، فاخرؔ اور ندرتؔ سے یادگار معرکے کیے۔جن میں مرزا کی مذہبی عصبیت بھی شامل تھی۔ان کی بہت سی تحریریں نایاب ہیں لیکن جو تخلیقات دستیاب ہیں ان میں قصیدے، مثنویاں، غزلیں، رباعیات، مخمس، مسدس، واسوخت جیسی اصناف شامل ہیں۔ قصیدہ اور ہجو میں سوداؔ کا امتیاز مسلمہ ہے۔اپنی غزل کی مدافعت خود سوداؔ نے یہ لکھ کر کی۔

؎ کہتے ہیں وہ جو ہے سوداؔ کا قصیدہ ہی خوب
ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا (سوداؔ)

حقیت یہ ہے کہ سوداؔ نے قصیدے کے تجمل و جلال کو اردو غزل میں اس طور پر استعمال کیا ہے کہ ان کی خیال بندی کو منفرد مقام حاصل ہو گیا۔

؎ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں
؎ گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی
؎ پردے کے تعین کو درِ دل سے اٹھا دے کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا (سوداؔ)

سوداؔ نے فغانیؔ، بیدلؔ، صائبؔ اور نظیری کا اثر تسلیم کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ سوداؔ کی شاعری میں عروسی معنیٰ رنگین و دل آویز ہو گئے۔سوداؔ نے معنی و مضمون کو ہمیشہ اساسی چیز سمجھا اور عشق کی نشاط کی بلا خیز تصویریں پیش کر دیں۔

؎ اندمِ گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے چاک جوں خوش قدوں کے تن پہ مسکتی ہیں چولیاں
؎ نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سوداؔ بیاں شمع ساں جس کے بدن پر ہو پسینے کی خراش
؎ کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں (سوداؔ)

سوداؔ نے قصیدہ کی تیز روندی بھی فارسی زبان کے ممبع و مآخذ سے جاری کی تھی۔اور اس سے فارسی قصیدے کا ہم پلہ بنانے کے لیے مطلع، تشبیب، گریز، مدح اور عرض مدعا کی فنی شان برقرار رکھی۔اب تشبیہ و استعارہ کی نادر اکاری سے اسے چمکا دیا۔سوداؔ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے قصیدے کی ہیت میں **''شہر آشوب''** اور **'' تضیک روزگار''** جیسی طویل نظمیں لکھی۔جن میں ہجو کی کڑواہٹ بھی ہے اور طنز کی زہر ناکی بھی ہے۔شخصی ہجویات میں سوداؔ کا لہجہ سوقیانہ ہے۔اور یہاں وہ عبید زانی کو موت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔البتہ جن ہجویات میں سوداؔ نے اشیاء اور مظاہر کی علامتی صورت استعمال کی ہے۔وہاں سماجی طنز کامیابی سے ابھری ہے۔ان کے مزاج پر قصیدے کا مثبت ہجو اور

منفی پہلو اس قدر غالب تھا کہ وہ مثنوی میں توازن و اعتدال کو برقرار نہ رکھ سکے۔ چنانچہ لکھا گیا مثنوی میں سوداؔ کی فکر مقبول نہیں۔ سوداؔ نے اردو مرثیہ میں نہ صرف اختراعات کیں بلکہ اپنی فصاحت و بلاغت کا معیار بھی قائم رکھا۔ انہوں نے مرثیہ میں شہادت کے واقعات میں اختصار برتا لیکن تمہید اور چہرہ کے بیان میں پوری قادرالکلامی سے کام لیا اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہید اور چہرہ کی حدود فن قصیدے سے جا ملتی ہے لیکن بیان شہادت کے لیے رزم کی آگاہی ضروری ہے جس سے سوداؔ پوری طرح واقف نہیں تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ سوداؔ مرثیہ لکھ لکھ کر مہربان خان کے نام کرتے جاتے تھے۔ جو خود شعر نہیں کہہ سکتے تھے۔

سوداؔ اردو ادب کی قد آور، توانا اور کثیرہ الجہت شخصیت تھے۔ وہ صنف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ ایہام کے تدارک اور ہند ایرانی کلچر کے فروغ میں ان کی خدمات گراں قدر ہیں۔ انہوں نے اردو کی غرابت دور کی اور ان گنت نئی ترکیبیں وضع کیں۔ بقول آزادؔ کے زور طبع سے دو زبانیں ترتیب پا کر تیسری زبان پیدا ہو گئی۔ انہوں اردو غزل کو جلال، قصیدے کو وجاہت اور مرثیے کو تنوع عطا کیا اور ہجو کی طرف آئے تو اظہار حقارت کو پاتال تک لے گئے۔ ان کے اثرات بیسویں صدی کے شعراء: یگانہؔ، فیضؔ، ظفر اقبالؔ اور اقبال ساجدؔ تک میں موجود ہیں اور قبلہ آزادؔ کے الفاظ میں:

''ان کی عظمت کے سامنے ہمیشہ ادب اور ممنونی سے سر جھکانا چاہیئے۔''

میر محمد تقی میرؔ (متوفی ۱۸۱۰ء)

میرؔ کے اسلاف ارضِ حجاز سے وار دِ ہندوستان ہوئے تھے۔ان کے پردادا نے اکبر آباد میں بود و باش اختیار کی اور یہیں میر تقی میرؔ پیدا ہوئے لیکن پرورش دلی میں پائی۔ان کے والد میر متقی درویش کامل تھے اور گریہ، استغراق، اور کیفِ مجذوبی میں گم رہتے تھے۔ان کے بچپن کے اتالیق میر امان اللہ تھے لیکن والد اور اتالیق دونوں زیادہ دیر تک نہ جیئے۔میرؔ کے سوتیلے بھائی نے جائیداد پر قبضہ کرلیا اور سوتیلے ماموں خان آرزوؔ کی بدسلوکی سے طبیعت جنونی ہوگئی۔رعائت خان، مہانرائن خواجہ سرا، راجہ جگل کشور اور راجہ ناگرمل وغیرہ امراء کی ملازمت اختیا کی۔آصف الدولہ کے بلاوے پر لکھنؤ گئے لیکن نازک طبعی نے سکھ کا سانس نہ لینے دیا۔اور لکھنؤ ہی میں انتقال کر گئے۔جس جگہ میرؔ کی قبر ہے وہاں اب ریلوے لائن بچھادی گئی ہے۔

میرؔ بے حد نازک طبع اور غیور تھے۔اپنی بے کسی اور پامالی پر گریاں رہتے تھے۔چنانچہ بد دماغ اور مردم بیزار مشہور ہوگئے۔اس دور کے انتشار اور بد نظمی نے میرؔ کو متاثر کیا اور ایک دائمی غم ان کے دل پر محیط ہوگیا۔میرؔ کی شاعری ان کے داخلی واردات اور اس پریشان حال دور کی سماجی صورت کا آئینہ ہے۔وہ زمانے کو بچشم نم دیکھا کئے اور دل کی زبان سے حالاتِ زمانہ رقم کرتے گئے۔

فارسی کا **ایک** اور اردو کے **چھے** دیوان مرتب کیے۔غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ، رباعی، مثلث، واسوخت، مسدس، مخمس غرض ہر صنف سخن میں شاعری کی اور اردو میں **خدائے سخن** تسلیم کیے گئے۔ان کی خود نوشت ''ذکر میرؔ'' اور تذکرہ ''نکات الشعراء'' اس عہد کی ادبی اور سماجی تاریخ کے ایسے آئینے ہیں جن سے تاثرات اور تنقید دونوں منعکس ہوتے ہیں۔

غزل میرؔ کا میدانِ کمال ہے۔اس صنف میں میرؔ نے ذاتی واردات سے کائناتی تجربے کیے اور انسانی کرب کو تخلیقی کرب کی صورت دی۔ان کی غزل میں دردمندی بھی ہے اور عجز و انکساری بھی۔چنانچہ یہ احساس اور جذبے کو برانگیختہ نہیں کرتی بلکہ گیلی لکڑی کی طرح سلگاتی اور دبے ہوئے بوجھل جذبات کا کتھارسس یا تقلیبِ ماہیت کر دیتی ہے۔میرؔ کی غزل نے انسانی تجربے کو ارتکازی صورت دی ہے اور اس میں ماضی اور حال کے علاوہ مستقبل کی آواز بھی مجسم ہوگئی ہے۔

؎ سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا مجھ کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے (میرؔ)

میرؔ سراپا آرزو تھے۔اس لیے ان ہاں محرومی اور زیاں کا احساس زیادہ ابھرا۔ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خیال میں میرؔ صوفی مزاج شاعر تھے۔ لیکن انہوں نے میر دردؔ کے انداز میں صوفیانہ شاعری نہیں کی اور نہ قطرے کو دریا میں جذب ہونے کی تلقین کی۔ان کا کرب تباہ شدہ کاشانے سے، دنیا کی بے ثباتی سے اور احباب کی بے مہری سے پیدا ہوا۔ان کا غم جب حدود کو عبور کرتا ہے تو مثبت نوعیت اختیا کر جاتا ہے۔میرؔ کی لمبی بحر کی غزلوں میں یہ غم اداس گیت بن جاتا ہے۔یہ گیت موم بتی کے آنسو کی طرح بہتا ہے اور دل کو گداز کر دیتا ہے اور یوں غم اور غنائیت آپس میں مل جاتے ہیں۔

؎ حرفِ شنو ساتھ اپنے نہیں ہے ورنہ درائے قافلہ ساں
راہ میں باتیں کس کس ڈھب کی کرتے ہیں ہم یاروں سے (میرؔ)

غزل کی طرح مثنوی کی تسلسل بیانی میں بھی میرؔ نے قدرت فن کا مظاہرہ کیا ہے۔عشقیہ، واقعاتی، مدحیہ اور ہجویہ موضوعات پر ان کی ۳۷ مثنویاں دریافت ہو چکی ہیں۔ان مثنویوں سے نہ صرف میرؔ کی ذات منکشف ہوتی ہے بلکہ حالات زمانہ پر میرؔ کا تاثر اور ردِ عمل بھی سامنے آجاتا ہے۔میرؔ کی غزل کے سامنے ان کی مثنوی کا چراغ ماند پڑ جاتا ہے اور میر حسنؔ سے بڑے مثنوی نگار نظر نہیں آتے۔میرؔ کے قصیدے کی خامی یہ ہے کہ ممدوح کے ذکر میں غزل کا محبوب مثالی شخصیت بن کر ان کا رستہ روک لیتا ہے اور قصیدہ غزل کی طرح سروِ چراغاں بن جاتا ہے۔ان کا دلِ دردمند قصیدے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا تھا اور جب مرثیہ لکھا تو خود میرؔ کو احساس تھا کہ:

؎ میں جو نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں
مجھ کو دماغِ وصفِ گل و یاسمن نہیں (میرؔ)

میرؔ کی زبان بے ساختہ اور نہ تراشیدہ ہے۔صداقت اور معصومیت اس کے داخلی عناصر ہیں۔انہوں نے عشق کے روایتی تصور کے برعکس محبت کا ذاتی تاثر شاعری میں پیش کیا اور اپنی روئیدادِ الم کو پوری کائنات کا نمائندہ بنا دیا۔میرؔ کی شاعری میں گہرا فلسفہ تلاش کرنا ممکن نہیں لیکن اس میں انسانی فطرت کے سچے اور دردانگیز مرقعے موجود ہیں۔

میرؔ فارسی کے نثر نگار بھی تھے۔ان کی کتاب ''**نکات الشعراء**'' تذکرہ بھی ہے اور تنقید بھی۔ان کی مثنوی ''**خواب وخیال**'' میں ان کی غزل کا کردار بالائی سطح پر ابھر آتا ہے۔اور ''ذکر میرؔ'' میں اپنی پہچان مکمل طور پر کراتا ہے۔سوداؔ، ناسخؔ اور ذوقؔ نے انہیں استاد تسلیم کیا۔مصحفیؔ خانوادۂ میرؔ کے شاعر شمار ہوئے۔غالبؔ نے میرؔ کے رنگ میں شعر کہنا باعث افتخار شمار کیا اور آزادی کے بعد جب غزل کی نشاۃ ثانیہ برپا ہوئی تو ناصرؔ کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ابن انشاء کے علاوہ متعدد دوسرے شاعروں نے رنگ میرؔ ہی سے تجدد کے زاویے پیدا کیے۔چنانچہ میرؔ سے پورا ایک عہد منسوب ہوا جس کی روشنی مستقبل کی طرف بھی سفر کر رہی ہے۔

میر آثر (وفات ۱۸۳۴ء کے لگ بھگ)

خواجہ سید محمدی میر آثر خواجہ میر دردؔ کے بھائی اور خلیفہ تھے۔ اردو اور فارسی میں دیوان مرتب کیے لیکن انہیں زیادہ شہرت مثنوی ''خواب وخیال'' سے حاصل ہوئی۔ یہ مثنوی اس لیے بھی پُر اثر ہے کہ اس میں میر آثر نے خود اپنی ناکام محبت کا قصہ بیان کیا اور اختلاط واصل کے واقعات میں والہانہ شان موجود ہے۔ غزل میں میر آثر سادگی اور پرکاری کی مثال ہیں لیکن ان پر خواجہ میر دردؔ کا طلسمِ معنی پیدا کرنے کا انداز غالب نظر آتا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں۔

ے ہم اسیروں کی اسے چاہیئے خاطر داری اور الٹی نہ کہ ہم خاطرِ صیاد کریں

ے احوال کھلا نہ انتہا کا معلوم ہوا نہ انتہا کا

ے آثر اب تک فریب کھاتا ہے تیرے وعدوں کو مان جاتا ہے (آثر)

سید میر حسنؔ (متوفی ۱۷۸۶ء)

میر حسنؔ میر انیسؒ کے دادا تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ عہد شاہ جہانی میں دلی آئے اور پھر یہیں آباد ہو گئے۔ ان کے والد میر ضاحکؔ، سوداؔ کے معاصر اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ میر حسنؔ جوانی کے ایام میں دلی کی ابتری سے اکتا کر اپنے والد کے ہمراہ اودھ چلے گئے اور آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آ گئے۔ ان کی شعری تربیت میں سوداؔ کا ہاتھ بھی تھا اور طبیعت نے خواجہ میر دردؔ اور میر تقی میرؔ کا رنگ بھی قبول کیا۔ انہوں نے ''سحر البیان'' لکھ کر آصف الدولہ کو پیش کی۔ صلہ فن میں صرف ایک دوشالہ ملا۔ شیر علی افسوس نے لکھا کہ:

''رتبہ تو اس کا اتنا بڑھا پر دل گھٹ گیا۔ اس لیے کہ مطلبِ دلی حاصل نہ ہوا۔ لیکن یہ کھوٹ صرف طالع کی ہے۔ کیوں کہ مال کھرا، خریدار اتنا بڑا اور سودا خاطر خواہ نہ ہوا۔ بلکہ گھاٹا آیا۔''

اس واقعے کے بعد میر حسنؔ بیمار پڑ گئے اور بالآخر انتقال کر گئے۔ بارہ (۱۲) مثنویاں، سات (۷) قصیدے ایک سو پنتالیس (۱۴۵) رباعیات اور کم وبیس پانچ سو (۵۰۰) غزلیں اور متعدد دوسری تخلیقات ان کی میراث ہیں۔ ان کی ایک اور تصنیف ''تذکرہ شعرائے اردو'' جس میں تین سو سے زائد شعراء کے حالات زندگی اور انتخاب کلام پیش کیا گیا ہے اور ان کے فن پر بےلاگ، معنی خیز تنقیدی رائے دی گئی ہے۔

میر حسنؔ نے دہلی کی معنی آفرینی، خیال آرائی اور داخلی دردمندی کو غزل کے مضامین میں کامیابی سے سمویا لیکن وہ میرؔ کے قریب نہ جا سکے اور سوداؔ سے پیچھے رہے۔ ان کی غزل میں درد کی کوک ان کے داخلی کرب کا پتا دیتی ہے۔

ے دیکھتے ہیں اسی کو اہل نظر گو نہاں وہ ہے اور عیاں ہیں ہم

ے مانندِ حباب اس جہاں میں کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم (میر حسنؔ)

میر حسن کا مزاج مدح آشنا نہیں تھا۔ اس لیے وہ قصیدے میں تجمل وشکوہ پیدا نہ کر سکے۔ رباعیات میں ان کی قادر الکلامی تسلیم کی گئی ہے لیکن ان کی شہرتِ دوام کا باعث مثنوی ''سحر البیان'' ہے۔ داستان کے واقعاتی بیانیہ، حقیقی زندگی کی تصویر کشی، لکھنوی تہذیب کی عکاسی اور سچے انسانی جذبات کی پیش کش نے اس مثنوی کو لافانی بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اسے عارضی غموں سے ہٹ کر لذت یابی کا وسیلہ قرار

دیا ہے۔مثنوی کے کرداروں کی سطح انسانی اور جذبات پر خلوص ہیں،سر پا نگاری سے تحسین جمال کا انوکھا زاویہ ابھرتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق یہ مثنوی مزاجاً گیت کی فضاء اور سراپا نگاری کی روش کا ایک نمونہ ہے۔چنانچہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ مثنوی کیفِ مسلسل کو جنم دیتی ہے۔

میرؔ وسوداؔ کے دور کی تخلیقات

اس دور میں مندرجہ ذیل اصناف سخن پر طبع آزمائی کی گئی:

غزل	شہرآشوب	مثنوی	ہجو (Hajve)	قصیدہ	بیاض وتذکرہ نویسی

مندرجہ بالا نکات کی وضاحت حسبِ ذیل ہے۔

شہرآشوب

میرؔ وسوداؔ کا زمانہ ایک پُرآشوب زمانہ تھا جس نے اردو شاعری پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔اس عہد میں جعفرعلی حسرتؔ، قائمؔ، سوداؔ اور میرتقی میرؔ نے شہرآشوب لکھے جن میں اس دور کی سیاسی وتہذیبی بربادی کا ذکر ہے۔عام مؤرخین سوداؔ کو یہ الزام دیتے ہیں کہ ان کے کلام میں اپنے عہد کی عکاسی نہیں پائی جاتی۔دراصل وہ مورخین ان کے قصائد کو دیکھ کر یہ بات کرتے ہیں۔حالآنکہ قصائد میں تو بادشاہ کی مدح سے مقصد ہوتا ہے۔سوداؔ کا اصل رنگ ان کی ہجویات اور شہرآشوب میں کھلتا۔

اس دور کے شہرآشوب کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

''اس صنف سخن میں سوداؔ سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔'' (تاریخ ادب اردو۔جلد دوم۔ص۔484)

مثنوی

اس عہد میں میرحسن نے بارہ مثنویاں لکھیں جن میں سے مثنوی **''سحرلبیان''** نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ان کے علاوہ میرتقی میرؔ نے بھی مثنویاں لکھیں۔عشقیہ، واقعاتی، مدحیہ اور ہجویہ موضوعات پر ان کی 37 مثنویاں دریافت ہوچکی ہیں۔

ہجو (Hajve)

اس دور میں سوداؔ کی **''تضحیک روزگار''** معرکے کی چیز ہے۔یہ ایک زندہ اور جاوید ہجو ہے۔میرؔ کی اٹھارہ (18) ہجویات ہیں۔قائمؔ کی **''درہجوشدت سرما''** دل چسپ ہے۔دیگر ہجو نگاروں میں: بقاءاللہ بقاءؔ، محمد امان نثارؔ، میرحسن، جعفرعلی حسرتؔ، فدوی لاہوری اور ندرت کاشمیری شامل ہیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ اکثر طلباء تلفظ کی غلطی کرتے ہیں۔ ہجو(Hajve) کو ہجو(Hijo) پڑھتے ہیں اور شکوہ الفاظ (Shikoh) کو شکوہ الفاظ (Shikwa) پڑھتے ہیں۔ان الفاظ کا تلفظ انگریزی میں اس لیے لکھ رہا ہوں تاکہ غلطی ختم ہوجائے۔

قصیدہ

اس دور میں قصیدہ نگاری پر بھی خوب طبع آزمائی کی گئی۔ سوداؔ کا نام اس ضمن میں سرفہرست ہے۔ میرؔ کے کلیات میں آٹھ قصائد ہیں۔ میرؔ غزل گو ہونے کی بنا پر قصیدہ نگاری میں نام نہ کما سکے۔ قائمؔ کے تیرہ قصیدے ہیں جن میں تصنع کا احساس نمایاں ہے۔ میر حسن نے سات قصائد لکھے۔ جعفر علی حسرتؔ اور احسان اللہ بیانؔ نے بھی قصیدے لکھے مگر سوداؔ کی منزل تک کوئی نہ پہنچ سکا۔

بیاض اور تذکرے

میرؔ و سوداؔ کے عہد میں بیاضوں پر بھی کام ہوا۔ شاعروں نے اپنے کلام کے مسودے ترتیب دیئے اور شاعری سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں نے اپنے پسندیدہ شعراء کے منتخب اشعار پر مشتمل بیاض تیار کیں۔ اس عہد میں تذکرہ نویسی کا رواج بھی عام ہوا۔

اس عہد میں مندرجہ ذیل تذکرے لکھے گئے۔

نمبر	تصنیف معہ مصنف	سن اشاعت		نمبر	تصنیف معہ مصنف	سن اشاعت
01	نکات الشعراء (میر تقی میرؔ)	1751ء		09	تذکرۃ الشعراء اردو (میر حسن)	1778ء
02	گلشنِ گفتار (خواجہ خان حمید اورنگ آبادی)	1752ء		10	تذکرہ مسرت افزا (امراللہ الہ آبادی)	1779ء
03	تذکرۂ ریختہ گویاں (گردیزی)	1752ء		11	تذکرہ گل عجائب (اسد علی خان)	1780ء
04	تحفۃ الشعراء (مرزا افضل بیگ خان)	1752ء		12	گلشن سخن (مردان علی مبتلا)	1780ء
05	مخزن نکات (قائمؔ چاند پوری)	1754ء		13	تذکرہ عشقی (عشقی عظیم آبادی)	1783ء
06	چمنستان شعراء (نرائن شفیق)	1761ء		14	تذکرہ گلزار ابراہیم (ابراہیم خان خلیل)	1784ء
07	طبقات الشعراء (قدرت اللہ شوقؔ)	1775ء		15	تذکرۂ ہندی گویاں (مصحفیؔ)	1794ء
08	یادگار ستان (شورش عظیم آبادی)	1777ء		16	طبقات سخن (غلام محی الدین)	1797ء

خلاصہ

شمالی ہندوستان میں شاعری کی صبح صادق سے جو روشنی پیدا ہوئی اس سے دور اور نزدیک کے ادب کو فائدہ پہنچا۔ بلا شبہ دلی میں ولؔی کے دیوان کی آمد سے پہلے یہاں اردو گوئی کا رواج موجود تھا لیکن اس قسم کی شاعری کو شدید احساس کمتری کا سامنا تھا۔ فارسی زبان کی شاعری امتیازی شان رکھتی تھی لیکن اس میں ہندی الفاظ کی آمیزش سے مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش بھی کی جاتی تھی۔ امیر خسرو، سعدی کاکوروی اور چندر بھان برہمن کی غزلیں اس کی مثالی صورتیں ہیں جن میں پورا یا آدھا مصرعہ ہندی زبان میں لکھا جاتا تھا۔ آنند رام مخلص نے بھی اسی رجحان کی پیروی کی اور ریختہ کو شیریں زبان بنانے کی کوشش کی۔

ولؔی کے دیوان نے ریختہ گوئی کو اثبات و یقین عطا کیا۔ لیکن ایہام گوئی کی تحریک نے اسے منفی رخ پر ڈال دیا اور شاہ حاتؔم، مرزا مظہؔر اور خان آرزؔو اگر اصلاح زبان اور اتازہ گوئی کی تحریک شروع نہ کرتے تو شاید اردو زبان کا ارتقاء مختلف ڈگر اختیا کر لیتا۔ اس دور میں اردو شاعری نے فارسی زبان و ادب سے تاب و توانائی حاصل کی لیکن مقامی مزاج اور شخصی انداز نے اسے فارسی شاعری میں کلیۃً مدغم نہیں ہونے دیا اور اس کا ایسا نقش ابھارا جس میں ہندی تہذیب ایرانی مزاج میں پیوست ہوتی نظر آتی ہے۔ اس دور میں خواجہ میر دؔرد، میرزا محمد رفیع سوؔدا اور میر تقی میؔر جیسے عہد ساز شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے شاعری کی صبح صادق کو عہد زریں کی صورت دے دی۔

دلی کا شہر اس وقت انتشار اور زوال کی زد میں آچکا تھا اور شعراء دوسرے اہل کمال کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہو رہے تھے جہاں تہذیب کی آخری شمع ایک مصنوعی اجالا پیدا کر رہی تھی۔ اس دور میں شاعری نے خارجی اثرات زیادہ قبول کیے مگر داخلی گہرائی سے کنارہ کشی اختیار کی اور ظاہری آرائشی انداز پیدا کرنے میں زیادہ توجہ دی جانے لگی۔

اہم نکات

01 میرؔ وسوداؔ کا زمانہ 1706ء سے 1810ء تک محیط ہے۔ یہ عہد مغلوں کا ہے جو اورنگ زیب عالم گیر سے شروع ہوتا ہے اور اکبر ثانی پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔

02 اس عہد کے نمایاں شعراء میر تقی میرؔ، میرزا محمد رفیع سوداؔ اور خواجہ میر دردؔ ہیں۔ ان کے علاوہ مرزا مظہر جان جاناںؔ، آبروؔ، مضمونؔ، حاتمؔ، یقینؔ، تاباںؔ، فغاںؔ، قائمؔ چاند پوری اور محمد میر سوزؔ شامل ہیں۔

03 اس دور میں سیاسی ابتری اور تہذیبی پامالی نمایاں ہے۔ جس کا اثر اردو شاعری پر نمایاں نظر آتا ہے۔

04 دردؔ کے ہاں تصوف کا رچاؤ ہے۔ میرؔ غم والم کا شاعر ہے اور غزل اس کا خاص میدان ہے۔ سوداؔ قصیدے میں اپنی مثال آپ ہیں۔

05 اس دور کے شعراء کا کلام فکری وفنی محاسن سے شاندار اسلوب وانداز بیان سے سجا ہوا ہے اور تخیل کی بلند پروازی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

06 اس دور میں شعراء نے مرثیے، مثنوی، غزل، قصیدہ، شہر آشوب، تذکرہ نویسی، رباعیات اور قطعات میں بھرپور طبع آزمائی کی۔

07 اس دور کی شاعری میں دنیا کی بے ثباتی، زندگی کی ناپائیداری، مجلسی زندگی کے خاتمے، غم وحزن، سوز وگداز اور تہذیبی وسماجی انتشار اور ابتری کا ذکر ملتا ہے

08 اس دور کے تمام شعراء کا کلام عشق اور محبوب کے تذکروں سے عبارت ہے۔

09 زبان کو سنوارنے کے لیے فارسی الفاظ وترکیبوں کو ہندی مصرعوں کی زینت بنایا گیا اور سوداؔ نے ہزل گوئی کا آغاز شروع کیا۔

10 اس عہد کو **''زریں عہد''** ، **''میرؔ وسوداؔ کا عہد''** اور **''شمالی ہند میں شاعری کی صبح صادق''** کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دبستانِ لکھنؤ: (Lucknow School Of Thought)

دلی کی شمعِ ادب خوابِ شکستہ پر چل رہی تھی۔اس کے مقابلے میں شجاع الدولہ کے عہد میں لکھنؤ ایک خوابِ شیریں کی صورت میں آراستہ ہوا تھا۔واجد علی شاہ کے عہد تک روح پرتو زنگ چڑھ گیا لیکن جسم آراستہ اور چشمِ تماشا بین بیدار ہوگئی۔لکھنؤ معاشی طور پر خوش حال، معاشرتی طور پر سکون پرور اور سیاسی طور پر خطۂ امن تھا۔ چنانچہ یہاں جس معاشرے کو فروغ حاصل ہوا اس میں بشاشت غیر فطری اور رجائیت مصنوعی تھی۔اس میں ظاہری نشاط اور کجر وانبساط کے عناصر زیادہ تھے۔امراء اور عوام حال کے لمحے میں زندہ رہ کر زندگی کا رس نچوڑنے میں مصروف تھے۔ چنانچہ لکھنؤ میں ایسا ادب پروان چڑھا جس میں تازہ اور جوان جسم کی دل کشی، رعنائی اور جنسی کشش کو اہمیت حاصل تھی۔شعراء زندگی کے مسائل اور حقائق کو نظر انداز کر کے لفظوں کو اس طرح آراستہ کرتے کہ کیف ونشاط کی بارش ہونے لگتی۔اس دبستان نے کعبہ و مے خانہ میں ادغام پیدا کرنے کی جسارت کی۔ظاہر پرستی کو فروغ دیا۔غزل کے ساتھ ساتھ مثنوی، قصیدہ، ہجو، ریختی، واسوخت ڈرامہ اور داستان کو فروغ حاصل ہوا۔شاہانِ اودھ کے مذہبی معتقدات کے مطابق مرثیہ کو عروج حاصل ہوا۔لفظ کے آرائشی کرینے اور زبان کے جمیل پیکر تراشے گئے عورتوں کے حسن اور متعلقاتِ حسن کی خوش نظر تصویریں مرتب ہوئیں۔زبان میں رعایتِ لفظی اور خوبیٔ بندش کو افتخارِ ایجاد نگاری ملا۔گرد وپیش میں پھیلی ہوئی دنیا پورے حسن و جمال کے ساتھ ادب وشعر میں جلوہ کر ہونے لگی لیکن اندر کی کائنات سے روشنی کا مآخذ بند ہوگیا اور ادب میں ابتذال راہ پا گیا۔شعر وادب کا یہ دوسرا رُخ تھا جس کے لیے لکھنؤیت کی اصطلاح وضع کی گئی اور اب تک اسی نام سے موسوم ہے۔(ڈاکٹر محمد انور سدیدؒ)

نوٹ:

سادہ لفظوں میں دبستانِ لکھنؤ سے مراد لکھنؤی شعراء کا طرز شاعری اور ان کے زمانے کے شعری رجحانات ہیں۔

دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شعراء:

امام بخش ناسخ

پنڈت دیا شنکر نسیم

امیر احمد مینائی

داغ دہلوی

خواجہ حیدر علی آتش، (آتش کو دونوں دبستانوں (دہلی ولکھنؤ) کا نمائندہ شاعر مانا جاتا ہے۔)

دبستانِ لکھنؤ کی شعری اور لسانی خدمات

تمہید

اٹھارہویں صدی میں جب مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا تو اس عظیم سلطنت کے بڑے بڑے صوبے خود مختار ہو گئے۔ ان صوبوں میں اہم ترین اودھ تھا۔ اودھ کی حکمرانی کا خواب سعادت خان برہان الملک اور ابوالمنصور صفدر جنگ نے دیکھا تھا لیکن اسے حقیقت کا روپ نواب شجاع الدولہ کے سیاسی ذہن نے دیا۔ ان کی وفات کے بعد آصف الدولہ (۹۷۔۱۷۷۵ء) اُودھ کے والی مقرر ہوئے۔ ان کے عہد میں دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوا اور اس شہر کو وہ عوج وعروج نصیب ہوا کہ اس کے سامنے دلی کی روشنیاں بھی ماند پڑ گئیں۔ آصف الدولہ لہو ولعب میں مشغول تھا لیکن اس نے اپنے خزانوں کا منہ کھول رکھا تھا۔ چنانچہ دلی کے انتشار، دُرّانیوں اور اَبدالیوں کے حملوں اور جاٹوں، روہیلوں اور مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں سے پریشان عوام وخواص لکھنؤ کی طرف کھنچے چلے آرہے تھے۔ **عبدالحلیم شرؔر** نے لکھا ہے کہ:

> **''شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریوں میں صرف کرتے تھے اسے آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی کے ذوق اور شہر کی آرائش وخوش حالی پر صرف کرنا شروع کر دیا اور چند ہی روز کے اندر ساری دھوم دھام اپنے یہاں جمع کر لی۔''**

اس زمانے میں جو شعراء دہلی سے لکھنؤ کو ہجرت کر گئے تھے ان میں خان آرزؔو، جعفر علی حسرتؔ، میر ضاحکؔ، قمرالدین منتؔ، اشرف علی فغاںؔ، میرزا سوداؔ، میر تقی میرؔ، میر سوزؔ، مصحفیؔ، انشاءؔ، جرأتؔ اور میر حسنؔ کے اسماء بے حد اہم ہیں۔ ان سب کو شاہانِ اودھ کی آزاد خیالی، فیاضی اور علم پرستی ہی دِلی سے کھینچ لائی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں جب لکھنؤ کو تہذیبی ثقافتی اور ادبی دبستان کی حیثیت حاصل ہو گئی تو دلی کے ٹوٹے ہوئے ستارے اس دبستان کے ماہتاب وآفتاب بن گئے اور ان کی کرنوں سے انیسویں صدی مطلع عالمتاب بن گئی۔ مشرق کی اس نئی تہذیبی شمع کو آصف الدولہ کے عہد میں روشنی ملنی شروع ہوئی، نواب سعادت علی خان (۱۸۱۴ء۔۱۷۹۸ء)۔ غازی الدین حیدر (۲۷۔۱۸۱۴ء)۔ نصیر الدین حیدر (۳۷۔۱۸۲۷ء)۔ محمد علی شاہ (۴۲۔۱۹۳۷ء)۔ امجد علی شاہ (۴۷۔۱۸۴۲ء) اور واجد علی شاہ ((۵۶۔۱۸۴۷ء) کے عہد تک یہ اجالا آہستہ آہستہ روبہ زوال ہوتا رہا اور واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ ۱۸۵۶ء میں اس وقت بجھ گیا جب اودھ کی حکومت کو مملکتِ برطانیہ کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔

لکھنؤ کی اُردُو شاعری کے ادوار

اگر لکھنؤ کو اردو شاعری کے حوالے سے دیکھا جائے تو لکھنؤ کی اردو شاعری کو مندرجہ ذیل پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور

جب دلی اجڑ گئی اور وہاں کے باشندوں نے لکھنؤ کا رخ کیا اور یہاں آباد ہونے لگے۔ انہوں نے لکھنؤ میں سابقہ شہر کی رسموں اور رواجوں کا قائم کرنے اور اپنی ثقافت کو رواج دینے کی کوشش کی۔ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں یہ عمل کافی تیزی سے ہونے لگا۔ میر تقی میرؔ بھی نواب آصف الدولہ کی سرکار میں آئے اور ایک قصیدہ پیش کیا جس کے صلے میں انہیں خلعت اور وظیفے سے نوازا گیا۔ اس دور میں لکھنؤ میں جو بھی لکھا گیا وہ دلی کے انداز تحریر کا چربہ تھا۔ البتہ یہاں آ کر شاعری نسبتاً کھلی فضاء میں سانس لینے لگی اور داخلیت کے بجائے خارجیت کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ 1765ء میں شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا دارالحکومت بنایا اور اس شہر کی تزئین پر لاکھوں روپے خرچ کیے گئے۔ نواب صاحب عورتوں کے رسیا تھے چنانچہ رنڈی بازی اور طوائفوں کے ڈیروں کا خاص اہتمام کیا گیا۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں: شجاع الدولہ نے فیض آباد کو جب مستقل طور پر اپنا دارالحکومت قرار دے دیا تو اس کی تعمیر و تزئین میں لاکھوں صرف کیے اور ہر امیر نے اپنی اپنی محل سرائیں اور باغات وہاں تعمیر کرائے۔ عیش و عشرت کا بازار گرم ہوا۔ رنڈیوں اور ڈیرہ دار طوائفوں کی آبادی کثیر ہوگئی۔ کیوں کہ نواب شجاع الدولہ بالطبع عورتوں کے بہت شائق تھے۔ (دلی کا دبستان شاعری: ص۔268)

دس سال بعد نواب شجاع الدولہ کے بیٹے نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت بنایا تو سب کچھ لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ آصف الدولہ بھی عیش و عشرت کا شوقین اور رنگین مزاج تھا۔ چنانچہ فنونِ لطیفہ کی خوب سرپرستی کی گئی۔ بھانڈ، نقالیے، طوائفیں، شعراء اور دیگر فنکاروں کے چرچے اڑ رہے تھے۔ کوٹھوں، طوائفوں اور کنجروں کا یہ تماشا واجد علی شاہ کے زمانے تک قائم رہا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں نئی نئی نزاکتیں اور جدتیں پیدا ہوتی چلی گئیں۔

دوسرا دور

لکھنؤ میں اردو شاعری کے دوسرے دور میں: مرزا حسرتؔ، مصحفیؔ، سلمان شکوہؔ اور قلندر بخش جرأتؔ کا نام آتا ہے۔ اس دور میں سعادت یار خان رنگینؔ اور انشاء اللہ انشاءؔ بھی شامل ہیں۔ اس زمانے میں شاعری میں گرم بازاری پیدا ہوگئی۔ اس میں دلی کی زبان کے اثرات موجود ہیں لیکن بتدریج کم ہوتے جاتے ہیں۔ زبان و بیان میں کہیں کہیں دلی سے انحراف کا اندازہ ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ دور دبستان لکھنؤ کی بنیاد رکھنے کا ہے اور یہ اس جانب پہلا قدم ہے۔ غزل میں معاملہ بندی اور دشوار زمینیں رواج پانے لگیں نسوانیت کا رنگ بھی غالب آنے لگا۔

تیسرا دور

لکھنؤ کی اردو شاعری کا تیسرا دور وہ ہے جب غازی الدین حیدر نے خود مختاری کا اعلان کر کے شاہ کا لقب اختیار کیا۔ خود مختاری کے اس اعلان کے سیاسی طور پر جو اثرات بھی ہوئے ہوں، غالباً دبستان لکھنؤ نے بھی اسی حوالے سے اپنی خود مختاری کو بغیر اعلان کیے اپنا لیا اور دہلی والوں سے کھلم کھلا انحراف کر کے انفرادیت جگہ پانے لگی۔

چوتھا دور

دبستان لکھنؤ کا چوتھا دور مرثیے کا دور ہے۔ محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ نے مذہب کی طرف رجوع کیا اور یوں شعر و شاعری میں بھی غزل کے بجائے مرثیہ فروغ پاتا گیا۔ چونکہ لکھنؤ والوں کے مزاج میں شان و شوکت اور دھوم دھڑ کا تھا، اس لیے مذہبی تقریبات میں بھی شان و شوکت کا رنگ دکھائی دینے لگا۔ انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے ہر جگہ گونجنے لگے۔ چونکہ بادشاہوں کا مذہب شیعہ مسلمان تھا اسی لیے اس زمانے میں مرثیہ گوئی کو بڑی شد و مد سے پیش کیا جانے لگا اور اگر ان کے مذہبی حالات دیکھے جائیں تو اس دور میں شیعی عقائد کو جتنی ہوا دی گئی اس کے برعکس شیعی اعمالِ کو اتنا ہی پامال کیا گیا۔ تصوف اور دین داری کے برعکس لکھنؤ میں عیش و عشرت کی فضاء قائم تھی اور فارغ وقت گزارنے کا طریقہ شعر و شاعری اور لہو لعب تھا۔ زندگی کا نشاطیہ پہلو لکھنؤ والوں کے ہاں بہت ہے۔ ایسے عالم میں مثنوی ''زہر عشق'' لکھی گئی۔ شوقؔ، قلقؔ اور واجد علی شاہ نے بھی مثنویاں لکھیں۔ امانت لکھنوی نے ''**اندر سبھا**'' جیسی شان دار مثنوی لکھی۔ آتشؔ اور جرأتؔ نے ''واسوخت'' جیسی صنف سخن پر توجہ دی۔

پانچواں دور

دبستان لکھنؤ کا پانچواں دور وہ ہے جب اودھ کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور کمپنی نے اس پر قبضہ کر لیا سلطنت کے خاتمے کے بعد بھی ادبی اور شعری کام جاری رہے مگر بہت سے شعراء ایسے بھی تھے جنہیں نہ ہی دربار میسر تھے اور نہ ہی اپنے کھانے پینے کا کوئی سامان نظر آتا تھا۔ انہوں نے فرخ آباد، روم پور، مرشد آباد، عظیم آباد، اور دیگر شہروں کا رخ کیا۔

اس دور کے لکھنؤ میں اردو ادب کے نئے مزاج کو فروغ ملا۔ مرثیہ، مثنوی اور ریختی کے جداگانہ زاویے پروان چڑھے، ڈرامے کی صنف کی باقاعدہ ابتداء ہوئی اور شاعری جو دلی میں فروغِ فکر و خیال کا وسیلہ تھی لکھنؤ میں نزاکتِ اظہار اور مشاقیِ طبع کا نمونہ بن گئی اور شاہانِ اودھ کی سخن پروری سے لکھنؤ ایک دبستان کی حیثیت اختیار کر گیا۔ چند شعراء کے احوال مختصراً پیش کیے جا رہے ہیں تا کہ طالب علموں کو نفسِ مضمون پر پوری گرفت حاصل ہو سکے۔

شیخ (یحییٰ امان) قلندر بخش جرأتؔ (متوفی ۱۸۱۰ء)

جرأتؔ دہلی کے باشندے تھے لیکن انہوں نے پرورش فیض آباد میں پائی۔ شاعری کے علاوہ علمِ نجوم، ستار نوازی اور موسیقی میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ شاعری میں جعفر علی حسرتؔ سے تلمذ اختیار کیا۔ آزادؔ نے لکھا ہے کہ

''وہ اصلی اندھے نہیں تھے۔ بعض ضرورتوں سے کہ شوخیِ عمر کا مقتضیٰ ہے۔ خود اندھے بنے۔ رفتہ رفتہ اندھے ہی ہو گئے۔''

جرأتؔ خوش مزاج اور لطیفہ گو تھے۔ مسخرا پن ان کے مزاج میں شامل تھا، نواب محبت خان اور پھر مرزا سلمان شکوہؔ کی مصاحبت اختیار کی مصحفیؔ اور انشاءؔ ان کے معاصرین تھے۔ آخری عمر تک لکھنؤ میں رہے اور وہیں وفات پائی۔

جرأتؔ آزاد منش لوگوں کے دوست تھے۔ لکھنوی تہذیب کا تکلف، تصنع اور آوردان کی شاعری سے بھی عیاں ہے۔ اس سے چشمِ تماشا تو متاثر ہوئی ہے لیکن دل دھڑکنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ شیفتہؔ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ

''ان کے بعض اشعار بہت دل آویز اور دل فریب ہیں۔''

ان کی خوش مزاجی ظاہر نہاد ہے اور زیرِ سطح مایوسی اور دردمندی موجود ہے۔ ان کے اندھے پن نے لامسہ کی قوت کو تیز کیا اور معاملہ بندی کے اشعار میں لذت کوشی کے عناصر پیدا کیے۔ چنانچہ بعض تذکرہ نگاروں نے انہیں چوما چاٹی کرنے والا شاعر بھی قرار دیا ہے۔ چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

؎ مل گئے تھے ایک بار اس کے جو میرے لب سے لب — عمر بھر ہونٹوں پہ اپنے میں زباں پھیرا کیا

؎ ہم اس طرح رہے یاران رفتگاں سے دور — غریب جوں کوئی رہ جائے کارواں سے دور

؎ شمع ساں کس نے مجھے پھولتے پھلتے دیکھا — ہوں میں وہ نخل کہ دیکھا بھی تو جلتے دیکھا (جرأتؔ)

جرأتؔ نے غزل میں مرد کے بجائے عورت کو محبوب بنایا اور ہوس کو صحت مند جنسی جذبے کی صورت عطا کر دی۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ (متوفی ۱۸۲۴ء)

اس دور کے بہت پُر گو اور زود کلام شاعر تھے۔ شیفتہؔ نے لکھا ہے کہ

''ان کی ابتداء عہدِ سوداؔ کی انتہا تھی اور ان کے چنیدہ اشعار مرتبے میں اعلیٰ اور ارفع ہیں۔''

مصحفیؔ امروہہ کے رہنے والے تھے لیکن تعلیم دلی میں حاصل کی تھی بعد میں لکھنؤ آ گئے اور مرزا سلمان شکوہؔ کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ انہوں نے لکھنؤ میں بڑی ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔ انشاءؔ سے معرکہ آرائی میں غیر ادبی حربوں، طنز، تضحیک، اور ہجو کے وار برداشت کیے۔ چنانچہ دورِ آخر میں اندر سے ٹوٹ گئے اور بڑی حد تک گوشہ نشین ہو گئے۔ مولانا آزادؔ کے مطابق مصحفیؔ آخری اوقات میں غزلیں فروخت کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ شاگرد اچھی غزلیں چھانٹ کر مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھتے۔ تلچھٹ مصحفیؔ کے لیے چھوڑ جاتے۔ مصحفیؔ کے آٹھ دیوان دستیاب ہیں جن میں ہزاروں غزلیں، قصیدے، ابیات رباعیات اور نظمیں شامل ہیں۔ مصحفیؔ کی غزلوں پر پژمردگی اور

افسردگی چھائی ہوئی ہے۔مشکل ردیف اور قوافی سے نبرد آزمائی میں انہیں کمال حاصل تھا لیکن اس قسم کی ورزشی غزلوں میں مصحفی نے انشاء کے بجائے اپنے آپ کو مجروح کیا۔اس مشکل گوئی کی مثال یہ اشعار دیکھئے۔

؎ مچھلی نہیں ساعد میں بلکہ نہاں ہے وہ ہاتھ میں ماہی سقنقور کی گردن

؎ زہرہ کی جو آئی کفِ ہاروت میں انگلی کی رشک نے جا دیدہ ماروت میں انگلی (مصحفی)

دوسری طرف افسردگی چھٹ جاتی ہے تو مصحفی کے ہاں نشاطیہ کیفیت بھی ابھرتی ہے اور لذت انگیز اشعار بھی تخلیق ہوتے ہیں لیکن بہت جلد تنگ مزاجی ان پر غالب آجاتی ہے۔

؎ جورِ فلک سے ہم نہ کبھی سر اٹھا سکے جوں شمع ، زیرِ تیغ یہاں عمر کٹ گئی (مصحفی)

مصحفی کی مثنویاں ان کی اپنی پریشان حالی کے مرقعے اور معاشرتی ابتری کے صحیفے ہیں۔ان کے سلسلۂ تلمذ میں میر ضمیر، آتش، رنگین، پروانہ اور میر خلیق جیسے شعراء شامل ہیں۔ان کی فارسی نثر کی کتاب ''**مجمع الفوائد**'' میں علم حکمت کے مضامین کے علاوہ ذاتی حالات اور اعترافات بھی دستیاب ہیں۔''**تذکرہ ہندی گویاں**'' (**ریاض الفصحا**) اور ''**تذکرہ فارسی گویاں**'' (**عقد ثریا**) میں شعراء کے حالات زندگی کے علاوہ مصحفی نے شعراء پر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار بھی کیا ہے اور یہ اس دور کی شاعری کے اہم مآخذات ہیں۔

انشاءاللہ خان انشاء (متوفی ۱۸۱۸ء)

انشاءاللہ خان انشاء اگرچہ دبستان دہلی کے ممتاز شاعر تھے لیکن انہیں شہرت دبستان لکھنؤ سے وابستہ ہو کر ملی۔انشاء بے حد زیرک طباع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ان کے والد میر ماشاءاللہ، نواب شجاع الدولہ کے ملازم تھے۔نواب کی وفات کے بعد والد ان کو ساتھ لے کر دہلی آ گئے۔انشاء نے اس زمانے میں دلی کے اہل کمال کی مجالسِ رنگین میں شرکت کی۔مرزا عظیم بیگ سے معرکہ آرائی اسی دور کا واقعہ ہے۔شاہ عالم کے عہد میں دلی کا شیرازہ بکھرا تو انشاء بھی لکھنؤ چلے آئے۔پہلے سلمان شکوہ کی ملازمت اور پھر نواب سعادت علی خان کی مصاحبت اختیار کی، انشاء نے خوش حالی اور مقبولیت کا دورِ زریں دیکھا تھا لیکن بعد میں درباری سازشوں کا شکار ہو گئے۔ان کی آخری زندگی ادباء میں گزری۔غازی الدین حیدر کے عہد میں دوبارہ دربار میں باریابی ہو گئی لیکن جلد ہی پیغامِ اجل آ گیا اور وہ ۱۸۱۸ء میں فوت ہو گئے۔انشاء کے اوصاف کمال متنوع اور گوناگوں تھے لیکن مصاحبت ان کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوئی، ان کے مزاج میں مسخرہ پن فحاشی اور ابتذال ابھر آیا۔مصحفی سے معرکہ آرائی میں اخلاق کے سب ضابطے توڑ دیے۔چنانچہ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ

''**انشاء کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت یار خان کی مصاحبت نے ڈبویا**۔''

انشاء کی ادبی شخصیت میں مرشد آباد، دلی اور لکھنؤ کے اثرات موجود ہیں۔تغزل میں حزن و یاس کی آمیزش، دہلی کا اثر ہے اور مشکل الفاظ کو مصنوعی طریقے سے شعر کی لڑی میں پرونے کا انداز لکھنؤ کی عطا ہے۔حکیم غلام مصطفٰے خان شیفتہ نے لکھا ہے کہ

''**ان کی شوخی طبع اور جودتِ ذہن میں کلام نہیں**۔''

ان کے کلیات میں اردو غزلوں کے دیوان، مثنوی، قصائد، فارسی غزلیں، دیوان بے نقط، ریختی، رباعیات، مستزاد، مرغ نامے،

ہجویات اور بہت کچھ شامل ہے۔وہ اردو ہی میں نہیں فارسی، عربی، ترکی اور پنجابی میں بھی رواں تھے۔
نمونۂ کلام کے طور پر ان کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

؎ نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

؎ اس سے خلوت میں ٹھہر جاتی تو میں اللہ سے واسطے دو دن کے عرشِ کبریائی مانگتا

؎ لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا جگر کی آگ بجھے جلد جس سے ، وہ شے لا (انشاؔء)

ڈاکٹر سدیدؔ کہتے ہیں کہ آزادؔ نے آب حیات میں لکھا ہے کہ مندرجہ بالا مطلع کی پانچ اشعار پر مشتمل ایک غزل جب انشاؔء نے ایک مشاعرے میں پڑھی تو قلندر بخش جرأتؔ اور غلام علی ہمدانی مصحفیؔ مشاعرے میں موجود تھے مگر سب نے غزلیں ہاتھ سے رکھ دیں کہ اب پڑھنا بے حاصل ہے۔

؎ جنوں یہ آپ کی دولت ، ہوا نصیب مجھے کہ ننگ و نام کو چھوڑا ، یہ نام میں نے کیا

؎ دل لگایا ہے کہیں انشاؔء نے شاید دوستو! ان دنوں آتا نظر ہے سخت گھبرایا ہوا (انشاؔء)

انشاؔء کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے غزل کے ایرانی مزاج کو ہندی مزاج سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

؎ یوں تن وہ نمایاں ہے پیراہنِ آبی میں جوں دھوپ کواڑوں سے آئینہ کے چھن نکلے

؎ جو گھڑی یاد میں تری کٹ جائے وہی آٹھوں پہر کی پونجی ہے

؎ بات میری جو نہیں سنتے اکیلے مل کر ایسی ہی ڈھب سے سناؤ کہ سنو اور سنو (انشاؔء)

تاہم جہاں انشاؔء نے پینترا بازی کی اور فنی کرتب دکھائے ہیں وہاں ان کی شاعری بے روح ہوگئی ہے۔

؎ توڑوں گا خمِ بادۂ انگور کی گردن رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے لنگور کی گردن (انشاؔء)

انشاؔء کے قصیدے ان کی زودِ طبیعت، شکوہِ الفاظ اور تجملِ اظہار کا نمونہ ہیں۔آزادؔ نے لکھا ہے کہ

''چلتے چلتے ایک ایسی چال چلتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔''

اس بدلی ہوئی چال کی مضحک اور مبتذل صورت انشاؔء کی ہجویات میں سامنے آتی ہے اور منہ کڑوا کر دیتی ہے۔

شیخ امام بخش ناسخؔ (متوفی ۳۹۔۱۸۳۸ء)

بقول ڈاکٹر انور سدیدؒ

''اردو میں ناسخؔ کی حیثیت ایک مجتہد کی ہے۔'' (اردو ادب کی تاریخ:ص۔۱۸۲عزیز بک ڈپو)

ناسخؔ دبستان لکھنؤ کے مزاج ساز شاعر اور مصلح زبان تھے۔انہوں نے اردو کی تہذیبی حیثیت کی بقاء کے لیے سنسکرت الفاظ کے اخراج

کی تحریک چلائی اور اسے اپنے شاگردوں کے ذریعے مقبول بنایا۔ ان کے والد خدا بخش خیمہ دوز لاہور کے رہنے والے تھے۔ ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے مزاج میں لاہور کی تماشہ پسندی اور لکھنؤ کی نفاست دونوں کے اثرات موجود تھے۔ ورزش اور کسرت کے عادی تھے اور داؤ پیچ کا فن جانتے تھے۔ چنانچہ مختلف رؤسا کے توسل میں آئے اور ریشہ دوانیوں کا شکار بھی ہوئے۔ ان کی کلیات میں تین دیوان شامل ہیں۔ غالبؔ نے لکھا کہ

''یہ یک فنے تھے۔ صرف غزل کہتے تھے۔''

محمد حسین آزادؔ نے ترجمہ حدیث پر مبنی ان کی ایک مثنوی **''سراج''** کی نشاندہی بھی کی ہے۔

ناسخ نے اردو غزل کو شعوری طور پر لکھنؤی تہذیب کا مرقع بنانے کی سعی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی غزل سطحیت کا شکار ہوئی اور یہ آرائش، تصنع اور آورد کا مرکب بن گئی۔ ان کی آنکھ نے متعلقاتِ حسن پر زیادہ توجہ مرکوز کی تو دل کی کھڑکی بند ہوگئی۔ انہوں نے لفظ کی تراش خراش ماہر جوہری کی طرح کی لیکن اس کی تابانی داخلی آب سے محروم تھی۔ مولانا آزادؔ کے الفاظ میں:

''ناسخ کی غزلوں میں شوکتِ الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی ہے اور تاثیر کم ہے۔''

چنانچہ ان کی غزل قواعد وضوابط کی پابندیوں میں کراہتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور تخلیقی چشمہ جولانی میں کم کم آتا ہے۔ چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

؎ آغازِ شب میں اژدرِ فرعون ہے جو زُلف — افسونِ خطِ مار ہی افسانہ ہو گیا

؎ قمر ہی کیا ترے آگے محاق میں آیا — کہ آفتاب بھی تو احتراق میں آیا

؎ اک دم میں غرقِ بحرِ فنا ہو گیا جہاں — طوفاں اٹھا جو خنجرِ قاتل کی آب کا (ناسخ)

ناسخ کی لسانی خدمت ہے کہ انہوں نے اردو کی صرف ونحو درست کی، روزمرہ اور محاورات کی چھان پھٹک کی، تذکیر وتانیث کے اصول تراشے، عروض، قوافی اور اوزن کی صحت پر زور دیا اور یوں اردو زبان کو نکھارنے اور سنوارنے کی سعی کی۔ فحش الفاظ کے استعمال پر ناسخ نے جو پابندی عائد کی تھی اس سے شعراء کو غزل میں دوسرے موضوعات پر طبع آزمائی کی راہ مل گئی اور غزل کو وسعت حاصل ہوئی، تصنع اور آورد کے باوجود اردو ادب میں ناسخ کی حیثیت ایک مجتہد کی ہے اور انہوں نے اردو زبان کی تطہیر کے سلسلے میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔

؎ تمام عمر یونہی ہو گئی بسر اپنی — شبِ فراق کٹی روزِ انتظار آیا

؎ عاشق نہیں ہے کون دُرِ گوشِ یار کا — عالم ہے غرق ایک ہی موتی کی آب میں (ناسخ)

خواجہ حیدر علی آتشؔ (متوفی ۱۸۴۶ء)

آپ مصحفیؔ کے سلسلے کے مرصع نگار شاعر اور دبستان لکھنؤ کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کے بزرگ مغلوں کے دورِ عروج میں بغداد سے نقل مکانی کر کے دلی آئے تھے۔ ان کے والد خواجہ علی بخش نے شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں رہائش اختیار کی تھی۔ آتشؔ یہیں پیدا ہوئے۔ جوانی میں شوریدہ سر اور آزاد منش تھے، رئیس لکھنؤ مرزا محمد تقی خان ان کے مربی تھے۔ آخری عمر میں درویشی اور مسکین

نہادی ابھر آئی۔انہوں نے مصاحبت ترک کر دی اور گھر کو فقیر کا تکیہ بنا دیا۔اسی عالم قناعت میں ہنگامہ آزادی سے گیارہ برس قبل وفات پا گئے۔آتش کے دو دیوان ان کی تصحیح سے ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔لیکن کلیات بعد از وفات چھپی۔

آتش کی شاعری لکھنوی مزاج کی آئینہ دار ہے۔اس میں جو اثر اور درد ہے وہ ان کی قناعت پسندی اور درویش مزاجی سے پیدا ہوا ہے۔آزاد نے لکھا ہے کہ

''آتش سیدھی سی بات کو پیچ نہیں دیتے۔''

ڈاکٹر محمد صادق کی رائے میں

''وہ حسن کا پورا ادراک رکھتے ہیں۔''

وزیر آغا کے خیال میں

''آتش کے ہاں خارجیت کا رجحان ایک داخلی تحرک کا باعث تھا۔''

لکھنؤ کے تہذیبی زاویے سے دیکھئے تو وہ بیدار حواسِ خمسہ کے شاعر نظر آتے ہیں۔ان کی افتادِ طبع میں بانکپن اور نشاط کے عناصر اور زندگی سے نبرد آزمائی کی قوت ہے۔لیکن ان کے ہاں دہلوی انداز کی رومانی دردمندی کے آثار بھی موجود ہیں۔ان کا تجربہ بالعموم بیضوی صورت یوں اختیار کرتا ہے کہ اشعار بے ساختہ ضرب المثل میں ڈھل جاتے ہیں۔

؎ بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

؎ منزلِ ہستی میں دشمن کو بھی اپنا دوست کر رات ہو جائے تو دکھلائیں تجھے راہزن چراغ

؎ بدن سا شہر نہیں ، دل سا بادشاہ نہیں حواسِ خمسہ سے بہتر کوئی سپاہ نہیں (آتش)

آتش اگرچہ دہلوی اور لکھنوی مزاج کے امتزاج کے آئینہ دار تھے لیکن ان کا لہجہ اپنی انفرادیت رکھتا ہے اور ان کی غزل دوسرے لکھنوی شعراء سے مختلف نظر آتی ہے۔خلیل الرحمٰن اعظمی کے بقول

''آتش نے ہمارے ان حواس کی تسکین کا سامان فراہم کیا جو
ابھی تشنہ تھے اور جن کی تشنگی ہم سے قوتِ حیات چھین رہی تھی۔'' (مقدمہ دیوان آتش)

خلاصہ

01 اٹھارہویں صدی میں دلی کے اجڑنے کے بعد شعراء لکھنؤ کی طرف چلے گئے جہاں خوش حالی اور آسودگی تھی۔ آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ دارالحکومت بنا تو اس کی عیش پرستی کے باعث شہر لکھنؤ بھی لہولعب کی آماج گاہ بن گیا۔

02 لکھنؤ کی رنگینیوں، بزم آرائیوں اور زن و مرد کے عاشقانہ اختلاط نے اردو شاعری میں بھی لفظی تصنع اور تکلف پیدا کر دیا۔ لکھنؤ کے نامور شعراء میں میرؔ، ناسخؔ، جرأتؔ، انشاءؔ، مصحفیؔ، سوداؔ اور آتشؔ شامل ہیں۔

03 آتشؔ و ناسخؔ کے دور میں اردو شاعری مرصع کاری کا نمونہ بن گئی۔ زبان و سخن کی صفائی کے لیے نت نئے نظریے اور اصول وضع ہوئے، اصلاح زبان کی ایک تحریک دکھائی دی۔

04 اس دور میں ''لکھنؤیت'' ایک علیحدہ شاعری کے سکول آف تھاٹ کی حیثیت سے ابھری۔ دہلویت جذبات کی سادہ الفاظ میں ترجمانی کرتی ہے۔ جبکہ لکھنؤیت میں جذبات نگاری کا کام رعایت لفظی کو مقدم رکھ کر کیا گیا ہے۔

05 ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک آتشؔ لکھنؤی دبستان کے شاعر ہیں اور لکھنؤیت کے نمائندہ ہیں جبکہ ناسخؔ لکھنؤیت کے نمائندہ ہرگز نہیں تھے۔

06 آتشؔ کا کلام بہت سی خوبیوں کا بیک وقت حسین امتزاج ہے۔ وہ بندش الفاظ کو نگینے جڑنے کے مترادف قرار دیتے ہیں اور انہوں نے عملاً بھی ایسا ہی کیا۔

؎ بندشِ الفاظ جڑنے کے نگوں سے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصع ساز کا (نواب آتشؔ)

بحوالہ غزل

دبستانِ دہلی ولکھنؤ کے شعری رجحانات کا تقابلی جائزہ

دبستانِ لکھنؤ

دبستانِ لکھنؤ کے شعری رجحانات

1	طوالت	7	ابتدال	13	خوبیٔ بندش
2	سراپا نگاری	8	قافیہ پیمائی	14	مسرت ونشاط
3	خارجیت	9	مضمون بندی	15	عربی وفارسی کا بے دریغ استعمال
4	رعایتِ لفظی	10	تمثیل نگاری	16	ہندی الفاظ کو متروک قرار دینا
5	عریانی وبے ہودگی	11	غرابت	17	مرثیہ نگاری
6	ریختی	12	مبالغہ آرائی		-----

آیئے اب ان نکات کی توضیح کی طرف چلتے ہیں۔

طوالت

دبستانِ لکھنؤ میں غزل کی اکثر بحریں لمبی لمبی ہیں۔اشعار کی تعداد بھی زیادہ ہے۔دوغزلے تو درکنار اکثر شعراء نے سہ غزلے اور چہارغزلے بھی کہے ہیں۔

؎ رنگ پاں سے سبز سونا بن گئے کندن سے گال
مبتذل تشبیہ سے سونا یہ مینا ہو گیا (آتش)

سراپا نگاری

لکھنوی شاعری میں محبوب کی سراپا نگاری کی گئی ہے یعنی اس کے ہر ایک خدوخال کی تعریف الگ الگ پیرائے میں کی گئی ہے۔سرتاپا محبوب کے حسن کا جلوہ شاعری میں نمایاں کیا جاتا رہا ہے۔مثلاً جیسے غلام ہمدانی مصحفی کہتے ہیں۔

؎ تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو
مکھڑے کو چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

؎ یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا

دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو (مصحفی) بحوالہ آبِ حیات

اس شعر میں محبوب کے ہاتھ کی مہندی، پردے سے منہ چھپانے کی ادا، محبوب کے فسوں ساز لب اور اس کی زلف کی تعریف کا ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا آزاد نے ''آبِ حیات'' میں لکھا ہے کہ ایک مشاعرے میں جب مصحفی نے یہ ''لعل فسوں ساز'' والا شعر پڑھا تو میر نے ان کو داد دی اور یہی شعر دوبارہ پڑھنے کو کہا اور مصحفی کی حالت یہ تھی کہ انہوں نے اس شعر کو بار بار پڑھا اور میر سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں اپنے دیوان میں لکھوں گا کہ میر صاحب نے مجھے یہ شعر مقرر پڑھنے کی فرمائش کی تھی۔

خارجیت

خارجیت، داخلیت کی ضد ہے۔ جیسے داخلیت دل کی کیفیات کے بیان کو کہتے ہیں اس کے برعکس خارجیت باہر کی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ بجائے اندر کی بات کرنے کے لکھنو والے خارجی رجحانات کو پیش نظر رکھتے تھے۔ مثلاً:

؎ توڑوں گا خمِ بادۂ انگور کی گردن رکھ دوں گا ں وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

؎ خود دار کی بن شکل الفہائے اناالحق نت چاہتے ہیں اک نئی منصور کی گردن (انشاء)

رعایتِ لفظی

لکھنؤ کے شعراء کا خاصہ رہا ہے کہ انہوں نے شاعری میں رعایتِ لفظی کا استعمال کیا ہے۔ کہیں پر مذکر کو مؤنث لکھ دیا ہے تو کہیں مؤنث کو مذکر لکھ دیا ہے اور بہت ساری جگہوں پر قواعد کا خیال نہ رکھتے ہوئے رائج الوقت الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ جیسے:

؎ عہدِ طفلی میں بھی تھا میں بسکہ سودائی مزاج بیڑیاں مَنّت کی بھی پہنیں تو میں نے بھاریاں

؎ اے خط اس کے گورے گالوں پر یہ تو نے کیا کیا چاندنی راتیں یکا یک ہوگئیں اندھیاریاں ()

مندرجہ بالا شعار میں ''بھاریاں'' اور ''اندھیاریاں'' رعایتِ لفظی کی مثال ہیں۔

؎ بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے (آتش)

اب اس شعر میں ''خوش'' کی جگہ پر لفظ ''خوشی'' استعمال کیا گیا ہے۔

؎ آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے
دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لیے (آتش)

عریانی و بے ہودگی

لکھنؤ والوں کی زبان، عریان تھی اور خیالات میں بہت زیادہ بے ہودگی پائی جاتی تھی۔ اپنا شعری دبدبہ دکھانے کے لیے کچھ بھی کہہ جاتے تھے۔ مثلاً:

؎ دی شبِ وصل مؤذن نے اذاں پچھلی رات
ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا (داغؔ دہلوی)

یہ تو داغؔ تھے ناسخؔ جیسا عالی طبع شاعر بھی زاہدوں پر اس طرح چوٹ کرتا ہے۔

؎ زاہد اب کی رمضان میں میں پڑھوں خاک نماز
سوئے قبلہ تو خنازیر کھڑے رہتے ہیں (ناسخؔ)

ریختی

لکھنؤ میں ریختی کا آغاز ہوا۔ عورتوں کی زبان اور عورتوں کے لب و لہجے میں بات کرنے کو ریختی کہتے ہیں۔ لکھنؤ کے شعراء نے نہ صرف عورتوں کی زبان اور لب ولہجہ اختیار کیا بلکہ انشاء اللہ خان انشاؔ اور کئی دوسرے کئی شعراء نے تو مشاعروں میں داڑھی مونچھ صَفا کر کے عورتوں کا لباس پہن لیا اور عورتوں کی ناچ ناچ کر شعر کہے۔ یہ طوفانِ بدتمیزی واجد علی شاہ کے زمانے تک برابر چلتا رہا۔

ابتدال

دبستان لکھنؤ میں چونکہ لمبی لمبی بحروں والی غزلیں ہوتی تھی اور ان غزلوں کے اشعار بھی بہت زیادہ ہوتے تھے اسی وجہ سے تسلسل ٹوٹ جاتا تھا اور اشعار میں ابتدال پیدا ہو جاتا تھا۔

قافیہ پیمائی

اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ میں اچھی شاعری بھی ہوئی ہے مگر اس دور کی شاعری کو دیکھیں تو اکثر شعراء قافیہ پیمائی میں مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے سے مشاعروں میں سبقت لے جانے کے لیے تُک بازی پر شعراء کی توجہ زیادہ تھی۔

مضمون بندی

اس زمانے کی غزل میں مضمون بندی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اچھے اور برے دونوں قسم کے مضامین کو شعراء نے اپنی غزلوں کی زینت بنایا ہے۔

تمثیل نگاری

اس زمانے کی غزلوں میں امیجری اس طرح کی گئی ہے کہ گویا اس زمانے کے شاعر شاعر نہیں مصور تھے۔ لکھنؤ کی شاعری میں جیتے جاگتے کردار اور چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں۔

غرابت

غرابت کا مطلب ہوتا ہے انوکھا پن: یعنی تحریر میں نامانوس الفاظ کا استعمال کرنا۔ لکھنؤ والوں کے یہاں چونکہ درباروں، محفلوں اور

گھروں میں روزانہ کی بنیادوں پر مشاعرے ہوتے تھے اسی لیے یہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں نامانوس اور مشکل مشکل الفاظ تلاش کر کے لاتے تھے جن کی وجہ سے ان کی شاعری غرابت کا شکار ہوگئی۔ مثلاً:

؎ تنگ اس وحشت کدے میں ہوں مَیں اے جوشِ جنوں
عرش کی سقفِ محدب کو لتاڑا چاہئے (ناسخ)

سقفِ مُحدَب: ابھری ہوئی چھت

مبالغہ آرائی

شعر میں حد سے بڑھ کر کسی کی تعریف کرنا یا ایسی تعریف کرنا جو قدرے ناممکن ہو، مبالغہ آرائی کہلاتی ہے۔ لکھنؤی شاعری میں مبالغہ آرائی زیادہ پائی جاتی ہے۔

؎ امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا (آتش)

خوبیٔ بندش

دبستانِ لکھنو میں الفاظ کی بندش کمال کی ہے۔ شعراء لفظوں سے یوں کھیلتے تھے جیسے بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔

؎ مر گیا ہوں حسرت نظارہ ابرو میں میں
عین کعبے میں مرے لاشہ کو گاڑا چاہیے (ناسخ)

؎ بندشِ الفاظ جڑنے کے نگوں سے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا (آتش)

مسرت ونشاط

دلی چونکہ اجڑ چکی تھی اور شعراء نے بھی دلی کے اجڑنے کا غم اپنے دلوں پر نقش کر لیا تھا اسی وجہ سے ان کی شاعری میں غم واندوہ پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ چونکہ شادمانیوں اور رنگینیوں کی آماج گاہ تھی اسی لیے لکھنؤ کے شعراء بھی خوش دل کہکہے لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

؎ ہوگیا ہے ایک مدت سے دلِ نالاں خموش
باغ میں چل کر اسے بلبل سنایا چاہیے (آتش)

عربی وفارسی کا بے دریغ استعمال

لکھنؤ ی شعراء اپنی غزلوں میں عربی اور فارسی کے الفاظ کو زیادہ استعمال کرتے تھے۔ غالبؔ اور مومنؔ بلکہ داغؔ اور امیر احمد مینائیؔ تک تمام شعراء کے دیوانوں میں عربی وفارسی کی تراکیب اور الفاظ بہت زیادہ ملتے ہیں۔ اس کی ایک عام وجہ تو یہ ہے کہ جیسے آج کل انگریزی کا دور دورہ ہے اس زمانے میں عربی وفارسی بہت زیادہ پڑھی اور سمجھی جاتی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ پڑھے لکھے لوگوں کے لیے درمیان عربی وفارسی میں جو ادب اور جو اسلوب موجود تھا وہ ہندی میں نہیں تھا۔

ہندی الفاظ کو متروک قرار دینا

اس دور میں شعراء نے ہندی الفاظ کی سخت مخالفت کی ہندی کے الفاظ کم سے کم استعمال کیے گئے۔ ان الفاظ کی جگہ عربی وفارسی کے الفاظ وتراکیب کا دور دورہ تھا۔

مرثیہ نگاری

مرثیہ لکھنؤ کی محبوب صنفِ سخن مانی جاتی ہے۔ لکھنؤ کے اکثر بادشاہ اور رؤساء شیعہ مکتب فکر کے پیروکار تھے۔ اسی وجہ سے لکھنؤ میں محرم و صفر میں خصوصاً اور پورا سال عموماً مجالس اور جلوسِ عزاء ہوتے تھے جن میں شعراء مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ اردو مرثیہ کا سب سے بڑا شاعر خاندان میر انیسؔ کا خاندان لکھنؤ سے تعلق رکھتا ہے۔ گو کہ مرثیہ ان سے پہلے موجود تھا مگر مرثیے کو معراج کرانے والے اہل لکھنو ہیں اور اہل لکھنو میں بھی میر انیسؔ کا خاندان اور مرزا دبیرؔ کے نام نمایاں ہیں۔

دبستانِ دہلی کے شعری رجحانات

01	اختصار	07	یکسانیت
02	متانت ووقار	08	شگفتگی
03	داخلیت	09	دردوالم
04	سلاست	10	خوبصورت فارسی تراکیب
05	روانی وسادگی	11	ہندی الفاظ کا استعمال
06	تصوف	12	واقعیت وصداقت

اختصار

دبستانِ دہلی کی شاعری میں اکثر کم الفاظ میں پورا مدعا بیان کر دیا گیا ہے۔ اس دبستان کے شعراء نے زیادہ تر چھوٹی چھوٹی بحروں میں غزلیں لکھی ہیں۔ ان کی شاعری میں اختصار ضرور تھا مگر جامعیت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ جیسے:

؎ کہا میں نے گل کا کتنا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا (میرؔ)

؎ خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میرؔ معلوم ہے قلندر تھا (میرؔ)

متانت ووقار

متانت کا مطلب ہے سنجیدہ ہونا یعنی زبان کا بے ہودہ الفاظ اور خیالات سے پاک ہونا اور **وقار** قدر و منزلت یا جاہ وجلال ہوتا ہے۔ یعنی دلی والوں کی زبان سنجیدہ تھی اور خیالات پُر وقار تھے۔ یہ لوگ لکھنؤ والوں کی طرح رنڈی بازی اور عورت پرستی میں مگن نہیں تھے۔

؎ مت حنائی پاؤں سے چل کر کہیں جایا کرو
دلی ہے آخر نہ ہنگامہ کہیں برپا ہو میاں (میرؔ)

داخلیت

داخلیت خارجیت کی ضد ہے۔ جیسے خارجیت میں باہر کی باتیں بیان کی جاتی ہیں اس کے برعکس دل کی کیفیات کو شعر کے پیرائے میں بیان کرنے کا عمل داخلیت کہلاتا ہے۔ دلی والے چونکہ دل کی چوٹ کھائے ہوئے تھے اسی لیے ان کی شاعری میں داخلیت پائی جاتی ہے۔

؎ خاک بھی سر پر ڈالنے کو نہیں
کس خرابے میں ہم ہوئے آباد (-----)

سلاست

سلاست دلی والوں کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ان شعراء کے ہاں مشکل انداز میں بات کرنے کی بجائے آسان اور سلیس زبان میں بات کی جاتی ہے۔

؎ نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سوداؔ بیاں
شمع ساں جس کے بدن پر ہو پسینے کی خراش (سوداؔ)

روانی وسادگی

دبستانِ دلی کی شاعری میں روانگی اور سادگی پائی جاتی ہے۔ ان شعراء کی زبان لکھنؤ والوں کی طرح پیچیدہ نہیں ہے۔

؎ اثرؔ اب تک فریب کھاتا ہے
تیرے وعدوں کو مان جاتا ہے (میر اثرؔ)

تصوف

دلی کی شاعری میں تصوف پایا جاتا ہے۔ دہلوی شعراء میں سے میر دردؔ کو خاص صوفی شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔

؎ کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بُو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے جس دل میں تو نہ ہو (دردؔ)

؎ دیکھتے ہیں اسی کو اہل نظر گو نہاں وہ ہے اور عیاں ہیں ہم
؎ مانندِ حباب اس جہاں میں کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم (میر حسنؔ)

شگفتگی

ان شعراء کی زبان سادہ اور آسان فہم ہے اور کلام میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

؎ ہم اسیروں کی اسے چاہیے خاطر داری
اور الٹی نہ کہ ہم خاطرِ صیاد کریں (اثرؔ)

درد والم

چونکہ دلی کے حالات خراب تھے اسی لیے شعراء بھی دردانگیز حالات کا گہرا اثر لیے ہوئے تھے۔

؎ ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا (میرؔ)

خوبصورت فارسی تراکیب

اردو کا شعری ادب زیادہ تر فارسی ادب کے زیر اثر ہے اسی لیے دہلوی شعراء بھی خوبصورت فارسی تراکیب کو اپنی اشعار کی زینت بناتے تھے۔ مثلاً:

؎ میں جو نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں
مجھ کو دماغِ وصفِ گل و یاسمن نہیں (میرؔ)

ہندی الفاظ کا استعمال

دبستانِ لکھنؤ والے تو ہندی الفاظ سے بغاوت کر گئے تھے مگر دبستان دہلی میں ہندی کے الفاظ اور ترکیبیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً:

میرؔ صاحب کا ایک مصرع ہے

ع دن آج کا بھی سانجھ ہوا انتظار میں

واقعیت وصداقت

لکھنؤ کی شاعری میں تکلف اور تصنع ہے جبکہ دبستانِ دہلی کی شاعری میں واقعیت وصداقت پائی جاتی ہے۔مثلاً:

؎ موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (میرؔ)

؎ ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے (میرؔ)

نوٹ:

دبستان دہلی میں تصوف، دلی کی تباہی کے تذکرے اور رونا دھونا پایا جاتا ہے۔جبکہ دبستان لکھنؤ میں مسرت ونشاط کی فروانی ہے، گویا لکھنؤ کی شاعری شادمانی اور دھماکہ خیزی کی شاعری تھی۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ (اردو ادب کا گہوارہ)

اردو نثر کی ابتداء تو بہت پہلے سے ہو چکی تھی۔ فورٹ ولیم کالج نے تو صرف اردو نثر کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بس ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج اردو نثر کی ترقی کا دوسرا نام ہے۔

آیئے مندرجہ ذیل نکات کی روشنی میں اس مضمون کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

01		پس منظر
02		کالج کے قیام کے مقاصد
03		محرکین فورٹ ولیم کالج کی خدمات
04		سر گلکرسٹ کی ریٹائرمنٹ کے بعد کالج کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ
05		فورٹ ولیم کالج (انسائیکلوپیڈیا)
06		خلاصہ / اہم نکات

01- پسِ منظر

اردو کی قدیم نثری تصنیفات

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل اردو ادب نثری حالت میں موجود تو تھا مگر یہ اتنی مضبوط نثر نہ تھی، جتنی کہ فورٹ ولیم کالج کی نثر مضبوط تھی۔ یاد رہے کہ یہ کالج اردو نثر کا مبداء نہیں ہے بلکہ اردو نثر کا گہوارہ ہے۔ اس کالج کے قیام سے بیشتر اردو زبان کی مندرجہ ذیل کتب موجود پائی جاتی ہیں۔

01- **''سبرس''** یہ ملاں وجہی کی تصنیف ہے۔

02- **''فضلی کی کربل کتھا''** یہ ملاں حسین واعظ کاشفی کی ''روضۃ الشہداء'' کا اردو ترجمہ ہے۔

03- **''سوداؔ کا دیباچہ''** ----------

04- **''نوطرز مرصع''** حضرت امیر خسروؒ دہلوی کے فارسی کے **''قصہ چہار درویش''** کو میر عطا حسین خان تحسینؔ نے **''نوطرزِ مرصع''** کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ اتنا سلیس نہ تھا۔ بعد میں اسی **''نوطرز مرصع''** کو فورٹ ولیم کالج کے منشی میر امنؔ دہلوی نے **''باغ و بہار''** کے نام سے سلیس اردو کا جامہ پہنایا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام

فورٹ ولیم کالج کے قیام میں جو بنیادی عنصر کارفرما ہے، وہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہے۔ برطانیہ کے تاجروں نے مل کر ہندوستان میں ''**ایسٹ انڈیا کمپنی**'' کے نام سے ایک تجارتی کمپنی قائم کی۔ برطانیہ کا ایک سفیر **'سرٹامس رو'** 1615 عیسوی میں دربارِ **شاہ جہان** میں حاضر ہوا اور ہندوستان میں ایک کوٹھی قائم کرنے کی درخواست پیش کی۔ اس طرح **شاہ جہان** کی اجازت سے انگریزوں نے سورت کے علاقے میں اپنا صدر مقام بنالیا۔ اس سے انگریزوں نے مزید قدم جمانے شروع کیے اور اتنی ترقی کی کہ جنوبی اور مشرقی ہندوستان میں یہ کمپنی پوری طرح چھا گئی۔ ابتداء میں تو کمپنی کا ہندوستان پر قبضہ جمانے کا کوئی منصوبہ نہ تھا مگر بعد میں یہاں کی سیاسی انارکی دیکھ کر انگریز بدنیت ہو گئے اور ہندوستان پر قبضے کی ٹھان لی۔

اب جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا قبضہ جما لیا تو ان کی مزید ترقی میں زبان کا مسئلہ روڑے اٹکانے لگا۔ تو گورنر لارڈ ولزلی نے محسوس کیا کہ برطانیہ سے آنے والے کمپنی کے ملازمین اگر دیسی زبان سے واقف ہو جائیں تو یہاں کا انتظام زیادہ بہتر طریقے سے سنبھال سکیں گے۔ اس وقت تک فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا اور فارسی جاننے والوں کو کمپنی میں نمایاں مقام دیا جاتا تھا۔ سراج الدولہ کی شکست اور بنگال پر قبضے کے بعد کمپنی کے لیے مقامی زبانیں جاننے کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ 15 جنوری 1784ء کو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (Asiatic Society Of Bengal) قائم کی گئی۔ اس کے بعد جوں جوں حالات نے انگریزوں کا ساتھ دیا تو وہ ایک ایک کر کے قدم بڑھاتے گئے اور آخر کار 1798ء میں لارڈ ولزلی نے ہندوستان میں زبان سکھانے کے لیے ایک اسکول کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز کے ردعمل میں 1799ء میں ایک اسکول قائم ہوا جو کہ 10 جولائی 1800ء کو ایک کالج کی شکل اختیار کر گیا۔
06 فروری 1801ء کو اس کالج میں باقاعدہ تدریس کا آغاز کیا گیا۔ اس کالج کے پہلے پرنسپل ایک پادری ریورنڈ ڈیوڈ براؤن تھے۔ اس بارے میں وضاحت آگے پیش کی جائے گی۔

02- کالج کے قیام کے مقاصد

رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

2.1 ﴿ سیاسی مقاصد

2.2 ﴿ اخلاقی مقاصد

2.1 سیاسی مقاصد

کالج کے قیام کے سیاسی مقاصد کو ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے۔

مقامی زبان سے واقفیت

اگر تاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انگریز ہندوستان پر قبضہ چاہتے تھے۔ پہلے انہوں نے یہاں تجارت کی غرض سے ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے ایک تجارتی کمپنی قائم کی اور ہندوستانیوں کو اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے ان کو اپنا محکوم بنا لیا۔ انگریزوں کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی علاقے کے عوام کی زبان جانے بغیر ان پر حاکمیت نہیں جمائی جا سکتی۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ کسی طرح نو وارد انگریز افسروں کو یہاں کی علاقائی زبان سکھائی جائے۔ اس بارے میں ڈاکٹر انور سدید (متوفی 2016ء) اپنی کتاب ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''لارڈ ولزلی ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر دفتر میں ایک اہم عہدے پر فائز رہ چکا تھا، اس لیے اسے علم تھا کہ ہندوستانی زبان اور بنیادی واقفیت کے بغیر ملازمین کو کتنی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں آمد کے فوراً بعد اس نے کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی زبانیں سکھانے کا منصوبہ مرتب کیا اور اس مقصد کے لیے ولزلی نے گلکرسٹ کی اس تجویز کو قبول کر لیا کہ نوجوان ملازمین اپنے ذرائع سے منشیوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بجائے پہلے فارسی کی ابتدائی تعلیم گلکرسٹ سے حاصل کریں''

جہاں مقامی زبان سیکھنا کاروباری امور کو نپٹانے کے لیے ضروری تھا وہاں مقامی زبان سیکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مقامی زبان جاننے سے ہی کسی ملک کی رعایا کو اعتماد میں لایا جا سکتا ہے اور بہتر نظام چلایا جا سکتا ہے۔ بہرحال لارڈ ولزلی خود اس کالج کے قیام کے مقصد کو یوں بیان کرتے ہیں۔

بقول لارڈ ولزلی:

> ''ہندوستانی بول چال کی جان میں (نو وارد انگریز افسر) جو مہارت حاصل کریں گے۔ اس کی بدولت کمپنی کی ملازمت کے دوران اپنے منصب کے تمام فرائض بھی وہ حسن و خوبی سے سرانجام دے سکیں گے۔''

عیسائیت کی تبلیغ

انگریز مسلمانوں سے مذہبی تعصب بھی رکھتے تھے۔ کچھ اسلام بھی ان کی آنکھوں میں چبھتا تھا۔ وہ ہندوستان سے اسلام کا غلبہ توڑ کر عیسائیت کو لانا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے لیے مزید آسانیاں پیدا کر سکیں۔ آیئے اس ضمن میں ماہرین کے بیانات دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدیدؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''کمپنی کے ایک کرسچین ڈاکٹر نے ویلزلی کو لکھا کہ مشرق کے حالات سن کر مجھے کسی بات پر اتنی زیادہ خوشی نہیں ہوئی جتنی مذہب (عیسائیت) کے حق میں آپ کی حمایت سے۔'' (اُردو ادب کی مختصر تاریخ)

پروفیسر عابد علی عابد کے بقول:

''فورٹ ولیم کالج کا ایک اور مقصد فارسی کی حاکمیت کو کم کرنا اور مسلمانوں کو اپنے ثقافتی محور سے ہٹانا بھی تھا۔''

فارسی کی حاکمیت کو کم کرنا بھی ایک سیاسی مقصد تھا، کیونکہ انگریز فارسی کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ فارسی کے اثر کو کم کرنے، حتیٰ کہ ختم کر دینے سے مسلمانوں کے دماغ سے حاکمیت کی بو نکل جائے گی اور وہ انگریزی کے زیر اثر آ جائیں گے۔

رام بابو سکسینہ نے ''تاریخ ادب اردو'' میں لکھا ہے کہ:

''پادری لوگ اپنے مطالب عوام الناس پر دلنشین کرنے کے واسطے انہیں کی زبان میں اپنی تحریریں اور تقریریں کرتے تھے اور اشاعت دین کی غرض سے متعدد رسالے پمفلٹ اور اخبار وغیرہ نکالتے تھے جن میں مذہبی روایتوں اور گیتوں کے علاوہ بہت سی مفید چیزیں بھی شامل ہوتی تھیں جن سے زبان کو بہت وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔''

ہندوستان پر قبضے کی نیت سے رعایا کو فراخ دلی و فیاضی کا جھانسا

جس طرح ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے جھانسے سے انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے تھے ایک بار انہوں نے ایران میں بھی تمباکو کی ایک کمپنی قائم کرنے کے جھانسے سے یہ ذلیل حرکت وہاں بھی دہرانا چاہی تھی مگر سبحان اللہ اہل علم لوگوں کی ژرف بینیاں کہ وہاں امام انقلاب آقائے روح اللہ الخمینیؒ کے ایک استاد بزرگوار نے یہ حالت دیکھ کر فتویٰ دے دیا کہ: ''تاحکم ثانی (ایرانیوں پر) تمباکو کا استعمال حرام ہے'' اور اس فتوے پر عمل کرتے ہوئے ایرانی تمباکو سے متنفر ہو گئے گلی بازاروں اور دکانوں پر تمباکو کی بوریاں کھلی کی کھلی رہ گئیں کسی نے ہاتھ تک نہ لگایا۔اس سے انگریزوں کا سارے کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔

اس کالج کو قائم کرنے اور ہندی زبان کو عام کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انگریز مقامی رعایا سے اپنائیت بنانا چاہتے تھے، اور وہ سمجھتے تھے کہ اس عمل سے وہ ہندوستانیوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنالیں گے۔اس کالج کے مصنفین نے اس عمل کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔

بقول ڈاکٹر انور سدیدؒ (اردو ادب کی تحریکیں):

''فورٹ ولیم کالج کے قیام کا ایک اور مقصد تصنیفات کے ذریعے ہندوستانی رعایا کے دلوں پر انگریزی حکومت کی شان و شوکت، فیاضی، علم دوستی اور رعایا پروری کا نقش قائم کرنا بھی تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تاہم مصنفین نے ان کتابوں کے جو دیباچے اور خود نوشت حالات لکھے ہیں، ان میں سرکار انگلشیہ، لارڈ ولزلی اور ڈاکٹر گلکرائسٹ کی تحسین اور قصیدہ گوئی میں کسر اٹھا نہیں رکھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔چنانچہ ان کتب کے ذریعے ہندوستانی مصنفین نے رعایا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ محکومی کے باوصف ایک مخیّر اور منصف حکومت کے زیر سایہ خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔''

2.2 اخلاقی مقاصد

رام بابو سکسینہ فورٹ ولیم کالج کے اخلاقی مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چونکہ بڑے بڑے قطعات ملک انگریزی عمل داری میں داخل ہوتے جاتے تھے، لہٰذا پارلیمنٹ انگلستان کو اب یہ محسوس ہونے لگا کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی ذمہ داری بھی ہمیں پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اب اس کی کوشش ہونے لگی کہ جو رکاوٹ خانہ جنگیوں اور ملکی لڑائیوں کی وجہ سے لوگوں کے (کذا) میں پڑ گئی تھی، جس کی وجہ سے تعلیم کو بہت سخت صدمہ پہنچ رہا تھا، اب دور ہو جائے گا۔''

سکسینہ صاحب کے اخلاقی مقاصد والے بیان کی تردید

رام بابو سکسینہ نے تو تاریخ میں جو حقائق دیکھے ان کو لکھتے گئے۔ لیکن بعد کے محققین نے اور مصنفین نے سکسینہ صاحب کے کچھ بیانات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ آیئے ان کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد خاص سیاسی تھا۔

جنابِ احرار نقوی صاحب کہتے ہیں کہ:

''فورٹ ولیم کالج کا نثری دبستان ایک سیاسی منفعت کی خاطر معرض وجود میں آیا۔''

بقول پروفیسر سمیع اللہ صاحب:

''فورٹ ولیم کالج کے قیام میں برطانوی پارلیمنٹ کا سرمُو بھی دخل نہ تھا اور ڈائرکٹرز بھی تعلیم پر کیے جانے والے اخراجات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ 1813ء سے انگریزوں نے ہندوستانی رعایا کی تعلیم کے سلسلے میں کوئی قدم ہی نہیں اٹھایا، کیونکہ ان دنوں تعلیم خود انگلستان میں اسٹیٹ کی ذمہ داری نہیں تھی۔''

صدیق الرحمٰن فاروقی اس کالج کے قیام کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''مبینہ مقصد ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود نہ تھی، بلکہ برطانوی سول اور فوجی افسروں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دینا تھا، تاکہ وہ اس کے ذریعے ہندوستانی رعایا کے ساتھ رابطہ قائم کر کے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو مستحکم بنانے میں مدد کر سکیں۔ کالج کے قیام کی مہم کو مفید اور قابل قبول بنانے کے لیے جو انسانی فلاح و بہبود کی بحثیں چھیڑی گئی تھیں، ان کا واحد مقصد برطانوی شہنشاہیت کو استحکام بخشنا اور اس کے نقائص کو دور کرنا تھا۔''

پروفیسر وفا راشدی صاحب کا کہنا ہے کہ:

''کالج کے قیام کا اصل مقصد یہ تھا کہ حکومت کو زبان کے ذریعے امور سیاست اور تنظیم ملک گیری میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں پیدا ہو جائیں۔''

03- محرکینِ فورٹ ولیم کالج کی خدمات

ایشیائی محرکین

فورٹ ولیم کالج کے ایشیائی محرکین کے اسماء گرامی کا جدول

01	میر امن دہلوی (متخلص بہ لطفؔ)	06	نہال چند لاہوری	11	بنی نرائن (متخلص بہ جہاںؔ)
02	میر شیر علی افسوسؔ (دہلوی)	07	مرزا لطف علی (معرف بہ مظہر علی خان وِلاؔ)	12	مرزا علی لطف
03	میر بہادر علی حسینیؔ	08	حفیظ الدین احمد	13	مولوی امانت اللہ شیداؔ
04	سید حیدر بخش حیدری	09	مولوی اکرام علی	14	----------
05	مرزا کاظم علی جوانؔ	10	للّو لال جی	15	----------

اس عہد کے دیگر منشیوں اور نثاروں میں: سید جعفر علی رواںؔ لکھنوی، افتخار الدین شہرتؔ، عبدالکریم خان کریمؔ دہلوی، مرزا ہاشم علی عیاںؔ، مرزا قاسم علی ممتازؔ، میر عبداللہ مسکینؔ، مرزا جان طپشؔ، مولوی خلیل علی خان اشکؔ، مرزا محمد فطرتؔ، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی وغیرہ شامل تھے۔

مولوی خلیل علی اشکؔ نے 1809ء میں اکبر نامہ کا ترجمہ ''**واقعاتِ اکبر**'' کے نام سے تیار کیا۔ مگر وہ شائع نہیں ہوا۔ طپشؔ نے اردو محاورات پر ایک کتاب لکھی اور 1811ء میں ایک طویل مثنوی ''**بہار دانش**'' کے نام سے لکھی ان کا کلیات فورٹ ولیم کالج کی جانب سے شائع کیا گیا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں اور انیسویں صدی کے شروع میں مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی مشہور زمانہ ہوئے۔ انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں ''**حجتہ اللہ البالغہ**'' اور ''**ازالۃ الخفا عن سیرۃ الخلفاء**'' نہایت مشہور اور ممتاز ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے مولانا شاہ عبدالعزیز ایک مشہور عالم ہو گزرے ہیں جن کا انتقال 1229ھ میں ہوا دوسرے صاحبزادے مولانا شاہ رفیع الدین بھی نہایت جید عالم تھے۔ وہ 1233ھ میں فوت ہوئے تھے۔ ان کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قران مجید کا پہلا اردو ترجمہ کیا تھا۔ تیسرے صاحبزادے مولانا شاہ عبدالقادر (1167ھ تا 1230ھ) تھے۔ اپنے والد و برادران کی طرح یہ بھی ایک بلند پایہ کے عالم تھے۔ انہوں نے 1205ھ میں قران مجید کا دوسرا ترجمہ کیا اور ایک تفسیر ''موضح القرآن'' کے نام سے تصنیف کی۔ یہ ایک نہایت ہی سلیس اور بامحاورہ ترجمہ ہے۔

آیئے اب چند اہم محرکین کی تصنیفی خدمات کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں۔

01۔ میر امن دہلوی:

میر امن دہلوی متخلص بہ لطفؔ، دلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد سلاطین مغلیہ کے زمانے میں وظائف اور جاگیروں سے معزز و ممتاز تھے۔ احمد شاہ درانی نے جب دہلی پر حملہ کیا تو فوج کی لوٹ مار میں میر امن کا گھر بھی شامل تھا۔ اور سورج مل جاٹ نے ان کی

خاندانی جاگیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ میر امن اس مصیبت سے نکل کر پٹنے پہنچے یہاں کچھ عرصہ تک رہ کر کلکتہ روانہ ہوئے۔ جہاں نواب بہادر جنگ دلاور کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم کی تعلیم و تربیت ان کے سپرد کی گئی تھی۔ اسی زمانے میں میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف ڈاکٹر گل کرسٹ سے کرادیا جن کی فرمائش پر انہوں نے اپنی مشہور و معروف کتاب **"قصہ چہار درویش"** لکھی، جس کا تاریخی نام **"باغ و بہار"** ہے۔ یہ قصہ اصل میں فارسی میں تھا اور اس کو امیر خسروؒ دہلوی نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کے بحالت علالت دل بہلانے کے واسطے تصنیف کیا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب مرشد کو صحت نصیب ہوئی تو انہوں نے دُعا دی کہ اس قصہ کو جو کوئی سُنے گا وہ بحکم خدا بیماری سے شفا پائے گا۔ یہ قصہ فارسی میں بھی بہت مقبول ہے اور اس کے دونوں اردو ترجمے یعنی تحسین اور میر امن کے ترجمے مع دیگر تراجم کے جو ہندوستان کی اکثر دیسی زبانوں اور نیز غیر ملکی زبانوں میں ہوئے ہیں اور مقبولِ عام ہیں۔ یہ کتاب 1801ء بمطابق 1217ھ میں ختم ہوئی۔ تحسینؔ کے ترجمے کو میر امن دہلوی نے اپنی زبان میں لکھا ہے، کیونکہ اس میں اکثر غیر مانوس فارسی اور عربی کے الفاظ تھے جن کو میر امن دہلوی نے دیسی زبان میں بدل دیا۔ اس ترجمے کے بارے میں سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو" کے ص۔ 429 پر لکھا ہے کہ مرحوم سرسیدؒ اس ترجمے کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"جو مرتبہ میر تقی میرؔ کو نظم میں حاصل ہے وہی میر امن کو نثر میں ہے۔"

اس کے علاوہ **"گنجینہ خوبی"** بھی میر امن کی تصنیف ہے۔ جو مُلا حسین واعظ کاشفی کی **"اخلاق محسنی"** کے طرز پر 1802ء میں تحریر کی گئی منشی کریم الدین کا خیال ہے کہ میر امن نے کوئی دیوان بھی ضرور مرتب کیا ہوگا مگر اس کا کہیں پتہ نہیں۔ ڈاکٹر فیلن نے خود میر امن کی زبانی سُنا تھا کہ ان کو کسی سے فنِ شعر میں تلمذ نہ تھا۔

02۔ میر شیر علی افسوسؔ 1735ء لغایت 1809ء : (لغایت:۔یعنی: آخر تک۔انجام تک)

میر شیر علی دہلوی متخلص بہ افسوسؔ، میر علی مظفر کے بیٹے تھے۔ جو نواب میر قاسم کے سرکار میں دروغہ سلح خانہ تھے۔

یہ **حضرت امام جعفر صادق** علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ اور ان کے آباؤ اجداد خاف کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگوں میں سے ایک شخص سید بدرالدین نامی نارنول میں (جو آگرہ کے قریب ہے) سکونت گزین ہوئے۔ محمد شاہ کے زمانے میں ان کے باپ اور چچا سید غلام علی خاں آگرہ سے دلی آئے۔ اور عمدۃ الملک نواب امیر خان کی سرکار میں ایک بیش قرار تنخواہ پر ملازمت اختیار کی۔ افسوسؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ 1746ء میں جب نواب امیر خان کا انتقال ہوا تو افسوسؔ کے والد پٹنے چلے گئے۔ جہاں نواب میر قاسم اور ان کے بعد نواب میر جعفر کی ملازمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب آخر الذکر معزول کیے گئے تو وہ لکھنؤ آ گئے۔ اور وہاں سے حیدر آباد گئے جہاں ان کا انتقال ہوا۔ افسوسؔ شاعری بھی کرتے تھے اور اپنا کلام میر حیدر علی حیرانؔ کو دکھلاتے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ میر حسنؔ، میر تقی میرؔ اور میر سوزؔ سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ میں ان کی سرپرستی نواب سالار جنگ بہادر اور ان کے بعد ان کے بیٹے نواب مرزا نوازش علی خان کرتے رہے۔ لکھنؤ ہی کے قیام میں نواب حسن رضا خان نائب نواب آصف الدولہ کی وساطت سے افسوسؔ، کرنیل اسکاٹ صاحب سے ملے جنہوں نے ان کی قابلیت اور ذہانت و ذکاوت کو بہت پسند کر کے دو سو روپیہ مشاہرہ پر ان کو کلکتہ بھیجا اور پانچ سو

روپیہ زادراہ کے لیے بھی عنایت فرمائے۔افسوسؔ راستے میں مرشدآباد میں مرزا علی لطف صاحب (گلشن ہند) سے بھی ملے تھے۔کلکتہ پہنچ کروہ فورٹ ولیم کالج کے زمرۂ اسٹاف میں ایک معزز عہدہ پر فائز ہوئے ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

افسوسؔ کی تصنیفاتی خدمات

اردو ترجمہ ''**گلستان سعدی**'' موسوم بہ ''**باغِ اردو**'' (باراوّل کلکتہ میں 1802ء میں چھپی)

1804ء میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''**آرائش محفل**'' لکھنی شروع کی جس میں ہندوستان کے جغرافی حالات کے علاوہ فتح اسلام تک ہندوراجاؤں کی ایک مختصر تاریخ بھی ہے اس تصنیف میں اکثر تاریخوں سے مدد لی گئی ہے۔مگراس کا اصلی مآخذ منشی سوجن رائے کی ''**خلاصۃ التواریخ**'' ہے۔اس کے علاوہ منشی افسوسؔ نے میر بہادر علی کی ''**نثر بے نظیر**''، منشی عزت اللہ کی ''**مذہب عشق**'' اور مولوی محمد اسماعیل صاحب کی ''**بہار دانش**'' کی تصنیف میں بھی مدد دی تھی۔اور ''**کلیات سوداؔ**'' بھی اپنی تصحیح سے چھپوایا تھا۔ان تصانیف کے علاوہ ان کا ایک دیوان بھی ہے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔افسوسؔ کا انتقال 1809ء میں ہوا۔

03۔ میر بہادر علی حسینی

ان کے مفصل حالات تو کہیں نہیں ملتے مگر موصوف نے جو تصنیفات چھوڑی ہیں ان کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

01 ''**اخلاقِ ہندی**'':۔1802ء میں سرِ گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھی گئی۔اصل میں مفتی تاج الدین نے ''**مفرح القلوب**'' کے نام سے ''**ہتوپدیش**'' کا فارسی میں ایک ترجمہ کیا تھا جو کہ شاہ نصیرالدین بہادری کے حکم سے تصنیف کیا گیا۔''**اخلاق ہندی**'' اسی کا اردو میں سلیس ترجمہ ہے۔

02 ''**نثر بے نظیر**'':۔ یہ دراصل مثنوی میر حسنؔ کی نثری شکل ہے۔جو 1802ء میں تصنیف ہوئی اور 1803ء میں اصل مثنوی سے دوسال قبل شائع ہوئی۔

03 ''**رسالہ ِگلکرسٹ**'':۔ یہ اردو زبان میں گلکرسٹ کی گرامر کا خلاصہ ہے۔جو اردو کے صرف ونحو اور فنِ عروض پر مشتمل ہے۔یہ رسالہ 1816ء میں کلکتہ میں طبع ہوا۔

04 ''**ترجمہ تاریخ آسام**'':۔شہاب الدین تابش کی تصنیف ''تاریخ آسام'' کا انہوں نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔جس میں اورنگ زیب کے مشہور جرنیل میر جملہ کے ''حملہ آسام'' 1662ء کا ذکر ہے۔جو کہ کولبرک صاحب کے حکم سے ترتیب پایا۔

05 ''**قصہ لقمان**'' اور تفسیر قرآن میں بھی حسینی صاحب شریک کار رہیں۔

04۔ سید حیدر بخش حیدری

سید حیدر بخش حیدری سید ابوالحسن کے بیٹے تھے۔آپ دلی کے رہنے والے تھے۔ان کے آباؤاجداد نجف سے ہندوستان آئے تھے۔ جب 1800ء میں فورٹ ولیم کالج میں قابل منشیوں کی مانگ ہوئی تو حیدری صاحب نے ایک کتاب موسوم بہ ''قصہ مہروماہ'' ترتیب دی جس کا سنہ تصنیف 1214ہجری ہے۔اس کتاب کو انہوں نے گلکرسٹ کی خدمت میں اپنی قابلیت کے نمونے کے طور پر پیش کیا۔ڈاکٹر صاحب نے اس کو بہت پسند کیا اور حیدری صاحب کو کالج مذکورہ کی ایک منشی گری پر ممتاز کیا۔ڈاکٹر اسپرنگر نے فہرست کتب اودھ میں لکھا

ہے کہ مولانا حیدر بخش حیدری کا انتقال 1823ء میں ہوا۔ حیدری صاحب نہایت بلند پایہ مصنف ہوگزرے ہیں ان کی اکثر تصانیف فارسی کتب کے تراجم ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل کتب خاصی مشہور ہیں۔

01 **''قصہ مہر وماہ''**:۔ اوپر کے پیرے میں اس کتاب کا ذکر کیا جاچکا ہے۔

02 **''قصہ لیلیٰ مجنوں''**:۔ امیر خسروؒ نے اسی نام سے ایک مثنوی لکھی تھی یہ کتاب اسی مثنوی کا اردو میں نثری ترجمہ ہے۔ سکسینہ صاحب کا کہنا ہے کہ یہ ترجمہ غالباً مصنف کی ملازمت کلکتہ سے بیشتر کیا گیا تھا۔

03 **''طوطا کہانی''**:۔ یہ سید محمد قادری کی فارسی تصنیف ''طوطی نامہ'' کا ترجمہ ہے۔ جو کہ 1801ء میں گلکرسٹ کے حکم سے تصنیف کیا گیا۔ اصل میں یہ قصہ سنسکرت میں ''شوکا شپتتی'' کے نام سے لکھا گیا تھا۔ ضیائے بخشی نے 1230ھ میں فارسی میں اسی نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو باون قصوں پر مشتمل تھی۔ اسی سے سید محمد قادری نے 94-1793ء میں دوسرا طوطی نامہ لکھا جو کہ مختصر اور صاف کر کے پینتیس قصوں پر مشتمل رکھا گیا۔ یہ تمام قصے کنگ آرتھر کے انگریزی افسانوں کی طرح ہندوستان بھر میں بہت مقبول ہوئے اور مختلف اوقات میں مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے ہوتے رہے۔ مثلاً: اسمال صاحب نے 1875ء میں انگریزی میں ترجمہ کیا۔ 1806ء میں چندی چرن سیرام پوری نے ''طوطا اتہاس'' کے نام سے بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا۔ اسی کتاب کا انبا پرشاد راسا نے ہندی میں ترجمہ کیا۔ دکنی زبان میں غواصی نے منظوم ترجمہ کیا اور اسی دکنی میں نثر میں کسی غیر معلوم شخص نے ترجمہ کیا۔ اصل سنسکرت سے ہندی میں بھیروں پرشاد نے ترجمہ کیا۔ گجراتی نظم میں سمالا بھٹ نے اور مرہٹی میں کسی غیر معلوم شخص نے ترجمہ کیا۔

04 **''آرائشِ محفل ترجمہ قصہ حاتم طائی''**:۔ اس کو میر شیر علی افسوسؔ کی ''آرائش محفل'' سے خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔ سب سے پہلے یہ قصہ 1802ء میں کلکتہ میں چھپا۔ اس کا ترجمہ بھی بنگلہ ہندی اور گجراتی میں ہوگیا ہے۔

05 **''تاریخ نادری''**:۔ یہ منشی مرزا مہدی کی مرتبہ ''نادر نامہ'' طبع 1224ھ کا اردو میں ترجمہ ہے۔

06 **''گلِ مغفرت''**:۔ اس کو انہی کے ''گلشن شہیداں'' کا خلاصہ سمجھنا چاہئے۔ ''گلشن شہیداں'' ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ''روضۃ الشہداء'' کا ترجمہ ہے۔ اس کا دوسرا نام ''دہ مجلس'' بھی ہے۔ سنہ تصنیف 1830ء اور مقام طباعت کلکتہ ہے۔ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوگیا ہے۔

07 **''گلزار دانش''**:۔ یہ شیخ عنایت اللہ کی ''بہار دانش'' کا اردو ترجمہ ہے۔ جس میں عورتوں کے مکر و کید کے قصے درج ہیں۔

08 **''ہفت پیکر''**:۔ یہ نظامی کی مشہور مثنوی ''ہفت پیکر'' کا جواب ہے۔ جو کہ 6-1805ء میں تصنیف ہوئی۔

09 **''مجموعہ صد حکایات''**۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

10 علاوہ ازیں ان کے **چند مرثیے** اور **دیوانِ غزلیات** بھی شائع ہوا تھا۔

05۔ مرزا کاظم علی جوانؔ

ان کا ذکر نواب علی ابراہیم خاں نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم میں کیا ہے۔ جوانؔ دراصل دلی کے باشندے تھے مگر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جہاں وہ 1784ء تک موجود تھے۔ انہوں نے نواب علی ابراہیم خاں کو اپنا کچھ کلام نمونتاً بھیجا تھا۔ سنہ 1800ء میں کرنل اسکاٹ صاحب نے ان کو منشی گری کا ایک عہدہ دے کر لکھنؤ سے کلکتہ روانہ کیا تھا۔ منشی نارائن اپنے تذکرۂ جہان طبع 1814ء میں لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت زندہ تھے۔ بلکہ 1815ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جو مشاعرے ہوئے تھے ان میں بھی یہ موجود پائے جاتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے عیاں اور ممتاز بھی کسی قدر مشہور زمانہ ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل کتب ان سے منسوب ملتی ہیں۔

''شکنتلا ناٹک'':۔ مصنفہ کالیداس کا اردو ترجمہ:۔ اس کے دیباچے میں وہ بطور تمہید لکھتے ہیں کہ کالیداس کی اصل کتاب کا ترجمہ برج بھاشا میں 1716ء میں 'مولے خان، پسر خدای خان سپہ سالار شہنشاہ فرخ سیر' کے حکم سے ایک شاعر **نواز کیشیر** نامی شخص نے کیا تھا۔ اور 1801ء میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر اس کتاب کا ترجمہ برج بھاشا سے اردو میں کیا گیا اور اس پر نظر ثانی للولال جی کیشیر نے کی اور یہ کلکتہ میں 1802ء میں طبع ہوا۔

01۔ **''قرآن مجید کا اردو ترجمہ''**:۔ یہ ترجمہ سر گلکرسٹ صاحب کی فرمائش پر کیا گیا۔

02۔ **''ترجمہ تاریخ فرشتہ''**:۔ یہ کتاب خاندان بہمنی کی تاریخ سے متعلقہ ہے۔

03۔ **''سنگھاسن بتیسی''**:۔ اس تصنیف میں للولال جی بھی ان کے شریک کار تھے۔

04۔ **''بارہ ماسہ یا دستور ہند''**:۔ یہ 1812ء میں کلکتہ میں طبع ہوئی۔ اس میں ہندوستان کی مختلف فصلوں، موسموں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں کا ذکر ہے۔ یہ کتاب ترجمہ شکنتلا ناٹک کے بعد لکھی گئی۔

05۔ **''خرد افروز''**:۔ یہ بھی جوانؔ صاحب کی ایک تصنیف ہے۔ مزید انہوں نے میرؔ اور سوداؔ کے کلام کے کچھ منتخبات بھی شائع کیے۔

06۔ نہال چند لاہوری

نہال چند صاحب دلی میں پیدا ہوئے، چونکہ لاہور میں زیادہ رہے اسی وجہ سے لاہوری کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ ان کے زیادہ حالات کہیں سے نہیں ملتے بس اکلوتا ایک مآخذ ان کی اپنی تصنیف ''مذہب عشق'' کا دیباچہ ہے، جس میں وہ اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہیں۔ نہال چند 1217ھ میں کلکتہ گئے تھے۔ انہی کا کہنا ہے کہ کپتان ولورٹ نے ڈاکٹر گلکرسٹ سے ان کا تعارف کرایا۔ جن کی فرمائش پر انہوں نے ''قصہ تاج الملک'' اور ''بکاؤلی'' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ انہوں نے مندرجہ ذیل کتب تصنیف کی ہیں۔

01۔ **''مذہب عشق''**:۔ مذکورہ بالا تصنیف ''مذہب عشق'' کا یہ نام ایک تاریخی نام ہے۔ اور عرف عام میں اس کو ''قصہ گل بکاؤلی'' کہتے ہیں۔ جو کہ شیخ عزت اللہ بنگالی کی 1124ھ کی فارسی تصنیف ''قصہ گل بکاؤلی'' کا اسی ہی نام سے اردو میں ترجمہ ہے۔ اسی کتاب کا ایک دوسرا منظوم ترجمہ کسی ریحان نامی شخص نے 1212ھ میں کیا تھا۔ جس میں چالیس ابواب ہیں جو کہ ''گلشت'' کے نام سے موسوم ہیں۔ نیز ایک قدیم مثنوی بھی اس قصہ کا ترجمہ ہے جو کہ ''تحفۃ المجالس'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نام تاریخی ہے جس سے 1035ھ نکلتے ہیں۔ اور زبان

دکنی میں ایک بہت ہی قدیم نسخہ ملتا ہے جس کا سنہ تصنیف 1035ھ ہے۔ مگر ان سب سے زیادہ مشہور مثنوی ''گلزار نسیم'' جس کا سنہ تصنیف 1254ھ ہے۔ جو تاریخیں اس کتاب ''مذہب عشق'' کے آخر میں دی ہوئی ہیں ان سے اس کا سنہ تصنیف 1217ھ بمطابق 1813ء نکلتا ہے۔

07۔ مرزا مظہر علی خان وِلاؔ

مرزا لطف علی معروف بہ مظہر علی خان متخلص بہ وِلاؔ سلیمان علی خان کے بیٹے ہیں۔ دلی میں رہنے والے تھے۔ مرزا جان طپشؔ اور مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ حکیم شیفتہؔ نے اپنے ''گلشنِ بے خار'' میں میر نظام الدین ممنونؔ کو بھی ان کا استاد لکھا ہے۔ مرزا مظہر علی بھی کلکتہ کے کالج میں منشی تھے اور بہت ساری کتابیں ان کے نام سے منسوب ہیں۔ مثلاً:

01 ''**پند نامہ سعدی**'':۔ کا منظوم اردو ترجمہ جو کہ 1802ء میں شائع ہوا۔

02 **''ہفت گلشن''**:۔ مصنفہ ناصر علی بلگرامی واسطی کا ترجمہ جو کہ اخلاق و مواعظ کی ایک کتاب ہے، اور سات ابواب پر مشتمل ہے۔ جو تاریخیں اس کتاب کے آخر میں دی ہوئی ہیں ان سے سنہ تصنیف 1801ء نکلتا ہے۔ اس میں اخلاقی حکایتیں، آداب گفتگو، بزرگوں کی اطاعت و فرمانبرداری اور چند احادیث نبویؐ اور حضرت علی علیہ السلام کے اقوال درج ہیں۔

03 ''**قصہ مادھونل**'' اور ''**کام کنڈلا**'' جو موتی رام کبیشر کی برج بھاشا کی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ سنہ تصنیف 1801ء ہے۔

04 ''**بیتال پچیسی**'' **مصنفہ صورت کبیشر**:۔ (درزبان بھاشا) کا اردو ترجمہ جو للو لال جی کی شرکت میں کیا گیا۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ پچیس قصے کسی بیتال (بھوت) نامی شخص نے راجہ بکرمہ جیت کے سامنے کہے تھے۔ یہ ہندوستانی پبلک میں بہت مقبول ہے۔ مگر اس میں کوئی ادبی ندرت نہیں ہے۔

05 ''**تاریخ شیر شاہی**'':۔ (فارسی) کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جو بعد میں انگریزی میں بھی مترجم ہو چکی ہے۔

06 ''**دیوان ریختہ**'':۔ یہ ایک دیوان ریختہ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں غزلیات، رباعیات اور قصائد وغیرہ اور مصنف کی سوانح عمری تحریر ہے۔ 1801ء میں خود مصنف نے اس کتاب کا ایک نسخہ فورٹ ولیم کالج میں بطور یادگار دیا تھا۔

08۔ حفیظ الدین احمد

01 ''**خرد افروز**'':۔ یہ کتاب 1803ء میں شائع ہوئی۔ یہ ''**عیار دانش**'' مصنفہ ابوالفضل کا اردو ترجمہ ہے۔ اور خود 'عیار دانش' ملا واعظ کاشفیؒ کی ''**انوار سہیلی**'' کی تلخیص ہے۔ اور ''انوار سہیلی''، ''**کلیلہ و منہ**'' (عربی) کا ترجمہ ہے جو سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ کپتان ناکس کے ایک منشی جو کہ ان کے ساتھ کلکتہ اور 'گیا' بھی گئے تھے۔ جن کا نام مرزا مہدی بتایا جاتا ہے انہوں نے ''انوار سہیلی'' سے انہی قصوں کا ایک نا تمام ترجمہ کیا تھا۔ کپتان ناکس نے 'گیا' میں ایک مشہور داستان گو بینگا خاں نامی ایک آدمی سے بھی اس کتاب کا ترجمہ کرایا تھا۔ اور ان دونوں ترجموں کا مقابلہ کرتے ہوئے مرزا مہدی کے ترجمے کو ترجیح دی تھی۔ ''انوار سہیلی'' کا ایک ترجمہ دکھنی زبان میں بھی موجود ہے جو ایک شخص مسمی محمد ابراہیم بیجاپوری کی تصنیف ہے۔ اور مدراس میں 1824ء میں چھپا ہے۔ فقیر محمد خان گویا نے بھی اس کتاب کا ترجمہ ''**بستان حکمت**'' کے نام سے کیا تھا اور یہی ترجمہ سب سے بہتر ہے۔ ''**ستارہ ہند**'' کے نام سے نواب امیر علی خان واسطی نے 1872ء میں ایک مختصر ترجمہ کیا۔ اور بہاری لال راضی بھرتپوری نے ''**ارژنگ راضی**'' کے نام سے 1879ء میں ترجمہ کیا تھا۔

09۔ مولوی اکرام علی

01 ''ترجمہ اخوان الصفا'':۔ مولوی اکرام علی صاحب نے عربی کی مشہور کتاب ''اخوان الصفا'' کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اصل کتاب کے خاتمہ پر انہوں نے ''کشف الظنون'' کا حوالہ دے کر بتایا ہے کہ ''اخوان الصفا'' اکاون (51) رسائل کا مجموعہ تھا اور ان رسائل کے مصنفین کے مندرجہ ذیل نام بتائے ہیں: محمد بن نصر البتی معروف بہ مقدسی، ابوالحسن علی بن ہارون الزنجانی، ابواحمد النہر جوری عوفی اور زید بن رفاعہ۔ یہ سب کے سب حضرات حکیم تھے۔ اس پوری کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر ڈیٹرس نے 1850ء، لغایت 1879ء میں کیا۔ مولوی اکرام علی صاحب نے صرف اسی حصہ کا ترجمہ کیا ہے جس میں انسان اور حیوان کی برتری کا سوال شاہ جن کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ جانور اپنے مالک (انسان) کے ظلم و تعدی سے عاجز آ کے اجنّہ کے بادشاہ بیوراسب کے سامنے اپنی فریاد پیش کرتے ہیں۔ اس مقدمے کے فیصلے کا ایک دن مقرر کیا جاتا ہے جس دن سب جانور بادشاہ کے دربار میں پیش ہوتے ہیں۔ اور سبھی ایک ایک کر کے انسانوں کے لیے اپنے فضائل و فوائد پیش کرتے ہیں اور ساتھ میں انسانوں کے ان ساتھ کیے جانے والے سلوک کا شکوہ بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ گھوڑے، گدھے، اونٹ اور بھیڑ کے بیان یکے بعد دیگر لیے جاتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ یہ سب بیانات ایسے ہی دلچسپ ہیں جیسے کنگر بی کی مشہور انگریزی کتاب ''ایونگز ایٹ ہوم'' دلچسپ ہے۔ یہ ترجمہ کپتان ٹیلر صاحب کی فرمائش سے نہایت ہی سلیس اور آسان اردو میں کیا گیا ہے۔ اور 1810ء میں شائع ہوا ہے۔ سنہ 1814ء میں اس وقت کے فورٹ ولیم کالج کے افسرِ اعلیٰ کپتان لاکٹ کی سفارش سے مولوی اکرام علی محافظ دفتر مقرر ہوئے۔

10۔ للّو لال جی (للولال کوی)

یہ گجراتی برہمن تھے مگر شمالی ہند میں سکونت گزیں ہو گئے تھے۔ باوصف اس کے کہ ہندو تھے مگر اردو کے بھی بڑے ماہر تھے۔ ان کا کمال فن دیکھئے کہ: شکنتلا ناٹک، سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی اور قصہ مادھونل کی تصنیف میں انہوں نے اصل مصنفوں کو بہت مدد دی۔ ان کی ایک مشہور تصنیف مندرجہ ذیل ہے۔

01 ''لطائف ہندی'':۔ انہوں نے 1810ء میں لطیف حکایات کی ایک تصنیف کی جو کہ ''لطائف ہندی'' کے نام سے مشہور ہے۔

11۔ بینی نرائن جہاںؔ

بینی نرائن متخلص بہ جہاںؔ ایک ہندو مذہب کے پیروکار تھے۔ گارسن ڈیٹاسی کی تحقیق کے مطابق بینی نرائن نے اسلام قبول کر لیا تھا اور مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ان کی تصنیفی خدمات حسب ذیل ہیں:

01 ''دیوان جہاںؔ'':۔ یہ ان کا شاعری کا دیوان ہے۔ اس میں ہندوستانی شعراء کا ایک تذکرہ بھی شامل ہے۔ یہ دیوان کپتان روبک صاحب سکرٹری فورٹ ولیم کالج کی فرمائش سے 1812ء میں لکھا گیا اور انہی کے نام پر معنون ہے۔

02 ''چار گلشن'':۔ یہ ایک فارسی قصے کا اردو میں ترجمہ ہے۔ اس میں بادشاہِ کیوان اور فرخندہ کے حالات درج ہیں۔ یہ قصہ 1811ء میں منشی امام بخش کے ایما و اصرار سے تیار کیا گیا اور کپتان ٹیلر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا جنہوں نے اس قصے کو پسند کیا

اور مصنف کو انعام سے نوازا اور اس قصے کا اصل نسخہ کالج کے کتب خانے میں داخل کرا دیا۔

03 ''ترجمہ تنبیہ الغافلین'':۔ گارسن ڈیٹاسی کی تحقیق کے مطابق انہوں نے شاہ رفیع الدین صاحب کی ''تنبیہ الغافلین'' کا 1829ء میں اردو میں ترجمہ کیا۔

12۔ مرزا علی لطف

مرزا علی لطف، کاظم بیگ خان متخلص بہ ہجؔر یا ہجرؔی کے بیٹے تھے۔ جو استر آباد کے رہنے والے تھے۔ اور 1154ء میں نادر شاہ کی ہمراہی میں آئے تھے۔ اور بعد کو ابوالمتصور خان صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی دہلی میں داخل ہو گئے۔ لطف فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی شاعری میں اپنے باپ کے شاگرد تھے۔ اردو شاعری کے بارے میں لطف کا اپنا کہنا ہے کہ میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں ۔ان کی تصنیفات کا ذکر ذیل میں دیا جاتا ہے۔

01 ''گلشن ہند'':۔ اس تصنیف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مرزا علی لطف حیدر آباد دکن کے سفر کے ارادے سے نکلے تھے کہ ان کو ڈاکٹر گلکرسٹ نے روک لیا تھا۔ اور فرمائش کر کے ان سے یہ کتاب لکھوائی تھی۔ اس تذکرے کا سنہ تصنیف 1801ء ہے اور اس کا بڑا ماخذ نواب علی ابراہیم خان کی تصنیف ''تذکرہ گلزار ابراہیم'' ہے۔ گو کہ اس میں بہت زیادہ اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ ایک وقت میں نایاب ہو چکا تھا۔ سکسینہ صاحب کہتے ہیں کہ جب حیدر آباد میں طوفان عظیم آیا تو اس تذکرے کی ایک جلد موسیٰ ندی میں بہتی ہوئی جا رہی تھی، اتفاقاً وہ کسی قدر دان کے ہاتھ میں آ گئی اور وہ ایک نہایت ہی نفیس، مفید اور دلچسپ مقدمے کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو کے اہتمام سے شائع ہو گیا ہے۔

13۔ مولوی امانت اللہ شیدا

01 ''جامع الاخلاق'':۔ مولوی امانت اللہ شیؔدا صاحب نے ''اخلاق جلالی'' کا ''جامع الاخلاق'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ کپتان جیمس موئٹ صاحب کے حکم سے 1805ء میں کیا گیا۔ اس کے دیباچے میں کپتان مذکور اور گورنر جنرل مارکوئس آف ولزلی کی نہایت مبالغہ آمیز الفاظ میں تعریف کی گئی ہے۔

02 ''ہدایت الاسلام'':۔ شیؔدا صاحب نے 1804ء میں کتاب ھٰذا عربی و اردو میں تحریر کی اسی کتاب کا ترجمہ خود گلکرسٹ صاحب نے انگریزی زبان میں بھی کیا تھا۔

03 ''صرفِ اردو'':۔ مولوی صاحب موصوف نے 1810ء میں اردو کے صرف و نحو پر ایک منظوم کتاب تحریر کی جو کہ ''صرف اردو'' کے نام سے موسوم ہوئی۔

یورپی محرکین

فورٹ ولیم کالج کے یورپی محرکین میں سے مندرجہ ذیل نام سرفہرست ہیں۔

نمبر	نام محرکین	نمبر	نام محرکین
01	ڈاکٹر جان گلکرسٹ	05	جان شیکسپیئر
02	کپتان جوزف ٹیلر	06	ولیم ٹیٹ
03	گلیڈون	07	ایس۔ڈبلیو۔برٹین
04	کپتان ٹاس روبک	08	جیمس آر بالن ٹائن

01- ڈاکٹر جان گِلکرسٹ

ڈاکٹر جان گلکرسٹ اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے۔1759ء میں اسکاٹ لینڈ کے شہر ایڈنبرا میں پیدا ہوئے۔اسی شہر میں جارج ہیرٹ کی درسگاہ میں تعلیم پائی۔ابتدائی تعلیم کے بعد جارج ہرٹ ہسپتال (George Hariots Hospital) میں طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لے لیا۔20 دسمبر 1778ء سے یکم اگست 1781ء تک وہ شعروشاعری میں محو رہا۔اس کی چودہ نظمیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔

گلکرسٹ 1782ء میں ہندوستان آیا۔یہاں اس کا ذہن بدلا اور اس نے شاعری چھوڑ دی۔اس نے بمبئی میں اردو سے لگاؤ پیدا کرلیا اور دو تین سالوں میں اچھی خاصی دسترس حاصل کرلی۔اس نے اردو زبان کو جاننے کے لیے مختلف شہروں کے سفر کیے۔یہاں کے ماحول سے اجنبیت دور کرنے کے لیے انہوں نے مغربی لباس ترک کر کے شلوار قمیض پہن لی اور داڑھی بھی رکھ لی۔وہ سات سال تک فیض آباد اور غازی پور میں مقیم رہے۔اس کے بعد وہ اپنے طور پر اردو کی تدریس میں مشغول ہوگئے۔1783ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں بحیثیت ڈاکٹر داخل ہوئے۔ابتداء ہی سے ان کا ذہن تھا کہ انگریز افسروں کو فارسی سیکھنے کی اتنی زیادہ ضروت نہیں ہے جتنی زیادہ ضروت ان کو مقامی زبانیں سیکھنے کی ہے بالخصوص انہوں نے ہندی زبان سیکھنے پر زیادہ زور دیا کیونکہ یہ زبان سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔وہ اردو کے علاوہ فارسی، سنسکرت اور دیگر مشرقی زبانوں کے ماہر تھے۔ان کی کامیابی دیکھ کر کمپنی کے دوسرے ملازمین کو بھی اردو سیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔المختصر یہ کہ انگریزوں میں اردو پڑھنے کا رواج اسی دور سے پڑ گیا۔سر ولِزلی جو کہ اس وقت کمپنی کے گورنر جنرل تھے انہوں نے گلکرسٹ کا شوق دیکھتے ہوئے ان کی مالی مدد بھی کی اور ان کو فورٹ ولیم کالج کا افسر اعلیٰ مقرر کردیا۔اس کالج میں کمپنی کے انگریز ملازمین کو دیسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔سر گلکرسٹ تادیر اس کالج میں نہ ٹک سکے، کالج انتظامیہ سے ان بن ہونے کی وجہ سے انہوں نے ملازمت چھوڑنے کی سوچی۔افسران اعلیٰ اور خود کی عزت بحال رکھنے کے لیے کاغذی کاروائی کے طور پر بیماری کا بہانہ بنا کر 1804ء میں استفیٰ دے کر ولایت چلے گئے۔انہوں نے ایڈنبرا میں 1816ء تک قیام کیا اور اس کے بعد لندن چلے گئے۔جہاں وہ انڈین سول سروس کے

امیدواروں کو پرائیویٹ طریقے پر مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتے تھے۔1818ء میں وہ **اورمٹیل انسٹیٹیوٹ** میں زبان اردو کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ یہ انسٹیٹیوٹ اسی سال ایسٹ انڈیا کمپنی نے لندن میں قائم کیا تھا مگر 1825ء میں بند ہوگیا۔اس ادارے کے بند ہونے کے بعد بھی وہ شائقین کو پرائیویٹ طور پر اردو زبان کی تعلیم دیتے رہے۔اپنے بعد بھی وہ اپنی جگہ پر سینڈفورڈ آرنو اور ڈنکن فوربس کو مقرر کر گئے۔ سر گلکرسٹ 1841ء میں پیرس میں 82 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔

گلکرسٹ کے اس کالج میں چار سال کی ملازمت کے عرصے میں فورٹ ولیم کالج نے تقریباً ساٹھ (60) کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں، اور کل 36 مصنفین نے یہ خدمات سرانجام دیں۔اس کے علاوہ خود گلکرسٹ نے چار برسوں میں **تیرہ کتب** تصنیف و تالیف کیں۔ ان کی کتب کی پوری فہرست ڈاکٹر گریرسن نے اپنی مشہور تصنیف ''لینگوسٹک سروے آف انڈیا'' (ہندوستانی زبانوں کے نقشہ جات) کی جلد نہم میں دی ہے ان کی بعض مشہور تصنیفات کے نام یہ ہیں۔

01 ''انگریزی ہندوستانی ڈکشنری'' جو کہ دو حصوں پر مشتمل ہے اور 1793ء میں طبع ہوئی تھی۔

02 ''اورنٹیل لنگوسٹ'' (مشرقی زبان دان) جو زبان اردو کا آسان مقدمہ ہے۔1798ء میں طبع ہوئی تھی۔

03 ''ہندوستانی گرامر'' مطبوعہ 1796ء

04 ''ہندوستانی فلالوجی''

مزید ان کی تصنیفات میں ''ہندی مشقیں''، ''مبادیات ہندوستانی''، ''بیاض ہندی''، ''اتالیق ہندی''، ''انگریزی ہندوستانی مکالمے'' اور ہندی عربی آئینہ شامل ہیں۔اردو کی لسانی صرف و نحو میں گلکرسٹ نے بہت ہی نمایاں کام کیا ہے، جس کے لیے وہ حقیقی داد کے مستحق ہیں۔

گل کرسٹ کی ریٹائرمنٹ کے بعد جیمز موئٹ نے اس کا منصب سنبھالا۔موئٹ کے بعد ولیم ٹیلر ہندوستانی شعبے کے صدر مقرر ہوئے۔ سر گلکرسٹ کی ریٹائرمنٹ کے بعد کے حالات آگے تفصیل سے دیئے جائیں گے۔

02- کپتان جوزف ٹیلر

انہوں نے ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی شرکت میں **انگریزی اردو کی ایک لغت** مرتب کی جو 1808ء میں کلکتہ میں چھپی۔

03- گلیڈون

انہوں نے **اردو فارسی کی مفید لغت** ترتیب دی جو 1809ء میں کلکتہ میں شائع ہوئی۔

04- کپتان ٹاس روبک

انہوں نے جان گلکرسٹ کو **ہندوستانی لغت** کی تدوین میں مدد دی۔اس کے علاوہ **فرہنگ جہازرانی** کے نام سے ایک کتاب لکھی جو 1811ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔**اردو قواعد** پر بھی ان کی ایک کتاب **''ترجمان ہندوستان''** قابل ذکر ہے، جو 1824ء میں لندن سے چھپ کر شائع ہوئی۔

05- جان شیکسپیئر

انہوں نے **اردو لغت** اور **منتخبات ہندی** دو جلدوں میں مراتب کی۔ اردو لغت 1813ء میں چھپی اور منتخبات ہندی پہلی مرتبہ 1818ء میں لندن میں چھپی تھی۔

06- ولیم ٹیٹ

انہوں نے بھی اردو سے بہت دلچسپی لی۔ ایک کتاب **''مقدمہ زبان ہندوستانی''** مرتب کی جو 1827ء میں بمقام کلکتہ طبع ہوئی۔

07- ایس ۔ ڈبلیو ۔ برٹین

اردو زبان میں اچھی قابلیت بہم پہنچائی پھر ایک کتاب **''خود آموز قواعد زبان ہندوستانی''** مرتب کی جو 1831ء میں لندن میں شائع ہوئی تھی۔

08- جیمس آر بالن ٹائن

یہ بھی ایک **ہندوستانی قواعد** کے مرتب ہیں۔ ان قواعد کی تصنیف 1824ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔

04- گِلکرسٹ کی ریٹا ئرمنٹ کے بعد کالج کی علمی و ادبی کارکردگی کا جائزہ:

سر گلکرسٹ نے 1803ء کے اجلاس میں اپنا استعفیٰ پیش کرنے کی بات کی اور صحت کی خرابی اس کی وجہ بتائی۔ اس پر سر لارڈ ولزلی نے ہندوستانی شعبے کی ضرورت کے لیے گلکرسٹ کو رکنے کے لیے کہا اور انہوں نے ولزلی کی بات مان لی مگر 1804ء میں اچانک اس نے استعفیٰ پیش کر دیا۔ مورخین کی اکثریت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ صحت کی خرابی محض ایک بہانہ تھا اصل وجہ یہ تھی کہ گلکرسٹ کو اس کی خدمات کے عوض وہ داد و تحسین نہ دی گئی جس کے کہ وہ مستحق تھے۔ اسی وجہ سے دل برخاستہ ہو کر انہوں نے اس ملازمت کو جاتا کیا۔ تاہم وجہ جو بھی ہو 1804ء میں ان کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا اور ان کی خدمات کو بہت سراہا گیا۔ گلکرسٹ کی ریٹائرمنٹ کے بعد جیمز موئٹ نے اس کا منصب سنبھالا۔ موئٹ کے بعد ولیم ٹیلر ہندوستانی شعبے کے صدر مقرر ہوئے۔ جہاں تک کالج کے نظم و نسق اور دیگر امور کا تعلق ہے، ٹیلر کے عہد میں کئی تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔

اردو ہندی تنازعہ کی بنیاد

ٹیلر کے دور میں ایک مصیبت یہ ہوئی کہ انہوں نے خود اُردُو، ہندی تنازعہ پیدا کر دیا۔ انہوں نے اردو اور ہندی کو الگ الگ زبان تصور کرنے کی تحریک شروع کر دی۔ 1812ء میں تعلیم کا معیار گرتا ہوا دیکھ کر کالج کونسل نے گورنر جنرل کے ایما سے پروفیسروں اور ممتحنوں سے اس کا سبب دریافت کیا۔ اس پر ٹیلر نے یہ جواب لکھ کر بھیجا۔

''آپ نے کالج کے معیار تعلیم میں انحطاط کی وجہ دریافت کی ہے۔ اس کے متعلق میری گزارش ہے اور میں پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہندوستانی کی تعلیم میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن میں صرف ہندوستانی یا ریختہ کا ذکر کر رہا ہوں جو فارسی رسم الخط

میں لکھی جاتی ہے اور جسے پڑھانے کی میری ذمہ داری ہے۔ میں ہندی کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس کا اپنا رسم الخط ہے یا اس زبان کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس میں عربی فارسی لفظوں کا استعمال نہیں ہوتا اور جو مسلمانوں کی یورش و یلغار سے قبل ہندوستان کے پورے شمال مشرقی حصے یا صوبے کی زبان تھی اور اب بھی وہاں کے قدیم ہندو باشندوں میں رائج و مستعمل ہے۔ اس عریض وسیع صوبے میں جہاں اب تک بولی جاتی ہے، اس کے دیرینہ وجود کی خاص اہمیت ہے۔ میں نے کالج میں اس (ہندوستانی) کی تعلیم کی توسیع و ترقی میں مقدور بھر کوشش کی ہے، جس کی وجہ سے میری صحت خراب ہوگئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آخیر میں نے اس بات کا احساس کیا کہ مجھے اپنے محدود زرائع اور درجہ میں طلباء کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے صرف ہندوستانی کی تعلیم اور درس و تدریس تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ ہندی اور ہندوستانی میں ہندوستانی کی ہی زیادہ اہمیت ہے، اس نقطہ نظر سے تعلیم کا زوال ضرور ہوا ہے۔''

بس! مسٹر ٹیلر نے اپنی پھٹتی سے رسم الخط کے اختلاف کو زبان کی علیحدگی کا بہانا کیا بنایا کہ ہندوستان میں اردو ہندی تنازعہ کی بنیاد پڑ گئی۔ اور اس سے اردو ہندی تنازعہ کے بانی ٹیلر ہی کو قرار پائے۔ حالانکہ اس سے قبل ان دونوں زبانوں کے لیے صرف ہندوستانی کا لفظ استعمال ہوتا تھا، اور رسم الخط کی حیثیت محض ثانوی تھی۔ مثلاً: مسکین کے مرثیے، اخلاق ہندی، شکنتلا ناٹک وغیرہ پہلے ناگری رسم الخط میں شائع ہوئے تھے جبکہ ان سب کی زبان ہندی نہیں اُردو اور صرف اُردُو ہے۔

05-فورٹ ولیم کالج (انسائیکلو پیڈیا:)

بنائے فورٹ ولیم کالج کلکتہ

فورٹ ولیم کالج کے اصل محرک ڈاکٹر جان گلکرسٹ ہیں۔ انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل سر لارڈ ولزلی کو تجویز پیش کی کہ فارسی میں مالی حساب رکھنے والے ملازمین کو ہندوستان کی مقامی زبانیں سکھائی جائیں۔ اور سر گلکرسٹ نے خود یہ ہامی بھری کہ ہندوستانی زبانوں کی تعلیم میں خود دیا کروں گا۔ ولزلی نے اس تجویز کو اپنی کونسل میں پیش کیا اور کونسل نے 21 دسمبر 1798ء کو یہ تجویز منظور کر لی کہ بنگال میں کمپنی کی حکومت کی کامیابی کے لیے یکم 1801ء کے بعد اہم عہدوں پر صرف وہی لوگ متعین ہوں گے جو گورنر کے منظور شدہ قانون کے مطابق ملک کی ایک یا ایک سے زائد زبانوں سے اچھی طرح واقف ہوں گے، چنانچہ یکم جنوری 1799ء کو اس منصوبے کو عملی شکل دی گئی۔ 24 دسمبر 1798ء کو گلکرسٹ کو تقرری کا پروانہ ملا اور 25 دسمبر 1798ء کو انہوں نے باقاعدہ طور پر تدریس کی ذمہ داری قبول کر لی۔ رائٹرس بلڈنگ کے ایک کمرہ میں تدریس کا انتظام کیا گیا۔ اس ادارے کو 'گلکرسٹ کا مدرسہ' یا 'مدرسہ ہندی' کے علاوہ 'اورینٹل سمنری' کا نام دیا گیا۔ 29 جنوری 1799ء کو انہیں 31 طلباء کی ایک لسٹ موصول ہوئی اور فروری 1799ء کے اوائل میں تدریس کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔ جنوری 1800ء میں طلباء کے امتحان کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ جس کے سیکریٹری گلکرسٹ تھے۔ اس امتحان میں طلباء نے نمایا کامیابی حاصل کی۔

سر لارڈ ولزلی اس مدرسے کو کالج کی شکل دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے 9 جولائی 1800ء کو کونسل کے سامنے کالج کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اور کونسل کے اراکین کو اپنا ہم نوا بنا کر اس منصوبے کو ڈائریکٹرول کی منظوری کے لیے بھجوا دیا۔ ابھی ڈائریکٹروں کی منظوری نہ ہوئی تھی کہ لارڈ ولزلی نے 10 جولائی 1800ء کو کالج کی باقاعدہ بنیاد رکھ دی۔ کالج کا پہلا دستور بھی اسی روز مرتب کیا گیا۔ لیکن گورنر کے حکم خاص

سے قانونی دستاویز پر کالج کے قیام کی تاریخ 4 مئی 1800ء درج کی گئی۔ اور یہ کالج فورٹ ولیم کے نام سے مشہور ہوا۔

کالج کے قیام کی مخالفت :

چونکہ لارڈ ولزلی نے ڈائریکٹرز کی اجازت سے بیشتر ہی کالج کی بنیاد رکھ دی تھی اور جب کالج کا کام شروع ہو چکا تھا تو ڈائریکٹرز کی طرف سے کالج کی تجویز کے نامنظور ہونے کا ایک پروانہ گورنر جنرل کو موصول ہوا۔ ان ڈائریکٹرز نے مارچ 1801ء میں قرار دیا کہ:

''گورنر جنرل کی تجاویز پر کسی قسم کی بحث کیے بغیر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کمپنی کی موجودہ حالت کے پیش نظر ان تجاویز کو روبہ عمل لانا بس کے باہر کی چیز ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لہٰذا اس خط کے موصول ہوتے ہی کالج سے متعلق جتنے اخراجات ہوں، فوراً بند کر دیئے جائیں اور ساتھ ہی دیگر علاقوں سے بلائے گئے طلباء جلد سے واپش بھیج دیئے جائیں۔''

ڈائریکٹرز کے علاوہ کورٹ نے بھی اس کالج کی مخالفت کی۔ ولزلی نے کورٹ کے حکم کی تعمیل میں 24 جون 1802ء کو کالج توڑنے کی ہدایت جاری کر دی۔ لیکن اپنے اختیار خاص سے سلسلہ تعلیم کے اختتام کی قطعی تاریخ ملتوی رکھی۔ اب ولزلی نے رائٹ آف آنریبل دی ارل آف ڈارٹ متھ اور بورڈ آف کنٹرول کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ اس معاملے کو پارلیمنٹ میں لے جانے کی دھمکی دی گئی اس پر ڈائریکٹرز اور کورٹ نے کالج کے معاملے میں نرمی اختیار کی۔ 2 ستمبر 1803ء کو ڈائریکٹرز نے ایک مراسلے کے ذریعے کالج کو بدستور قائم رکھنے کا فیصلہ صادر کیا۔ کالج کے قیام کے ضمن میں ولزلی پر الزامات عائد کیے گئے جن میں کورٹ کی حکم عدولی، ملازمین کی غیر قانونی تقرری، قانون کی خلاف ورزی اور عوام کے سرمائے کا بے جا مصرف جیسے الزامات شامل تھے۔ اس پر ولزلی 15 اگست 1805ء کو مستعفی ہو کر انگلینڈ چلا گیا۔

1803ء میں گلکرسٹ مستعفی ہو کر انگلینڈ واپس چلا گیا اور اس کی جگہ جیمس موئٹ ہندوستانی شعبے کے صدر اور پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1806ء میں کالج کا دوسرا دستور مرتب ہوا۔ اس کے بعد اس کالج کی حیثیت صرف **بنگال سول سرونٹس** کی کے لیے صرف ایک سمنری کی رہ گئی۔ جیمس موئٹ 1808ء تک اپنے عہدے پر رہے اس کے بعد وہ بھی مستعفی ہو گئے۔ ان کے بعد سر ولیم ٹیلر 1823ء تک اس عہدے پر اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کے بعد ولیم پرائس 1831ء تک کام کرتے رہے۔

کالج کی عمارت

اس کالج کی عمارت کے سلسلہ میں اس کالج کے دستور میں کہا گیا تھا کہ:

''ایک موزوں مناسب عمارت کالج کے لیے تعمیر کی جائے، جو حکام بالا کے لیے ایک کتاب خانے کے لیے اور ایسے دوسرے مقاصد کے لیے، جو ضروری سمجھے جائیں دو کمروں پر مشتمل ہوگی۔''

لارڈ ولزلی کا خیال تھا کہ کالج کا احاطہ ایسا ہونا چاہئے جہاں 500 طلباء، سارے اساتذہ، ایک پبلک ہال، ایک کتب خانہ اور گرجا گھر کے لیے جگہ ہو۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے گارڈن ریچ جو فورٹ ولیم کی دوسری جانب واقع تھا، کا انتخاب کیا۔ لیکن ان کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑی عمارت اور پانچ دوسری عمارتیں جو غالباً لال بازار اور چیت پور کے قریب تھیں خریدی گئیں۔ بڑی عمارت طلباء کی طعام گاہ کے طور پر اور دوسری عمارتیں طلباء کی تعلیم و تدریس کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔

کالج کمیٹی

فورٹ ولیم کالج کے انتظامی اور تعلیمی امور کی دیکھ بھال کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی۔اس کمیٹی میں 18 ستمبر 1800ء کے علان کے مطابق پادری رورنڈ ڈیوڈ براؤن، پادری رونڈ کلوڈِیَس بکےنن، جارج ہلے روبارلو، این بی ایڈمونس ٹن اور ولیم کرک پیٹرک شامل تھے۔

پروفیسرز، معلمین اور منشی

18 اگست 1800ء کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں سات پروفیسرز کی تقرریوں کا اعلان ہوا، جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

جان بیلی	ولیم کرک پیٹرک	فرانسس گلیڈون	ایڈمونسٹن
ڈاکٹر گلکرسٹ	جارج ہلے روبارلو	ریورنڈ بکےنن	------

سنسکراور بنگالی کے معلم ولیم کیری، ریاضیات کے معلم جیمس ڈنوڈی، جدید زبانوں کے معلم ڈیوی پلے سی، فارسی کے مددگار معلم لس ڈن اوراور قانون کے معلم بارنگٹن تھے۔

پروفیسرز اور معلمین کے عہدے صرف یورپی عالموں کے لیے مخصوص تھے۔ ہندوستانیوں کے لیے صرف ہیڈ منشی، نائب منشی، مترجمین اور سرٹیفکیٹ منشی کی آسامیاں وضع کی گئی تھیں۔4 مئی 1801ء کو ہیڈ منشی، سیکنڈ منشی اور منشیوں کا تقرر عمل میں آیا۔میر بہادر علی حسینی ہیڈ منشی اور تارنی چرن متر سیکنڈ منشی مقرر ہوئے۔منشیوں میں مرتضٰی خان، غلام اکبر، نصر اللہ، میر امن، غلام اشرف، ہلال الدین، محمد صادق، رحمت اللہ خان، غلام غوث، کندن لعل، کاشی راج اور میر حیدر بخش شامل تھے۔ان میں سے محمد صادق، رحمت اللہ خان، کاشی راج اور غلام غوث نے اسی سال استعفیٰ دے دیا یا انہیں برطرف کر دیا گیا۔ان کی جگہ سید جعفر، محمد تقی، مبارک محی الدین اور اسد علی خان کا تقرر ہوا۔

نصاب تعلیم

فورٹ ولیم کالج میں ادبیات، سائنس اور جنرل نالج کی تعلیم کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی۔اس ضمن میں کالج کے دستور میں کہا گیا تھا کہ:

''فورٹ ولیم بنگال میں ایک کالج قائم کیا جاتا ہے، تاکہ کمپنی کے جونیئر سول ملازمین کو ادبیات، سائنس اور برطانوی مقبوضات کے انتظام حکومت سے متعلق مختلف عہدوں کے فرائض کی انجام دہی کے لیے درکار لیاقتوں کی تحصیل میں ضروری باور کیے جائیں۔''

کالج کے دستور میں قوانین کی تعلیم کے ضمن میں محمڈن لاء ، ہندو لاء، اخلاقیات سول فلسفہ قانون اور قانون بین الاقوام اور انگلش لاء پڑھانے کی سفارش کی گئی۔سائنسی علوم میں نیچرل ہسٹری (تاریخ طبعی)، نباتات، کیمیا اور علم ہیئت شامل تھے۔علاوہ ازایں اقتصادیات، پولی ٹیکنیکل اکانومی، جغرافیہ، ریاضیات اور بالخصوص ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی ادارات ومفادات کا مطالعہ شامل تھا۔

اس کالج میں عربی، فارسی، ہندوستانی، بنگالی، تلنگی، مرہٹی، تامل اور کنٹر زبانوں میں تعلیم دینے کی سفارش کی گئی تھی۔اس کے علاوہ یونانی، لاطینی اور انگریزی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تھا۔

اردو کی تصنیفات اور ادب میں کالج کا کردار

اس کالج نے اردو زبان کو اس طرح فروغ دیا کہ زبان فارسی جو کہ ایک دراز عرصہ سے اس خطے کی مایہ ناز زبان سمجھی جاتی تھی کل تیس، پینتیس سال کی مدت میں اردو نے اس کو مات دے کر خود اس کی جگہ لے لی اور یہی اردو ہی اس خطے کی قومی زبان قرار پائی۔

ڈاکٹر انور سدیدؒ لکھتے ہیں کہ:

''فورٹ ولیم کالج میں اردو کی تین روئیں بیک وقت رواں تھیں۔ان میں ایک رو فارسی اور عربی مزاج کی اور دوسری خالص ہندی مزاج کی تھی۔تیسری رو جو زیادہ کامیاب ہوئی، وہ ہندی، عربی، فارسی، مقامی زبانوں اور روزمرہ کے امتزاج سے مرتب ہوئی۔فورٹ ولیم کالج نے موخر الذکر رو کو متحرک رکھنے کی کوشش کی اور اسی کی بدولت فورٹ ولیم کالج کو تحریک کا درجہ حاصل ہوا۔''

فورٹ ولیم کالج کی تحریک جس نثر کو فروغ دینے کی داعی تھی، اس کا اصلی پرتو میر امن، حیدری، افسوس اور دلاور کی نثر میں سامنے آیا۔ اس نثر میں قاری کو گرفت میں لینے اور اس پر ابلاغ کے تمام دروازے کشادہ کرنے کی اہلیت چونکہ زیادہ تھی، اس لیے اسے زندہ نثر کا عنوان دیا گیا اور اسی نے آئندہ زمانے میں مختلف اسالیب بیان کو جنم دیا۔

فورٹ ولیم کالج کی زندگی میں کالج کے اندر اور باہر تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں تصنیف ہوئیں۔1913ء میں لاکٹ نے کتابوں کی جو تفصیل کالج کونسل کو بھیجی تھی اس میں نو اسی مطبوعہ کتابوں کے نام درج ہیں۔پروفیسر سمیع اللہ نے اپنی کتاب **''انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے''** میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے تالیف ہونے والی 147 کتابوں کے نام درج کیے ہیں جن میں 94 تصانیف مطبوعہ اور 53 غیر مطبوعہ دکھائی گئی ہیں۔ان میں سے زیادہ تر کتابیں اردو رسم الخط میں ہیں، بعض کتابیں رومن اور ناگری رسم الخط میں بھی موجود ہیں۔اس کالج میں کچھ ایشیائی اور کچھ یورپی مصنفین شامل تھے جن کا ذکر پیچھے کیا جا چکا ہے۔ان کتابوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

01- قوائد زبان کی کتب

02- داستان ادب کی کتب

03- علوم وفنون کی کتب

کالج کی کتب کے علاوہ خدمات

01- اردو ٹائپ کا پہلا مطبع اسی کالج کی طرف سے قائم کیا گیا اور بعض کتابیں خاص حسن خوبی کے ساتھ شائع کی گئیں۔

02- بیرون کالج کی تصنیف، زبان ومحاورہ کی سلاست اور اسلوب بیان کی دلکشی میں خاص توجہ دی گئی۔

03- اس کالج نے سلیس نثر نگاری کی شاہراہ قائم کر دی۔اگر یہ محکمہ جاری نہ ہوتا تو بھی ارباب علم اس راستے پر آتے لیکن دیر لگتی۔ان کتابوں کے موجود ہونے پر بھی لوگوں نے اس طرف کم توجہ دی اور بہت آہستہ آہستہ اس راہ پر آئے۔

04- کالج کے منتظموں نے سلیس نثر نگاری کا مقصد متعین کرنے کا کام شروع کیا۔لہٰذا یہ پہلا علمی وادبی ادارہ یا ندوہ تھا۔

المختصر فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام چھپنے والی کتابوں پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قواعد ولغت، تاریخ وتذکرہ، مذہب واخلاق اور قصے کہانیوں کی کتابوں نے اردو کو مالا مال کر دیا۔ سیاست، تاریخ اور مذہبی تعلیمات اور جغرافیہ جیسے سنجیدہ موضوعات پر پہلی مرتبہ قدم اٹھایا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کا خاتمہ

11 اکتوبر 1853ء کو **لارڈ ڈلہوزی** نے اس کالج کو ختم کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

''میں فورٹ ولیم کالج کا نام مکمل طور پر اور فوراً مٹا دینا چاہتا ہوں۔ اس کی جگہ میرا خیال دوسرا ادارہ قائم کرنے کا ہے۔''

یہ مسئلہ ہندوستانی گورنمنٹ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کی سپریم کونسل میں پیش ہوا، جس میں لارڈ ڈلہوزی گورنر کی حیثیت سے موجود تھے۔ سپریم کونسل نے لارڈ ڈلہوزی کی رائے سے اتفاق کیا۔ باالآخر لارڈ ڈلہوزی نے 24 جنوری 1854ء کو باقاعدہ طور پر فورٹ ولیم کالج توڑنے کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن اس کے امتحانات 1858ء تک اس کے مقررہ نصاب کے طریقے پر ہوتے رہے۔ اس کالج کی مجموعی عمر 53 سال 6 ماہ اور 54 دن ہے۔

1830ء میں فورٹ ولیم کالج سے پروفیسروں، اسسٹنٹ پروفیسروں، منشیوں اور پنڈتوں کے عہدے ختم کر دیئے گئے۔ اور مستقبل میں ایک سیکریٹری اور دو **ممتحنوں** کی مدد سے موجودہ نظم ونسق برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ایک تو سر لارڈ ولزلی ریٹائر ہو چکے تھے اور ساتھ ہی انگلستان میں **''ہیل بری کالج''** کے نام سے ایک کالج قائم ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فورٹ ولیم کالج رو بہ زوال ہو چکا تھا۔ 1830ء میں پروفیسروں وغیرہ کے عہدے ختم ہونے کے بعد اس کی حیثیت برائے نام رہ گئی تھی۔ تاہم 1854ء تک کسی نہ کسی طرح یہ سانس لیتا رہا۔ اور اس کے امتحانات 1858ء تک اس کے مقررہ نصاب کے طریقے پر ہوتے رہے۔

06- خلاصہ

01	**لارڈ ولزلی** نے **1799**ء میں کلکتہ میں ایک اسکول قائم کیا، جو کہ چند مخصوص ضروریات کے تحت **10** جولائی **1800**ء کو ایک کالج کی شکل اختیار کر گیا اور **06** فروری **1801**ء کو اس میں باقاعدہ تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔
02	اس کالج کے قیام کے سیاسی مقاصد بھی تھے اور یہ بھی تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو اپنی فراخ دلی اور فیاضی کی جھلک دکھانا چاہتی تھی۔ بعض مورخین کے خیال میں اس کالج کا قیام عوام الناس کی فلاح و بہبود کا جذبہ تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انگریز ہندوستان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے اسی لیے انہوں نے اپنے کاروباریوں اور فوجیوں کو یہاں کی زبان سکھانے کی غرض سے یہ کالج قائم کیا۔
03	اس کالج کے اصل محرک **ڈاکٹر جان گل کرسٹ** تھے۔ جنہوں نے اردو کے فروغ اور ترقی کے لیے بے شمار خدمات سرانجام دیں۔ انہوں خود بھی اردو کی کتابیں لکھیں اور کئی مصنفین اکھٹے کیے ان کی تصانیف شائع کیں اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔
04	اس کالج کے مشرقی مصنفین میں میر امّن دہلوی، میر بہادر علی حسینی، سید حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوانؔ، شیر علی افسوسؔ، مظہر علی وِلاؔ، خلیل علی خان اشکؔ، امانت اللہ شیداؔ، للولال کوی، مولوی اکرام علی، میر بخش علی، اور دیگر بہت سے حضرات شامل ہیں۔
05	اس کالج کے یورپی مصنفین میں گل کرسٹ، کپتان جوزف ٹیلر، گلیڈ ون، کپتان ٹاس روبک، جان شیکسپیئر، ولیم ٹیٹ، ایس۔ ڈبلیو۔ برٹین، جیمس آر بالن ٹائن وغیرہ شامل تھے۔
06	ایک دن ایسا بھی آیا کہ جب ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی کالج کی انتظامیہ سے نہ بن پائی اور ریٹائرمنٹ لے کر انگلینڈ واپس چلے گئے۔
07	گل کرسٹ کی ریٹائرمنٹ کے بعد موئٹ اور پھر ٹیلر نے منصب سنبھالا، ٹیلر نے اردو ہندی تنازعہ پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔
08	بالآخر لارڈ ڈلہوزی نے 24 جنوری 1854ء کو اس کالج کو ختم کر دیا۔ یوں یہ کالج تقریباً 54-53 سال تک قائم رہا۔
09	فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر میں اعلیٰ سطح کی ادبی و علمی تصانیف کا اہتمام کیا۔ اور اردو کی نثری ترقی کی نئی داستان رقم کی۔

اُردُو لغت بورڈ کراچی (سابق ترقی اُردُو بورڈ)

اُردُو لغت بورڈ (سابق ترقی اردو بورڈ) ۱۹۵۸ء میں قائم ہوا۔اس کا قیام وزارت تعلیمات، حکومتِ پاکستان کی ایک قرارداد مورخہ ۱۴ جون ۱۹۵۸ء کے ذریعے عمل میں آیا جس میں درج تھا کہ یہ ادارہ اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری (کلاں) کی نہج پر اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین انجام دے گا جو حکومت پاکستان اسے تفویض کرے۔اس قرارداد میں بورڈ کے ارکان مندرجہ ذیل تھے۔

۱ ۔ ڈاکٹر ممتاز حسن۔سیکرٹری وزارت مالیات، حکومت پاکستان۔

۲ ۔ ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ صاحبہ۔

۳ ۔ عترت حسین زبیری۔وزارت تعلیمات، حکومت پاکستان۔

۴ ۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔صدر انجمن ترقی اردو (اعزازی مدیر اعلیٰ اردو لغت)

۵ ۔ جوش ملیح آبادی (مشیرِ اَدبی و مدیر لغت)۔

۶ ۔ ڈاکٹر محمد شہید اللہ۔صدر شعبہ بنگالی، راجشاہی یونیورسٹی۔

۷ ۔ رازق الخیری۔مدیر عصمت، کراچی۔

۸ ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔صدر شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی۔

۹ ۔ شان الحق حقی۔وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت پاکستان۔

۱۰ ۔ پیر حسام الدین راشدی۔سندھی ادبی بورڈ۔

۱۱ ۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ۔پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور۔

۱۲ ۔ عبدالحفیظ کاردار

ابتدائی دو سال دفتر کے لیے عمارت کے حصول کے علاوہ مختلف شعبوں کے لیے عملے، مدیروں، نائب مدیروں اور معاون مدیروں کے تقرر اور دوسرے ضروری انتظامات میں صرف ہوئے، اس سلسلے میں سب سے پہلی ضرورت اردو کی ایک جامع لائبریری کا قیام تھا جس میں اردو ادب کا کامل ذخیرہ، اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی اور دیگر زبانوں کی مختلف لغات کے علاوہ کتب استناد اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں موجود ہوں۔جب کام کا آغاز ہوا تو بورڈ کے پاس ایک بھی کتاب

نہیں تھی، اب بفضل تعالیٰ یہاں ایک نادر کتب خانہ موجود ہے جو بورڈ نے اپنے محدود وسائل سے کام لے کر رفتہ رفتہ بڑی تلاش اور کوشش سے فراہم کیا ہے، اس میں بعض نایاب کتب اور قلمی نسخوں کے فائیکر و فلم بھی شامل ہیں جو انڈیا آفس لائبریری (لندن میوزیم) سے حاصل کر کے اُس دور میں فوٹو پرنٹ بنوائے گئے تھے، اُس وقت تک فوٹو اسٹیٹ متعارف نہیں ہوا تھا۔

کتب خانے کے قیام کے ساتھ اردو لغت کی تدوین کا کام بھی شروع ہو گیا اور سال بہ سال لغت کی ایک جلد کی تدوین مکمل ہوتی رہی۔ ۱۹۶۰ء ہی میں بورڈ نے اپنا سہ ماہی مجلّہ اردو نامہ جاری کیا جس کے مدیر جناب جوش ملیح آبادی اور جناب شان الحق حقی رہے اور مجلس ادارت میں بورڈ کے بعض دوسرے اصحاب بھی شامل تھے۔ اردو نامہ ایک ممتاز علمی جریدہ شمار ہوتا ہے جو بیشتر لسانی مباحث سے تعلق رکھتا تھا اور اس لحاظ سے اردو صحافت کی تاریخ میں اسے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ مجلّہ مسلسل سترہ سال تک یعنی ۱۹۷۷ء تک جاری رہا اس کے کل ۵۴ شمارے منظر عام پر آئے۔ اس رسالے کا ایک اشاریہ بھی بورڈ نے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا ہے اور اب دسمبر ۲۰۱۶ء میں سید عقیل عباس جعفری نے بحیثیت مدیر اعلیٰ اردو لغت بورڈ کا انتظام سنبھالنے کے بعد اردو نامہ کے از سرِ نو اجراء کے لیے کوششیں شروع کی ہیں اور ضابطے کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد عنقریب اس وقیع جریدے کی دوبارہ اشاعت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

۱۹۷۵ء میں جب اردو لغت کی پہلی جلد کی طباعت کا مرحلہ درپیش ہوا تو بورڈ نے محیط اردو پریس کے نام سے اپنا ایک پریس قائم کیا اور اسی پریس سے ہی اردو لغت کی بائیس جلدیں شائع ہوئیں ہیں۔ ہر جلد بڑے سائز (9x11/1) کے ہزار ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحے پر دو کالم ہیں اور ہر کالم میں ۵۰ سطریں ہیں۔

یہ پریس اب بھی بھرپور انداز سے فعال ہے اور لغت کے سیٹ میں سے کم جلدوں کو پورا کرنے کے لیے فروخت شدہ جلدوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے جس میں سید عقیل عباس جعفری کی بحیثیت مدیر اعلیٰ تعیناتی کے بعد مزید تیزی آئی ہے۔

۱۹۹۰ء تک اردو لغت بورڈ وفاقی حکومت کے خودمختار ادارے کی حیثیت سے خدمت سرانجام دیتا رہا اس عرصے میں بورڈ میں ایک ادارتی مشاورت کمیٹی ہمیشہ رہی ہے جس کام بورڈ کے منصوبوں کا جائزہ لینا اور فیصلوں کے مطابق ہدایات جاری کر کے عمل درآمد کرانا ہوتا تھا۔ اس لیے سب سے پہلے اس کمیٹی نے اردو لغت کے مجوزہ منصوبے کے اصول ترتیب و تسوید وضع کیے۔ یہ ضابطہ فل اسکیپ سائز کے ۲۴ صفحات پر طبع ہوا ہے جس کی روشنی میں عملہ ادارت نے لغت کی تدوین کا انجام دیا ہے۔ تیار شدہ مسودات پر نظر ثانی کا کام بھی یہ کمیٹی انجام دیتی تھی۔ اس مجلس کے اعزازی ارکان پاکستان کے مختلف شہروں سے ان کی علمی لیاقت اور تجربہ کی بنیاد پر منتخب کیے جاتے تھے۔ اس مجلس میں مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور مجنوں گورکھ پوری وغیرہ جیسے قابل ذکر نام شامل رہے۔

بورڈ کا دفتر ۱۹۵۸ء سے ۱۹۸۴ء تک شہر کے مختلف علاقوں میں کرائے کی عمارتوں میں کام انجام دیتا رہا۔ ۱۹۸۴ء سے یہ دفتر اپنی ذاتی عمارت واقع گلشن اقبال (نیپا چورنگی) میں واقع ہے۔ یہ کام بورڈ کے سابق صدر جناب محمد اظفر صاحب کی ذاتی کوشش اور وفاقی وزارت تعلیمات کی خصوصی اعانت کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ اس وقت بورڈ کا دفتر انتظامی طور پر ان شعبوں میں منقسم ہے۔

۱ ۔ شعبۂ انتظامیہ

۲ ۔ کتب خانہ

۳ ۔ طباعت و کمپوزنگ

۴ ۔ شعبۂ ادارت

لغت نگاری ایک بہت ہی مشکل فن اور کٹھن کام ہے، اس میں بہت تحقیق اور چھان بین کی جاتی ہے جو بہت پِتّہ ماری کا کام ہے۔ اس کام کا خشک پن، اکتاہٹ اور بیزاری پیدا کرتا ہے۔ اس کام کے لیے ایک خاص ذہن اور صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اردو ڈکشنری بورڈ میں اردو لغت کے جس منصوبہ پر تاریخی اصولوں پر کام مکمل ہوا یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد عظیم منصوبہ ہے جس کی مثال دنیا کی صرف دو زبانوں میں ملتی ہے۔ ایک آکسفورڈ انگلش ڈکشنری جس کی ستر برس میں ۱۳ جلدیں شائع ہوئی تھیں اور دوسری مثال جرمن اکیڈمی آف سائنس ان برلن اور انسٹیٹیوٹ گوٹن گن کے زیر نگرانی جرمن زبان میں ۱۶ جلدوں پر مشتمل (۳۲ حصوں میں) ۱۹۶۱ء میں یہ کام انجام پایا۔ اب (تاریخی اصول پر) اردو لغت کی بائیس جلدوں میں تکمیل کے باعث اردو کو دنیا کی تیسری زبان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

سب سے پہلا مرحلہ منتخب کتابوں کا مطالعہ اور ان میں سے الفاظ اور اسناد کا اخذ کرنا تھا۔ اس کام میں بورڈ کے مختصر عملے کے علاوہ چار پانچ سو بیرونی معاونین نے بھی اعزازی یا نیم اعزازی طور پر شرکت کی۔ مطالعہ کتب قدیم دکنی دور سے لے کر زمانۂ حال کی تصنیفات و تالیفات پر محیط تھا۔ اس میں دور حاضر کے پاکستانی مصنفین کی نگارشات بھی شامل ہیں۔ سند اور معیار کے بارے میں ادارے نے وسعت نظر سے کام لیا ہے اور اسے مقام یا علاقے تک محدود نہیں رکھا۔ مطالعہ کرنے والوں میں پورے پاکستان (بشمول سابق مشرقی پاکستان) سے مختلف جگہ کے لوگوں کو شریک کیا گیا تا کہ یہ عظیم و ضخیم لسانی تالیف صحیح معنی میں ایک قومی کارنامہ قرار پا سکے۔

مطالعۂ کتب کے بعد فراہمی اسناد کا مرحلہ آتا ہے یعنی مطالعہ کتب سے اخذ کردہ الفاظ و اسناد کو انڈکس کارڈوں پر الگ الگ تحریر میں لانا اور پھر ان کارڈوں کو حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دینا جو بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے کیوں کہ اردو لغت

میں الفاظ کی ترتیب جدید لسانی اُصولوں پر رکھی گئی ہے یعنی: ا، آ، ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ۔۔۔۔۔۔و، ہ، ء، ی اور ے۔ اسناد کارڈوں کا یہ ذخیرہ اب تقریباً بیس لاکھ کارڈوں پر مشتمل ہے۔ اردو لغت میں مدرج **ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ کے معنی** کی تائید اور شہادت میں یہ تمام اسناد استعمال کی گئی ہیں۔

فراہمی اسناد کے بعد لغت کی تدوین کا اہم مرحلہ آتا ہے۔ اس مرحلے پر ہر لفظ کا اندارج ایک بڑے تشریح کارڈ پر ہوتا ہے۔ لفظ کے اندراج کے بعد اس کا تلفظ، اعراب مکتوبی اور بریکٹ میں اعراب ملفوظی کے ذریعے بتایا جاتا ہے پھر قواعد کی حیثیت (اسم، ضمیر، صفت، فعل، حرف، متعلق فعل، فقرہ، محاورہ، روزمرہ، بول چال۔ مقولہ، کہاوت، فجائیہ، حکایت اور الصوت وغیرہ) مع تذکیر تانیث درج کی جاتی ہے۔ اس کے بعد معنی کی تقسیم ہوتی ہے اور لفظ کے مترادفات دینے کے بجائے ہر معنی کی جامع تشریح معہ اسناد اور حوالوں کے درج کی جاتی ہے۔ اس میں ایک معنی کے لیے جو اسناد درج کی جاتی ہیں ان کے تین تاریخی دور قائم کیے گئے ہیں:

پہلا دور ولی دکنی پر ختم ہوتا ہے۔ (ابتداء تا ۱۷۰۰ء تک)۔

دوسرا دور ولی سے غالبؔ تک (۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک)۔

تیسرا دور غالبؔ سے آج تک (۱۸۵۷ء سے اب تک)۔

اس طرح تاریخی طور پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کسی لفظ کے یہ معنی پہلی بار کب رائج ہوئے اور کب تک رائج رہے یعنی ابتداء سے حال تک کیا تبدیلی اور ارتقاء ہوا۔ تمام معنی درج کرنے کے بعد مذکورہ لفظ کے اصل مادے کا سُراغ یعنی اشتقاق یا تجزیہ درج کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا اور اب تک عہد بہ عہد تلفظ میں کیا تبدیلی واقع ہوئی۔ اصل لفظ کے اندراج کے بعد اس لفظ سے بننے والے مرکبات بھی اسی ترتیب کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں، اس موقع پر مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ الفاظ کی صحت کا خیال رکھا جائے کیوں کہ ایک لغت نویس سے دوسرے نے اور دوسرے سے تیسرے نے نقل کر کے اگر الفاظ داخل لغت کر دیے تو قاری کے لیے ایک، دو اور تین سند بن جاتے ہیں اور اس طرح غلطیاں راہ پاتی ہیں۔

۲۔ ہر مرکب ترکیب لغت قرار نہیں پاتی تاوقتیکہ وہ کوئی نئے معنی نہ دے اور اپنی انفرادیت نہ رکھتی ہو۔

۳۔ بلحاظ املا ایک ہی لفظ اشتقاق (اصل مادہ) یا زبان کی تبدیلی سے الگ الگ لفظ شمار ہوتا ہے، مثلاً (فارسی: کار اور انگریزی: کار)

۴۔ کسی زبان کے اردو میں دخیل صرف وہی الفاظ داخل کیے جائیں جو اردو میں رائج اور مقبول ہو گئے ہوں۔

۵ ۔ بلحاظِ قواعد کسی لفظ کی ایک سے زیادہ حیثیت الگ الگ اندراج کی جاتی ہے۔

۶ ۔ فعل کے اندراج میں ماضی، حال اور مستقبل کے صیغوں کا اندراج نہیں کیا جاتا سوائے رائج فقروں کے۔

۷ ۔ فقرے اور محاورات انکاریہ جملوں میں اندراج کے قابل نہیں ہوتے۔

۸ ۔ ہر علم لغت کے دائرہ کار میں نہیں آتا سوائے ان اعلام کے جو بطورِ تلمیح استعمال ہوتے ہیں یا ان کی نسبت سے مزید الفاظ ترکیب نہ پا گئے ہوں یا پھر ان کے استعمال میں ندرت نہ پائی جائے۔

۹ ۔ املا کے لحاظ سے ایک سے زیادہ متبادل شکلیں رکھنے والے الفاظ الگ الگ اپنی ترتیب سے درج ہوتے ہیں۔

۱۰ ۔ بلحاظِ تلفظ ایک سے زیادہ شکلیں رکھنے والے الفاظ بھی الگ الگ شمار کیے جائیں گے۔

۱۱ ۔ اردو کی جامع لغت میں ہر طرح کے الفاظ درج کیے جاتے ہیں، بشرطیکہ اردو میں رائج رہے ہوں، خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، متروک ہوں یا رائج، قلیل الاستعمال ہوں یا کثیر الاستعمال، مقبول و مستند اور فصیح ہوں، عامیانہ ہوں یا سوقیانہ، فحش ہوں یا بازاری، خواہ مفرد ہوں یا مرکب صورت میں، از روئے قواعد اسم، ضمیر صفت، حرف، فعل، متعلق فعل، اصطلاح، محاورہ، فقرہ، مقولہ، روزمرہ، بول چال، کہاوت، تلمیح، سابقہ، لاحقہ، حکایت الصوت اور حکایت الصوت سے بننے والے الفاظ و مصادر سب لغت میں جگہ پاتے ہیں۔

بورڈ نے اپنی بیشتر توجہ اپنے منصوبۂ لغت پر مرکوز رکھی ہے جو بہر حال اس کا اصلی اور مقدم کام تھا لیکن ابتداءً اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے بھی کچھ کام انجام دیئے، مثلاً: اردو ٹائپ رائٹر کے لیے ''کی بورڈ'' کی تیاری اور اردو ٹائپ کا فروغ وغیرہ۔ اردو لغت کے اس بڑے منصوبے کے ساتھ بورڈ نے وقتاً فوقتاً کچھ کتابیں بھی شائع کیں جن میں سے چند حسبِ ذیل ہیں:

۱ ۔ جذباتِ نادر — مُرتّبہ ڈاکٹر ممتاز حسن (مرحوم)
(حصہ اوّل و دوم)

۲ ۔ مقالاتِ اختر: — محقق جناب قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے مضامین کا مجموعہ (پہلی بار)

۳ ۔ رسومِ دہلی: — از مولوی سید احمد دہلوی مولف مرہنگِ آصفیہ

۴ ۔ مخطوطاتِ پیرس: — پیرس کے کتب خانوں میں اردو، پنجابی اور سندھی وغیرہ کے مخطوطات کی فہرست مرتبہ ڈاکٹر آغا افتخار حسین۔

۵ ۔ منازل السائرہ: — علامہ راشد الخیری کا مشہور ناول مرتبہ مولانا رازق الخیری۔

۶ ۔ منتخب الحکایات: — مولوی نذیر احمد کی ناپید تصنیف، پاکستان میں پہلی بار، مرتبہ شاہد احمد دہلوی۔

۷ ۔ مرآۃ العروس: مولوی نذیر احمد کے اوّلین ناول کا نیا ایڈیشن، مرتبہ ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ۔

۸ ۔ اردو کی پہلی کتاب: مولانا محمد حسین آزاد کی ''کلاسیکل'' اردو ریڈریں، (اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب ہم جلد) مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی۔

۹ ۔ ترکی اردو لغت: مرتبہ ڈاکٹر محمد صابر۔

۱۰ ۔ میٹھی کہانیاں: (بچوں کے لیے) مصنفہ ابو تمیم فرید آبادی، ۵ حصے

۱۱ ۔ تاریخی کہانیاں: (بچوں کے لیے) مصنفہ ابو تمیم فرید آبادی، ۴ حصے

۱۲ ۔ انتخابِ پھول: بچوں کے رسالے پھول (جو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۵۷ء تک جاری رہا) کا انتخاب از غلام عباس

۱۳ ۔ اشاریہ اردو نامہ: مرتبہ مصباح العثمان، یہ ان مضامین کا اشاریہ ہے جو بورڈ کے سہ ماہی مجلّہ اردو نامہ میں شائع ہوئے۔

اردو لغت کی ۲۲ جلدوں میں اردو ڈکشنری بورڈ کے اس منصوبہ کی تکمیل نہ صرف پاکستان اور پاکستانی قوم کے لیے بلکہ پوری اردو دنیا کے لیے ایک سعادت ہے کہ اس کی بدولت اردو کو دیگر زبانوں پر ایک فوقیت اور اعزاز حاصل ہوا جو دنیا کی صرف دو زبانوں انگریزی اور جرمن کو حاصل رہا ہے، پاکستان کی طرف سے اردو دنیا کے لیے اکیسویں صدی کے آغاز میں اس اعزاز سے بڑا تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ سر سید احمد خان اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی طرح دیگر زُعمائے ملت کی آرزوؤں کی تکمیل بھی ہے۔

۵۲ سال کی محنت کے بعد اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) ۲۰۱۰ء میں مکمل ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً پانچ سال تک اردو لغت بورڈ باقاعدہ سربراہ کے تقرر سے محروم رہا اور دفتر ایڈیشنل چارج کے ذریعے چلایا جاتا رہا مگر عملۂ ادارت اس عرصے میں بھی مصروفِ عمل رہا اور تاریخی اصول پر لغت کی تکمیل کے بعد مختصر جامع اردو لغت کے انتہائی اہم منصوبے پر کام شروع کر دیا اور اس کا حتمی مسودہ تیار ہے جو کہ مدیر اعلیٰ کی جانب سے نظر ثانی اور منظوری کے بعد ۲۰۱۷ء میں ہی اشاعت سے ہم کنار ہوگا۔

قومی تاریخ اور ادبی ورثہ ڈویژن کے قیام اور عرفان صدیقی صاحب کے ڈویژن کی سربراہی سنبھالنے کے بعد اردو لغت بورڈ میں دسمبر ۲۰۱۶ء میں سید عقیل عباس جعفری کا تقرر عمل میں آیا اور طویل مدت بعد ادارے کو باضابطہ سربراہ میسر آیا جس میں مشیر وزیر اعظم عرفان صدیقی صاحب کی ذاتی دلچسپی کا خصوصی دخل ہے اور ان کے زبان و ادب دوست ہونے کی دلیل بھی ہے۔

مشیر وزیر اعظم عرفان صدیقی کی ایماء پر اردو لغت بورڈ میں بچوں کے لیے لغت کی تیاری کا بھی آغاز کیا گیا، یہ منصوبہ بھی تکمیل کے مراحل میں ہے۔

سید عقیل عباس جعفری کی سربراہی میں اردو لغت بورڈ نے انتہائی مختصر مدت میں ''کمپیوٹرائزیشن آف اردو ڈکشنری، سافٹ ویئر ڈیویلپمنٹ فار موبائل فون، ویب ہوسٹنگ اینڈ اسٹیبلشمنٹ آف سرور روم'' کے منصوبے کو کامیابی سے عملی جامہ پہنایا، جس کی بدولت بائیس جلدوں پر مشتمل اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) اب ویب سائیٹ پر بھی میسر ہے اور اینڈرائڈ، ونڈوز اور آئی فون صارفین کے لیے ایپ کی صورت میں بھی دستیاب ہے، تاہم معیار کی بہتری اور پروف ریڈنگ کے سلسلے میں درستی کا عمل جاری ہے جو کہ ایک دشوار اور صبر آزما کام ہے۔ اس منصوبے کی تکمیل نے اردو لغت بورڈ اور اس کے عظیم الشان تاریخی کارنامے اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگی میسر آئی اور اسلاف کی قربانیوں، حکومتی سرپرستی اور قومی سرمائے سے مرتب کردہ باون سالہ محنت سے مرتب لغت آئندہ زمانوں کے لیے محفوظ ہوگئی اور اس کی افادی وسعت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور اس عظیم الشان منصوبے کی بروقت تکمیل کا سہرا معروف محقق اور موجودہ مدیر اعلیٰ اردو لغت بورڈ سید عقیل عباس جعفری کے سر ہے۔

☆☆☆☆☆

ایہام گوئی کی تحریک

ایہام گوئی سے کیا مراد ہے۔؟

معنوی طور پر ایہام سے مراد ''وہم میں ڈالنا'' ہے۔ یہ لفظ عربی زبان سے حاصل کیا گیا ہے۔ **ڈاکٹر انور سدید** اردو ادب کی تاریخ کے صفحہ نمبر 139 پر لکھتے ہیں کہ:

''صنفِ ایہام رعایت لفظی کے ایک مخصوص انداز کا اصطلاحی نام ہے۔
اور اس کا تمام تر انحصار ذو معنی الفاظ کے فن کارانہ استعمال پر ہے۔''

مولوی عبدالحق کے خیال میں:

'' اردو ایہام پر زیادہ تر ہندی شاعری کا اثر ہوا۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

''ایہام گوئی کی بنیاد معنی یابی و تلاشِ مضمونِ تازہ پر رکھی گئی۔''

ڈاکٹر سلیم اختر صنعت ایہام گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''قاری جب اسلوب کا گھونگھٹ ہٹا کر لیلیٰ معنی تک رسائی حاصل کرتا ہے تو
اس ذہنی مشق سے حِظ حاصل کرتا ہے اور اس میں اس صنعت کا جواز ہے۔''

شاعری میں ایہام سے مراد ایسی فنکاری ہے جس میں ذو معنی الفاظ اس انداز سے استعمال کیے جائیں کہ بظاہر قریبی معنی نظر آئیں مگر غور کرنے کے بعد اصل مدعا سمجھ میں آئے۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے:

؎ اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے

یہاں اس شعر کا قریبی مفہوم یہ بنتا ہے کہ شاعر کہہ رہا ہے میری زندگی چونکہ عارضی ہے اسی لیے اپنے محبوب کے رخساروں کو دیکھ دیکھ کر زندگی بسر کر رہا ہوں اور اگر گہرائی میں جایا جائے تو اس شعر کا بعید میں مفہوم یہ ہے کہ دوسری لائن میں استعمال ہونے والا لفظ ''عارضی'' عارض سے ماخوذ ہے۔ ''عارض'' رخسار (گال) کو کہتے ہیں۔ چنانچہ شاعر کی مراد یہ ہوگی کہ میری زندگی رخساروں ہی کے سہارے بسر ہو رہی ہے اور میں محبوب کے رخساروں (عارض) کو دیکھ دیکھ کر جی رہا ہوں۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

صنعت ایہام میں شاعر شعر میں ذو معنی الفاظ استعمال کرتا ہے۔ معنی قریب اور معنی بعید۔ بادی النظر میں معنی قریب لیکن درحقیقت معنیِ بعید مراد ہوتے ہیں۔ قاری جب اسلوب کا گھونگھٹ ہٹا کر لیلیٰ معنی تک رسائی حاصل کرتا ہے تو اس ذہنی مشق سے حِظ حاصل کرتا

ہےاوراس میں اس صنعت کا جواز ہے۔ جب ولؔی کے زیر اثر دہلی میں محفل غزل آراستہ ہوئی تو دلی والوں نے ولؔی کی غزل کا پورا فارمولا اپنا کرایہام کو لازمۂ غزل تصور کرلیا اور یوں سارا آوے کا آوا بگڑ گیا۔ یہ بھول کر کہ سالن میں نمک مناسب مقدار ہی میں ذائقہ کی چمک کا باعث بنتا ہے، نمک کی ہنڈیا نہیں پکائی جاتی۔ ایہام لفظوں کا کھیل اور اسلوب کا ٹرک ہے۔ شعر میں معنی قریب سے معنی بعید تک لے جانے کے لیے جس ذہنی جست کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی مناسبت اور کلیدی لفظ سے اس کا اشارہ بھی شعر ہی میں موجود ہوتا ہے۔ یوں شعر کی ذومعنویت مزہ دے جاتی ہے۔ جیسے مومن خان مومؔن کا یہ خوب صورت شعر ہے۔

؎ شب جو مسجد میں جا پھنسے مومؔن
رات کاٹی خدا خدا کر کے

ایہام گوئی میں بعض جگہوں پر جنسی اثر نظر آتا ہے۔ ایک دلچسپ شعر ملاحظہ کیجئے۔

؎ دختر درزی کا سینہ دیکھ کر
جی میں آتا ہے کہ مَل مَل دیجئے

اب اس شعر کے قریب کے معنی تو آپ کو سمجھ میں آ ہی گئے ہوں گے۔ بعید کے معنی یہ ہیں کہ درزی کی بیٹی اتنی نفاست کے ساتھ کپڑے سیتی ہے کہ شاعر کا جی چاہتا ہے اس کو مَل مَل (ایک نرم ترین کپڑا) سینے کے لیے دے دے۔ یہاں ایک تو لفظ ''سینہ'' ذومعنی ہے اور دوسرے مصرعے میں ''مل مل'' ذومعنی لفظ ہے۔ **(اردو ادب کی مختصر تاریخ: ص۔171)**

؎ لام نستعلیق کا ہے اس بڈھے کافر کی زلف
کافر ہوں جو بندے نہ ہوں اس لام (اسلام) کے

اب اس شعر میں ''اِسلام'' اور ''اِس لام'' کا ایہام نظر آتا ہے۔

شمالی ہندوستان میں فارسی زبان وادب کے خلاف جو ردِعمل محمد شاہی عہد میں فروغ پا رہا تھا ایہام میں اس کا اثر وعمل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسے خان آرزؔو کی تحریک پر اس کے شاگردوں نے جن میں شاہ حاتؔم، مضمونؔ، آبرؔو اور یک رنگؔ شامل تھے، زیادہ استعمال کیا گیا۔ ان میں سے بیشتر ایہام گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے جس کی وجہ سے تاریخ ادب میں وہ آج بھی زندہ ہیں۔ اب ذیل میں ایہام گوئی کی تحریک کے چند شعراء کا ذکر پیش کیا جا رہا ہے۔

ایہام گوئی کا فائدہ یہ ہوا کہ لفظ کے باطن کو ٹٹولنے اور اس کے باطن سے نئے مفاہیم اجاگر کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ مشاعروں میں اس صنعت نے خصوصی دلچسپی پیدا کی اور فارسی کے مقابلے میں اردو شاعری کا ذوق فروغ پانے لگا۔ **''نوادرالالفاظ''** اسی زمانے میں لکھی گئی جو لفظوں کے حدود ومعانی متعین کرتی ہے۔

ایہام گوئی کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس تحریک کے بیشتر شعراء سپاہی پیشہ اور ملازم تھے۔ بعض میں جسمانی خامیاں تھیں جو اکثر مجلسی چشمک کا باعث بنتی تھیں۔ اس تحریک کے فروغ میں لفظوں سے پنجہ آرائی اور قدرت کے قانون تلافی کا عمل دخل بھی تلاش کیا گیا

ہے۔ چنانچہ ردِعمل ان شعراء کی طرف سے ہوا جو سماجی لحاظ سے بلند مرتبہ اور جسمانی لحاظ سے توانا تھے۔ اور ردِعمل کی وجہ یہ تھی کہ ایہام کی صنعت میکانکی تھی، اس میں جذبے کی پرواز رک جاتی تھی اور شعراء پر تُک بندی کا گمان ہوتا تھا۔ ذو معنی الفاظ کی تلاش شروع ہوئی تو شعر کی الہامی کیفیت ختم ہوگئی۔

01 ولی دکنی (متوفی ۱۷۰۷ء)

ولی ۱۶۶۷ء میں گجرات میں پیدا ہوا۔ میر نے اس کو شاہ گلشن کا شاگرد بتایا ہے مگر شمس الدین فاروقی صاحب کا کہنا ہے کہ ولی دکن کا شاعر تھا میر اور قائم چاند پوری نے اس کو شاہ سعد اللہ گلشن کا شاگرد اس لیے کہا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ دنیا پہ ظاہر کیا جائے کہ ایک دکنی کو الٹا دہلی والوں (یعنی سعد اللہ گلشن) نے شاعری سکھائی تھی۔ اس کو اردو غزل کا پہلا باقاعدہ شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے ولی کو حسن پسند شاعر قرار دیا ہے۔ ولی نے شاعری میں دلچسپی بڑھانے کے لیے ایہام کا سہارا لیا۔ وہ محبوب کے حسن کا وصاف اور قصیدہ خواں تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر دیکھنے کے لیے پہلا پرچہ ''اردو غزل'' ملاحظہ کیجیے۔

؎ رخ پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال
حوضِ کوثر پہ جیوں کھڑا ہو بلالؓ (ولی دکنی)

یاد رھے کہ:

ولی دکنی کا دیوان دہلی میں آنے کے بعد ایہام گوئی کا سلسلہ شروع ہوا جو آہستہ آہستہ باقاعدہ تحریک کی شکل اختیا کر گیا۔

02 سراج الدین علی خان آرزو (متوفی ۱۷۵۶ء)

جب ولی دکنی کا دیوان غزل دہلی میں پہنچا تو وہاں اردو شاعری میں گویا انقلاب آ گیا۔ فارسی شعراء فارسی شاعری سے کنارہ کش ہو کر ریختہ گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ سراج علی خان آرزو جو پہلے فارسی کے مربی تھے انہوں نے بھی ریختہ کے مشاعرے کرانے شروع کر دیئے۔

خان آرزو کا وطن اکبر آباد تھا۔ انہوں نے گوالیار میں ملازمت کی۔ جب محمد شاہ تخت نشین ہوا تو وہ دہلی آ گئے اور اس دور کی ابتری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جب حالات زیادہ خراب ہوئے تو خان آرزو نے لکھنؤ کا رخ کیا اور وہیں رہنے لگے، حتیٰ کہ ان کا انتقال بھی لکھنؤ ہی میں ہوا۔

میر تقی میر نے خان آرزو کو ایک ایسی شخصیت قرار دیا جس سے اعتبار فن قائم ہوتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے خان آرزو کو اردو ادب میں ارسطو کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ خان آرزو نے گو کہ خود اردو زبان میں صرف 27 شعر کہے لیکن انہوں نے فارسی کے مقابلے میں ریختہ گوئی کو فروغ دیا اور اس دور کے نوجوان شعراء کی تربیت اور شعری ذوق کی آبیاری کی۔ ان کے سلسلہ تلمذ میں میر تقی میر، شاہ مبارک آبرو، یکرنگ، ٹیک چند بہار، مضمون اور مخلص جیسے شعراء شامل ہیں۔

بلاشبہ خان آرزوؔ نے ایہام گوئی کو فروغ دیا لیکن تازہ گوئی کو بھی تقویت فراہم کی۔ تازہ گوئی کے ادبی راہنما مرزا مظہر جان جاناںؔ تھے مگر خان آرزوؔ بھی اس تحریک کے مجدد مانے جاتے ہیں۔ مشاعروں میں آرزوؔ کی تنقید و اصلاح سے بہت سے نئے شعراء نے اپنے ذوقِ ادب کو سنوارا اور فنِ شعر کی تربیت حاصل کی۔

تدوین لغت خان آرزوؔ کا ایک اور کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے عبدالواسع ہانسوی کے مقابلے میں خان آرزوؔ کی لغت نگاری کو ممتاز اور اہم تر تسلیم کیا اور لکھا کہ:

''وہ ہندوستانی زبان کی لسانی تحقیق اور بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے۔''

ان کی شاعری کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

؎ داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل
ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے (خان آرزوؔ)

خان آرزوؔ کی تصنیفات

خان آرزوؔ کی تصنیفات کافی تعداد میں ہیں جن میں ڈاکٹر انور سدیدؒ نے مندرجہ ذیل چند مشہور تصانیف کے نام گنوائے ہیں۔

01 نوادرالالفاظ
02 تنبیہ الغافلین
03 رسالہ موہبت عظمیٰ (فارسی)
04 رسالہ عطیۂ کبریٰ
05 مجمع النفائس

مجمع النفائس میں انہوں نے فارسی گویوں کا لطیفوں کے ساتھ تذکرہ لکھا ہے۔

03 شاہ مبارک آبروؔ (متوفی ۱۷۳۳ء)

نجم الدین شاہ مبارک آبروؔ، خان آرزوؔ کا قرابت دار شاگرد تھا۔ وہ حسن پسند اور قلندر مشرب انسان تھا۔ اس نے شعر گوئی کا آغاز فارسی میں کیا لیکن پھر اردو کی طرف آ گیا۔ اسے ولیؔ کے بعد شمالی ہند کا پہلا شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کو زیادہ شہرت ایہام گوئی کی وجہ سے ملی ہے۔ آبروؔ کی ایہام گوئی کی مثال دیکھئے:

؎ ہوئے ہیں اہل زر خواہانِ دولت ، خوابِ غفلت میں
جسے سونا ہے یارو فرش پہ مخمل کے کہہ سو جا (آبروؔ)

؎ نازک پنے پر اپنے کرتے ہو تم غروری
موسی کمر سے اپنی فرعون ہو رہے ہو (آبروؔ)

یہاں ایہام اس لفظ میں ہے کہ ''موسی'' سے مراد یہاں حضرت موسیٰ نبی علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ ''مو'' اور ''سی'' دو الگ الگ لفظ ہیں۔ ''مو'' فارسی میں بال کو کہتے ہیں۔ یہاں شاعر کہہ رہا ہے تم اپنی بال سی باریک کمر پر فرعون کی طرح غرور نہ کرو۔

ویسے ایک غلط العام فقرہ بھی مشہور ہے جس کو ہم روزمرہ میں استعمال کرتے ہیں کہ

'' لکھے موسیٰ پڑھے خدا ''

اصل فقرہ یوں ہے۔

'' لکھے مو سا پڑھے خود آ ''

یعنی بال جیسا باریک لکھے تو کس سے پڑھا جائے گا خود آ کے پڑھے۔

04 شاکر ناجیؔ (متوفی ۱۷۴۷ء)

شاکر ناجیؔ، دلی میں پیدا ہوئے اور یہیں دفن ہیں۔ وہ بے حد خوش مزاج اور ظریف الطبع شاعر تھے۔ وہ عمدۃ الملک کے نعمت خانے میں داروغہ تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے انہیں ہزل نگار لکھا ہے مگر ڈاکٹر انور سدیدؒ کے بقول یہ درست نہیں۔ شاکر ناجی کا سارا دیوان ایہام میں ڈوبا ہوا ہے اور وہ اپنے آپ کو بانیٔ ایہام لکھتے تھے۔ شاکر ناجیؔ کی شاعری صنعت ایہام میں ہی محبوس ہو کر رہ گئی اور وہ زیادہ نکھر نہ سکے۔

؎ ناجیؔ دہن کو دیکھ سخن مختصر کیا
گرچہ سجن کی زلف کا قصہ طویل تھا

؎ محبت میں علیؑ کی دیکھ ناجیؔ
ہوا ہے دل مرا اب حیدرآباد (شاکر ناجیؔ)

یہاں لفظ ''حیدرآباد'' میں ایہام ہے کہ حضرتِ علی (علیہ السلام) کی محبت میں شاکر ناجیؔ کا دل حیدرآباد دکن کے شہر کی طرح بڑا ہو گیا ہے یا کہ ''حیدرآباد'' سے مراد یہ ہے کہ اس دل میں حیدر (علیہ السلام) آباد ہو گئے ہیں۔

05 شرف الدین مضمونؔ (متوفی ۱۷۳۴ء)

مضمون اکبرآباد کے رہنے والے تھے اور فرید الدین مسعود اجودھنی کی اولاد میں سے تھے۔ جوانی میں شاہ جہان آباد آئے اور ساری عمر زینتِ مساجد میں گزاری۔ دانت گر جانے کی وجہ سے خان آرزوؔ انہیں شاعر بیدانہ کہتے تھے۔ انہوں نے ایہام میں اکثر مضمون کو کھینچ کر با معنی بنانے کی کوشش کی ہے۔

مضمونؔ اپنی ایہام گوئی کے بارے میں خود لکھتے ہیں۔

؎ ہوا ہے جگ میں مضمونؔ شہرہ تیرا
طرح ایہام کی جب سیں نکالی (مضمونؔ)

مزیدان کے اشعار دیکھئے۔

؎ کرے بے دار بھی کامل کو سرتاج ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج
؎ اگر پاؤں تو مضمونؔ کو رکھوں باندھ کروں کیا جو نہیں لگتا مرے ہاتھ (مضمونؔ)

شرف الدین مضمون کے اس شعر میں لفظ ''مضمون'' ذو معنی ہو جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شعر میں خود شاعر جس کا تخلص مضمونؔ ہے اس کو باندھنے کی بات کی جارہی ہے یا کہ شرف الدین صاحب سے شاعری میں کوئی مضمون باندھنا مشکل ہو رہا ہے۔

اس دور میں مصطفیٰ خان یک رنگؔ، احسن اللہ خان احسنؔ، شاہ ولی اللہ اشتیاقؔ، سعادت علی امروہوی، میر محمد سجاد اور عبدالوہاب یکرؔو جیسے شعراء نے ایہام گوئی کی تحریک میں حصہ لیا اور لفظ کی ذو معنویت سے نئے متعدد زاویے نکھارے۔ چنانچہ مخصوص معنی نکالنے کے لیے ایہام لفظی، ایہام معنی، ایہام تناسب آوازوں کا اشتراک، حتیٰ کہ لفظوں کی امتیازی املاء سے بھی ایہام کو ابھارنے کا کام لیا گیا۔

؎ تجھ زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال
یک رنگؔ کا سخن میں خلاف ایک مو نہیں (یک رنگؔ)

؎ پیپیے کی طرح دارو کے شیشے
زبان حال سے کہتے ہیں پی پی (سعادت امروہوی)

؎ اُودھر نگہ کی تیغ اور اِیدھر سنانِ آہ
اس کشمکش میں عمر ہماری بھی کٹ گئی (احسنؔ)

06 شاہ ظہورالدین حاتمؔ (متوفی ۱۷۸۲ء)

شاہ حاتمؔ تحریک ایہام گوئی کے ایسے مشاق شاعر تھے جن کے سلسلہ تلمذ میں سوداؔ، تاباںؔ اور رنگینؔ جیسے قادر الکلام شعراء شامل ہیں۔ پیشہ سپہ گری تھا لیکن ذوق شعر کی بدولت پہلے نواب امیر خان کے اور بعد میں نواب الدولہ خان کے مصاحب بن گئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے حکم پر مثنوی ''تمباکو وحقہ'' اور ''وصف قہوہ'' لکھی۔ ان کے شہر آشوب سے اس دور کی صورت حال آشکار ہوتی ہے۔

شاہ حاتمؔ نے تحریک ایہام گوئی کا عروج بھی دیکھا اور پھر اس کو مائل بہ زوال کرنے اور تازہ گوئی کو پروان چڑھانے والوں میں بھی شامل ہوئے۔ ان کے ایہام کی مثال حسب ذیل ہے۔

؎ نظر آوے ہے بکری سا کیا پر ذبح شہروں کو
نجانے میں کہ یہ قصاب کا رکھتا ہے دل گردا

؎ ہے وہ چرخ مثال سرگرداں
جس کو حاتم تلاش مال ہوا (حاتم)

تازہ گوئی کے زیر اثر حاتم نے اپنا نیا دیوان مرتب کیا اور اسے **''دیوان زادہ''** کا عنوان دیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ:

''یقین نہیں آتا کہ ایک شخص خود کو اس طور بدلنے کی سکت و صلاحیت بھی رکھتا ہے۔''

ان کی تازہ گوئی کی مثال حسب ذیل ہے۔

؎ خواب میں تھے جب تلک تھا دل میں دنیا کا خیال
کھل گئی جب آنکھ تو دیکھا کہ سب افسانہ تھا

؎ گلشنِ دہر میں سو رنگ ہیں حاتم اس کے
وہ کہیں گل ہے ، کہیں بو ہے ، کہیں بوٹا ہے

؎ تمہارے عشق میں ہم ننگ و نام بھول گئے
جہاں میں کام تھے جتنے تمام بھول گئے (حاتم)

شاہ حاتم کے ''دیوان زادہ'' کی ایک اور اہمیت یہ ہے کہ اس کے دیباچے میں انہوں نے اصلاح دیوان کا تصور بھی پیش کیا ہے۔ اور غزل کا سن تخلیق اور سبب تخلیق بھی لکھا ہے۔ اور اوزان و بحور کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔

07 صدرالدین خان فائز دہلوی (متوفی ۱۷۳۸ء)

فائز نے ولی کے دیوان کی دلی میں آمد کے بعد شاعری شروع کی۔ ان کی شاعری پر ولی کے اثرات نمایاں ہیں اور ان کے تخلیقی مزاج پر شوق کا غلبہ طاری ہے اور شاعری وارداتی نوعیت کی ہے جس سے سامع لطف اندوز ہوتا ہے۔

؎ جب سجیلے خرام کرتے ہیں
ہر طرف قتلِ عام کرتے ہیں

؎ وہی قدر فائز کی جانے بہت
جسے عشق کا تیر کاری لگے (فائز)

08 میر محمود صابر (متوفی ۶۸-۱۷۶۷ء)

صابر کے والد استر آباد سے دلی آئے تھے۔ لیکن خود صابر زندگی کے آخری ایام میں ٹھٹھہ (سندھ) میں چلے آئے، ان کی زور گوئی اور قادر الکلامی کا اعتراف میر قانع نے **''مقالات الشعراء''** میں کیا۔ صابر نے بھی ولی کا رنگ سخن اختیار کیا اور اسی کو مایہ افتخار سمجھا۔ ان کا نمونہ کلام دیکھئے۔

؎ اگرچہ رند ہوں در عشقِ خوباں
ولے خوش ہوں کہ مست و بے ریا ہوں

؎ سنا ہوں خضرؑ کی معجز زبانی سوں کہ عاشق کوں
وصالِ یار بہتر ہے حیاتِ جاودانی سوں

؎ کچھ کمائی نہ کی جوانی میں
زندگی کھوئی حرصِ فانی میں (صابرؔ)

09 عبداللہ خان مبتلاؔء

عبداللہ مبتلاؔء کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے دلی کا باشندہ ثابت کیا ہے۔لیکن ان کی شاعری میں دکنی زبان کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ولؔی کی طرح وہ بھی عشقِ خوباں میں مبتلاء تھا۔اس کی شاعری میں صنم پرستی کا رجحان نمایاں ہے لیکن جذبہ تہہ دار نظر نہیں آتا۔

؎ ترے مکھ پہ قطرے عرق کے نہیں
ستارے ہیں یوں ماہ سے متصل

؎ رہے ثابت قدم اس وقت ہوشِ مبتلاؔء کیوں کر
جب آوے سر پہ اُس کے تیغ لے کر مبتلاء میرا (مبتلاؔء)

ایہام کا ردِعمل (تازہ گوئی کی تحریک)

ایہام فارسی کے بلند پایہ شعراء کے مقابلے میں نسبتاً کم درجے کے شعراء کی تحریک تھی جو بلبلے کی طرح اٹھی اور مختصر سے حباب کے بعد ختم ہوگئی۔ اس تحریک کے خلاف اوّلیں ردِعمل مرزا مظہر جانِ جاناںؔ نے ظاہر کیا اور نہ صرف اردوئے معلیٰ کو نئی شاعری کی زبان بنا دیا بلکہ ولیؔ کے اثرات کو بھی کم کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں اردو کے اصول وقواعد مقرر کیے گئے۔ فارسی اور عربی کے کثیر الاستعمال الفاظ کو جائز اور ہندوی بھاشا کے الفاظ اور فارسی حرف وفعل کے مروجہ استعمال کو متروک قرار دیا گیا۔ تعقید کو عیب اور دہلوی روزمرہ کو جائز شمار کیا گیا۔ حرکت وسکون الفاظ کے علاوہ قوافی کے اصول وقواعد بھی مقرر کیے گئے۔ لسانی طور پر یہ اصطلاحی تحریک تھی اور اس نے نئی سانچہ سازی سے فکر وخیال کو وسعت دینے کی سعی بھی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کے شعراء نے مختلف لسانی اور تہذیبی عناصر کو وحدت کی صورت دے دی اور لفظوں کی آواز میں مٹھاس شامل کر دی۔ داخلی طور پر ہندوی زبان اور تہذیب کے خلاف اسلام ایرانی تہذیب کی پیش قدمی تھی جسے مسلمان شعراء نے کامیاب بنانے میں گہری دلچسپی لی۔

مرزا مظہر جان جاناںؔ نے ایہام کی رد کا علم اٹھایا اور ان کے شاگردوں کی ایک تعداد نے تو ایہام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ ان میں تاباںؔ، یقینؔ، فغاںؔ اور قائمؔ چاندپوری شامل ہیں۔ آیئے ان تازہ گوئی (ردِ ایہام گوئی) کے نمائندہ شعراء کا طائرانہ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔

01 مرزا مظہر جان جاناںؔ (متوفی ۱۷۸۱ء)

مرزا مظہر حدیث اور تصوف پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ ادبی کم اور مذہبی راہنما زیادہ تھے۔ لیکن ان کی ادبی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے فارسی اور اردو کو ایک ہی تار میں بننے کی سعی کی اور اپنے شاگردوں کو بھی یہ زبان اختیار کرنے کی تربیت دی۔ بلاشبہ وہ اصلاً فارسی کے شاعر تھے لیکن نئی اردو میں بھی ان کی شاعری بڑی جاندار اور عہد آفرین ہے مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

؎ ہم نے توبہ کی ہے اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کچھ چلتا نہیں اور مفت جاتی ہے بہار

؎ اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ
اس واسطے لگا ہوں چمن میں ہوا کے ساتھ (مظہر جان جاناںؔ)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ

''مظہر کی شاعری پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری پہلی دفعہ بول رہی ہے۔''

ڈاکٹر انور سدیدؒ نے ''اردو ادب کی تاریخ'' کے صفحہ نمبر ۱۴۴ پر لکھا ہے کہ

''نواب نجف خان نے انہیں اپنا ایک بااثر مخالف سمجھ کر قتل کرا دیا تھا۔''

02 انعام اللہ خان یقینؔ (متوفی ۵۶۔۱۷۵۵ء)

یقین کے تخلیقی جوہر کو مظہر جانِ جاناںؔ کے فیض صحبت نے چمکایا تھا اور بعض لوگ تو ان کی شاعری کو بھی فیضِ استاد ہی سے تعبیر کرتے رہے لیکن یقینؔ کی غزل کا مزاج مظہرؔ کی غزل سے مختلف ہے اور یہ یقینؔ کے ذاتی تجربے کی رنگ بردار نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں شیفتگی اور دردمندی کا امتزاج ملتا ہے۔

؎ مجھے زنجیر کر رکھا ہے ان شہری غزالوں نے
نہیں معلوم میرے بعد ویرانوں پہ کیا گذری

؎ تری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ
یہ اتنا کارِ آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

؎ آگ بھی بجھتی ہے اور سورج بھی ہوتا ہے غروب
رات دن جلتا ہے یکساں داغِ حسرت کا چراغ (یقینؔ)

یقین کی موت ایک سربستہ راز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں ان کے باپ نے قتل کرا دیا تھا۔ (بحوالہ اردو ادب کی تاریخ۔ انور سدیدؒ)

03 میر عبدالحی تاباںؔ (متوفی ۵۲۔۱۷۴۹ء)

تاباںؔ کو تذکرہ نگاروں نے معشوقِ عاشق مزاج اور مرد خوش ظاہر لکھا ہے۔ چنانچہ ان کی مقبولیت میں ان کی خوب روئی کا بھی بہت حصہ ہے۔ ڈاکٹر انور سدیدؒ نے شیفتہؔ کے ''گلشنِ بے خار'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ

''تاباںؔ حسن یوسفی کے باوجود اندوہ یعقوبی بھی رکھتے تھے۔''

ان کے دیوان میں غزلیات کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، قطع، رباعی اور مسدس کی اصناف بھی شامل ہیں ان کی غزل انکی ذاتی واردات نظر آتی ہے اور ماضی کی روایت خوش دلی سے مستقبل کی طرف جادہ پیما ہو جاتی ہے۔

؎ خزاں تک تو رہنے دے صیاد ہم کو
کہاں پھر چمن یہ کہاں آشیانہ (تاباںؔ)

؎ عجب احوال ہے تاباںؔ کا میرے
کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا (تاباںؔ)

04 میر سوزؔ (متوفی ۱۷۸۱ء)

میر سوزؔ کو درسی علوم، خطاطی، موسیقی اور سپہ گری پر دسترس حاصل تھی، لکھنؤ میں انہیں نواب آصف الدولہ کی استادی کا شرف حاصل تھا۔ انہوں نے اسی شہر خوباں میں وفات پائی۔ سوزؔ کی شاعری صفائی اور سادہ بیانی کی مثال ہے۔ بقول محمد حسین آزادؔ، انہوں نے کیفیات اور معاملات کی متحرک تصویریں بھی پیش کیں۔ ان کی بے ساختگی میں داخلی سوز موجود ہے۔

؎ اہل ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ! یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

؎ اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیبوں کا مگر
سوزؔ کے نام کو لکھ لکھ کے جلا دیتے ہیں

؎ اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے
درد کے بھی دیکھنے سے ہم گئے (میر سوزؔ)

05 اشرف علی فغاںؔ (متوفی ۱۷۷۲ء)

اشرف علی فغاںؔ محمد شاہ اور احمد شاہ بادشاہ کے مصاحب تھے۔ انہوں نے ۱۷۵۴ء کے آشوب میں دلی چھوڑی اور ہجرت کی داستان غم ''ہجو شاہ عبدالرحمٰن'' میں لکھی۔ ان کا انتقال فیض آباد میں ہوا۔ فغاںؔ کی شاعری میں محرومی کا احساس نمایاں ہے اور اسے شخصی نوحے کی حیثیت حاصل ہے۔

؎ آخر فغاںؔ وہی ہے اسے کیوں بھلا دیا
وہ کیا ہوئے تپاک وہ الفت کدھر گئی

؎ ترے فراق میں کیوں کر یہ درد ناک جئے
مرے تو مر نہیں سکتے ، جئے تو خاک جئے (فغاںؔ)

06 احسان اللہ بیانؔ (متوفی ۱۷۹۸ء)

بیانؔ کے آبا و اجداد کشمیری تھے جو پہلے آگرہ آئے اور پھر دلی میں آباد ہو گئے۔ احمد شاہ کی معزولی کے بعد بیانؔ حیدر آباد چلے گئے تھے اور وہیں وفات پائی۔ ان کی شاعری عشق و عاشقی کی رموز آشنا اور سلامتی طبع کی آئینہ دار ہے۔

؎ عالم میں گو کہ عشق نے رسوا کیا مجھے
لیکن تجھے تو شعلۂ آفاق کر گیا

؎ جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی
پیارے وہ تیری نگہہ کیا تھی (بیانؔ)

ہدایت اللہ خان ہدایتؔ، محمد علی میر مہدی بیدارؔ، مرزا جان طپشؔ اور جعفر علی خان حسرتؔ اس دور کے چند ایسے شعراء ہیں جنہوں نے غزل کو تاج محل کی طرح تعمیر کیا۔ ان کی غزلیات میں اگر چہ تجمل و شکوہ بھی موجود ہے لیکن دردمندی زیادہ متاثر کرتی ہے اور غم و نشاط یوں باہم مربوط ہوئے ہیں جیسے آنسو اچانک مسکرانے لگیں یا مسکراتے مسکراتے جیسے آنکھیں بھیگ جائیں۔

؎ شعلۂ آتش دل آہ! بجھایا نہ گیا
راز دل گو کہ چھپایا پر چھپایا نہ گیا (ہدایتؔ)

؎ زلف اس رخ پہ صبا سے جو پریشاں ہو جائے
سحر و شام بہم دست و گریباں ہو جائے (بیدارؔ)

؎ ہرگز نہ سلاسل سے ہو تسخیر ہماری
جوں زلف بتاں چاہیئے زنجیر ہماری (طپشؔ)

؎ آخر ترے غم میں مر گئے ہم
بھرنا تھا جو دکھ ، وہ بھر گئے ہم (حسرتؔ)

07 شیخ قیام الدین قائمؔ چاندپوری (متوفی ۹۴۔۱۷۹۳ء)

قائم چاند پور کے رہنے والے اور سوداؔ، میرؔ اور دردؔ کے معاصر تھے۔ انہوں نے عالم گیر ثانی کے عہد میں محمد یار خان کی سرکار سے تعلق پیدا کر لیا تھا۔ کچھ عرصہ لکھنؤ میں گزارا اور رام پور میں انتقال کیا۔ قائمؔ نے شاہ ہدایتؔ، دردؔ اور سوداؔ جیسے اساتذہ سے سلسلہ تلمذ قائم کیا اور غزل ،مثنوی، قطعہ، رباعی سب اصناف میں شاعری کی۔ آزادؔ نے انہیں میرؔ و مرزاؔ کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اور شعراء کا متذکرہ ''نکاتِ سخن'' بھی قائمؔ کی تصنیف ہے۔ وہ زندہ دل ذہین اور خوش مزاج تھے لیکن طبیعت میں زود رنجی کا مادہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ سوداؔ اگر چہ ان کے استاد تھے لیکن انہوں نے ہجو لکھ کر قائمؔ کا مزاج درست کیا۔ انہوں نے رام پور میں ایک دبستانِ شعر کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب الامثال کی طرح مشہور ہیں۔

؎ قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

؎ دردِ دل چپ رہا نہیں جاتا
آہ! چپ بھی رہا نہیں جاتا

؎ لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنے قائمؔ
شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا (قائمؔ)

ان کا مخمس شہر آشوب جس میں روہیل کھنڈ کی تباہی کا نقشہ کھینچا گیا ہے بہت معروف ہے۔اس میں ہجو کی تلخی بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی۔مثنوی میں قائمؔ نے محاکات نگاری اور مصوری کا معیار قائمؔ کیا اور یہ منظر نگاری ان کی غزل میں بھی موجود ہے۔

؎ گریہ تو قائمؔ تھا ، مژگاں ابھی ہوں گے نہ خشک
دیر تک ٹپکیں گے باراں کے شجر بھیگے ہوئے (قائمؔ)

08 ٹیک چند بہارؔ

ٹیک چند بہارؔ کو عربی اور فارسی زبانوں اور منطق و معانی پر بڑی دسترس حاصل تھی۔وہ قوم کے زرگر تھے اس لیے لفظوں کو بھی جوہری کی طرح پرکھتے تھے۔انہوں نے ''**سراج اللغات**'' کی تصحیح میں خانِ آرزوؔ کی مدد کی اور ایک لغت ''**بہار عجم**'' مرتب کی۔شاعری ان کا شوق تھا اور موضوع کو ہمیشہ سلاست اور لطافت سے پیش کیا۔

؎ سبھی کرتے ہیں دعویٰ خوں کا ، قسمت ہے تو دیکھیں گے
صفِ محشر میں کس کے ہات دامن ہوگا قاتل کا

؎ دل ہمارا لے کے کیوں انکار کرتے ہو سجن
کس سے یہ سیکھے ہو تم لے کے مکر جانے کی طرح (بہارؔ)

سراج الدین آرزوؔ سے لے کر قائمؔ چاند پوری تک اردو شاعری ایک عبوری دور سے گذرتی رہی ہے۔اس دور میں پہلے ولیؔ دکنی کی شاعری کا غلغلہ بپا ہوا۔پھر ایہام کی تحریک کو فروغ ملا اور آخر میں ردِعمل کی تیز رو نے تازہ گوئی کے لیے زمین ہموار کر دی۔اس دور میں زبان کا لسانی ڈھانچہ متعین کرنے کی قابلِ قدر کاوش کی گئی۔چناچہ اردو کا منفرد روپ نکھر کر سامنے آنے لگا۔اس دور کی غزل نے مقامی اثرات سے نکل کر ایرانی مرغ زاروں کی طرف پیش قدمی کی اور لسانی ،تہذیبی اور تخلیقی عناصر کو یکجا کر کے ایک اکائی میں بدلنے کی کوشش ہوئی۔عشق ،تصوف اور اخلاقی اقدار اس دور کی شاعری کے چند اہم موضوعات ہیں۔سیاست کی گرم بازاری اور طوائف الملوکی نے ایک مبرم غم کو جنم دیا اور اس کے نقوش اس دور کی شاعری کی سب اصناف پر چھائے ہوئے ہیں۔یہ فضا شہر آشوب کے فروغ میں زیادہ معاون بنی۔عصری ،مجلسی اور شخصی ردِعمل کو ہجو میں سمیٹنے کی کاوش کی گئی۔اس دور کے شعراء آئندہ دور کے ادبا کے مقابلے میں قدر آور نظر نہیں آتے۔لیکن ان کی بنیادی عطا یہ ہے کہ انہوں نے بڑی شاعری کے لیے زمین ہموار کی اور ایسی فضا پیدا کی جس میں شاعری کو زندگی کی اثر انگیز سرگرمی سمجھا جاتا تھا۔

تحریکِ علی گڑھ اور اُردُو ادب کی تشکیلِ نو

سوالات

01 تحریک علی گڑھ سے کیا مراد ھے ۔؟ نیز سر سید کی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کریں ۔

02 تحریک علی گڑھ میں سر سید، حالیؒ ، شبلیؒ ،محسن الملک اورنواب وقار الملک کی خدمات قلمبند کریں ۔

03 مضمون نویسی کے میدان میں تحریک علی گڑھ کی خدمات قلم بند کریں ۔

04 تحریک علی گڑھ کی جانب سے کی جانیوالی سوانح نگاری کا مفصل جائزہ لیں ۔

05 تنقید کے میدان میں تحریک علی گڑھ کا کردار واضح کریں ۔

مندرجہ بالا سوالات کے جوابات کے لیے مندرجہ ذیل سرخیوں کی روشنی میں چلتے ہیں۔

01	پس منظر
02	سرسید احمد خان کی خدمات
03	تحریک علی گڑھ کے دیگر محرکین اوران کی خدمات (اُردُو ادب کے نئے رجحانات:۔مضمون نگاری،سوانح نگاری اور تنقید)
04	تحریک علی گڑھ کے اثرات
05	خلاصہ /اہم نکات

01-پس منظر :

جہاں تک تحریک کا ذکر ہے تو تحریک جمود کو توڑنے کے لیے چلائی جاتی ہے۔مسلمانوں کے سروں پر نا امیدی کے جو پرندے بیٹھے تھے ان کو اڑانے کے لیے تحریک علی گڑھ وجود میں آئی۔صورتحال یہ تھی کہ مسلمان ایک ہزار سال تک ہندوستان پر حاکم رہ چکے تھے،اسی وجہ سے برطانوی انگریزوں کی نظر میں ہندوؤں سے کہیں زیادہ ان کے لیے مسلمان خطرہ بنے ہوئے تھے۔انگریزوں نے ایک گہری چال چلی۔پہلے تو انہوں نے ہندوؤں کو جنگ آزادی سے نردوش قرار دے دیا اور پھر ہندوؤں کے ذہن میں برصغیر میں ہندو اکثریت کا شعور بیدار کرتے ہوئے انہیں مسلمانوں پر مسلط کرنے کی ٹھان لی۔اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے انہوں نے ہندوؤں کو اکثریت قرار دیتے ہوئے ان کو اعلیٰ عہدے دیئے۔1861ء میں انڈین کونسل ایکٹ نافذ کیا گیا جس کے تحت گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستانیوں کو آبادی کے لحاظ سے نامزد کیا گیا۔خواجہ خلیل احمد مرحوم جو تحریک خلافت میں انگریزوں کے خلاف لڑے تھے ان کے بیٹے خواجہ جمیل احمد اپنی کتاب **''انگریز اور مسلمان''** میں لکھتے ہیں کہ:

''ایک جانب ہندوؤں کو اکثریت کا احساس دلا کر انہیں ہندو راج کا خواب دکھایا تو دوسری جانب زندگی کے ہر شعبے میں باصلاحیت مسلمانوں کو نظر انداز کر کے ہندوؤں کی سرپرستی کی۔''

انگریزی اسکول ہندو اساتذہ کی زیر نگرانی کھولے گئے اور فارسی کو ڈی گریٹ کر کے سنسکرت کی تعلیم کے لیے وظائف مقرر کیے گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے تو غیر مسلموں کی بہبود و ترقی کے لیے بیس سال کے لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کیا۔ ڈوکن ڈیوڈ (Ducan David) نے بنارس میں سنکرت کالج اور اس کے ساتھیوں نے کلکتہ میں ہندو کالج قائم کیا۔ ڈاکٹر ایچ۔ایچ ولسن (Dr. H.H Wilson) نے سنسکرت کی تعلیم کا ایک ایسا نصاب تیار کیا جس کا مقصد ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اکسانا اور ان سے نفرت دلانا تھا۔ خواجہ جمیل احمد لکھتے ہیں کہ:

''انگلستان سے بڑے بڑے سازشی اور ریاکار اس مقصد کے لیے کلکتہ بلائے گئے جن کا کام مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو برانگیختہ کرنا تھا۔ان میں جوناتھن (JONATHND)، ولیم کاروے (WILLIAM CARYE)، ہارے (HARE)، چارلس گرانٹ (CHARLES GRANT)، اور سر ہائیڈ ایسٹ (HYDE EAST) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ راجہ رام موہن رائے کو جو انگریزوں کے منظور نظر تھے ''برہموں سماج'' قائم کرنے پر آمادہ کیا گیا۔ اور اس معاملہ میں ان کی رہبری کی گئی۔ انہوں نے پہلا بنگال اخبار ''سنبادکو مودی'' نکالا۔''

سر ولیم ہنٹر اپنی کتاب ''انڈین مسلم'' میں اعتراف کرتے ہیں کہ:

''درحقیقت ہماری تعلیمی نظام جس نے صدیوں کے خواب سے ہندوؤں کو بیدار کیا اور انہیں قومیت (اکثریت) کا احساس دلایا وہ مسلمانوں کے روایات، ضروریات اور ان کے مذہب سے نفرت پر مبنی ہے۔''

انگلشیہ سرکار سمجھتی تھی کہ فارسی مسلمانوں کی زبان ہے اس لیے فارسی کی جگہ بنگالی کو سرکاری زبان بنایا گیا۔ برطانوی حکومت نے مسلمانوں سے جاگیریں اور جائیدادیں چھین کر ہندوؤں کو عطا کر دیں اور صنعت و تجارت میں ہندوؤں کو زبردستی داخل کیا گیا۔ مسلمان انگریزوں کے سامراج کے نیچے دبے تو تھے ہی کہ ان پر ہندوؤں کا غلبہ بھی چھانے لگا۔ سرکاری ملازمتیں انگریزوں اور ہندوؤں کے لیے مخصوص رہ گئی تھیں۔ خواجہ جمیل احمد لکھتے ہیں کہ:

''سرکاری ملازمت میں ایسے ہندوؤں کو ترجیح دی گئی جو مسلمانوں سے انتہائی منافرت کا اظہار کرتے تھے۔اس طرح ہندو برطانوی سامراج کے منظور نظر ہو گئے۔''

ہندوؤں کو ہر طرح سے مسلمانوں کے خلاف بیدار کیا گیا اور ان کی متعدد انجمنیں انگریزوں کی سرپرستی میں قائم کی گئیں۔ جن میں: **بنگالی انڈین ایسوسی ایشن، بمبئی ایسوسی ایشن، مدارس ایسوسی ایشن اور اپر کلاس ہندو ایسوسی ایشن** خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہندوؤں کے احیا کی متعدد تحریکیں مثلاً: **برہموسماج، آریہ سماج، پراتھانا سماج** اور **رام کرشن مشن** جاری کی گئیں جن کا مقصد ہندوؤں میں بیداری پیدا کرنا اور مسلمانوں کے خلاف انہیں صف آرا کرنا تھا۔ ساتھ ساتھ ہندو پریس کو بھی قائم کیا گیا اور ہندو اخباروں کی ہر طرح سے سرپرستی کی گئی اور

مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے کی ہمت افزائی کی گئی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے شروع ہونے سے قبل ہندوستان میں ہندوؤں کے 485 اخبارات اور جرائد نکل رہے تھے جنہیں برطانوی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ 1875ء میں اے۔او۔ہیوم (A.OHume) نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی جس کو ہندو اپنی قومی جماعت سمجھنے لگے اور یہ جماعت مسلمانوں کے خلاف برطانوی منافرت کی زندہ مثال تھی۔

تحریک علی گڑھ کیا ھے۔؟

1857ء میں جنگ آزادی ہوئی۔ مسلمان اور ہندو اس جنگ میں انگریزوں کے برابر کے دشمن تھے، مگر سارا الزام مسلمانوں پر آ گیا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ اگر ایک طرف انگریزی کلچر عروج پکڑ رہا تھا تو دوسری طرف ہندو انگریز سرکار کی آنکھ کا تارا بنتے جا رہے تھے۔ مسلمانوں کے لیے یہ بہت بڑی مصیبت تھی کہ وہ انگریزوں سے نفرت کرنے کی وجہ سے تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ چکے تھے۔ چونکہ ان دنوں برصغیر میں انگریزی تعلیم کا رواج تھا۔ اور مسلمانوں کے تعلیم کے کاغذ کورے کے کورے رہ گئے تھے۔ اب ان کی ضرورت تھی کہ ان کو دِ بلا کا کوئی تعویز دیا جائے۔ اس کسمپرسی کی حالت سے نکلنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمان انگریزی کی تعلیم حاصل کرتے۔ اس کشمکش کی حالت میں اس طرز فکر نے سیاسی، مذہبی اور تہذیبی اصلاح کے لیے ایک تحریک کو جنم دیا جو ''علی گڑھ تحریک'' کے نام سے مشہور ہوئی اور اس کے بانی و قائد سرسید احمد خان قرار پائے۔

اس تحریک کے حوالے سے سرسید احمد خان کو ایک مدار کی حیثیت حاصل ہے یعنی یہ ساری تحریک انہی کے گرد گھومتی ہے۔ سادہ لفظوں میں یہ تحریک سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کاروں کی سیاسی، علمی اور ادبی مساعی اور کارناموں کا نام ہے۔

ڈاکٹر انور سدیدؒ کے بقول:

''علی گڑھ تحریک کا بیج 1857ء کی جنگ آزادی سے پھوٹا تھا۔ اگر یہ جنگ نہ ہوتی تو شاید اس تحریک کے محرک اوّل سرسید احمد خان کی زندگی کا دھارا مختلف سمت میں رواں ہوتا اور وہ اپنی شہرت میں ہی آسودگی محسوس کرنے لگتے۔''

الغرض 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر کے مسلمان جن مسائل کا شکار تھے، انہیں ان مسائل سے نکالنے کے لیے سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار نے جو خدمات انجام دیں، ان لوگوں کی ان خدمات کو کسمپرسی سے نکلنے کی ایک تحریک مانا جاتا ہے، چونکہ یہ تحریک علی گڑھ سے شروع ہوئی اسی لیے اس تحریک کا نام **''تحریک علی گڑھ''** مشہور ہو گیا۔ اور یہاں ہمارے مطلب کی بات یہ ہے کہ اس تحریک کے محرکین نے بہت ساری تصنیفی و تدریسی خدمات انجام دیں جو کہ اردو ادب کے ارتقاء میں ایک تشکیل نو مانی جاتی ہیں اور یہ عہد اردو نثر کے لیے ہیرے جیسا قیمتی عہد شمار ہوتا ہے۔ مزید ان محرکین کی 'مضمون نویسی'، 'سوانح نگاری' اور 'تنقید' کے میدان میں خدمات کا مفصل جائزہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

02- سر سید احمد خانؒ کی خدمات:

تعارف:

جوادالدولہ عارف جنگ سرسید احمد خاں بہادر، کے۔سی۔ایس۔آئی ہندوستان کے مشہور لیڈر اور ایک فصیح البیان، جلیل القدر مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم فلسفی، ریفارمر اور مدبر تھے۔ان کی قابلیت، ان کی ہر دلعزیزی اور ان کی مقناطیسی قوت کے اثر سے بہت سے قابل اہلِ علم وفضل ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔جن کے ادبی کارناموں سے نہ صرف ادبِ اردو مالا مال ہوا بلکہ کہ وہ ایک طرزِ خاص کے موجد ہوئے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے طرز زندگی اور معاشرت پر ان کی مساعی جمیلہ کا بہت گہرا اثر پڑا۔سید صاحب کی پوری زندگی مختلف شعبوں اور مشاغل پر مشتمل ہے لہٰذا ہم ان سب سے قطع نظر کر کے یہاں ان کا ذکر صرف ایک ادیب اور قومی لیڈر کی حیثیت سے کرنے جا رہے ہیں۔

مختصر حالاتِ زندگی:

سید صاحب 1817ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ان کا خاندان عالی مرتبت اور اعزاز کے لحاظ سے ایک مشہور خاندان تھا۔ان کے آباء و اجداد جو ابتداً عرب نژاد تھے، دمغان آئے اور وہاں کچھ دن قیام کر کے ہمدان اور پھر ہرات پہنچے۔ان کے بزرگ شاہجہان کے دور میں ہندوستان آئے اور یہاں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہوئے۔عالم گیر ثانی نے سید صاحب کے دادا کو جوادالدولہ کا خطاب دیا تھا اور سکسینہ صاحب کے بقول یہی لقب حسنِ اتفاق سے خود سید صاحب کو بھی عنایت ہوا۔سرسید کے والد سید محمد تقی کو شاہ عالم گیر ثانی نے اپنا وزیر بنانے کی پیش کش کی تو انہوں نے اپنی بزرگی اور قناعت پسندی کی وجہ سے اس عظیم پیش کش کو ٹھکرا دیا۔سید صاحب کی والدہ عزیز النساء بیگم بھی ایک روشن دل خاتون تھیں۔انہوں نے سید صاحب کی نہایت عمدہ پرورش کی اور انہیں عصری تقاضوں کے موافق تعلیم دلوائی۔سرسید احمد خان کی خوش نصیبی تھی کہ انہوں نے ایسا زمانہ پایا کہ جس میں غالبؔ، صہبائیؔ، آزردہؔ، شیفتہؔ اور مومنؔ وغیرہ جیسے زندہ دل اربابِ کمال موجود تھے۔سکسینہ صاحب نے لکھا ہے کہ سید صاحب کو مرزا غالبؔ سے اس قدر ارتباط تھا کہ وہ مرزا صاب کو ''چچا'' کہتے تھے۔

1838ء میں سید صاحب دلی میں بعہدۂ سرشتہ داری مقرر ہوئے اور یہ ان کی پہلی ملازمت تھی۔1839ء میں نائب میر منشی اور 1841ء میں امتحان منصفی پاس کر کے منصف مقرر ہوئے۔1846ء سے 1854ء تک دلی کے صدر الامین رہے اور اسی زمانے میں اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید لکھی۔

سرسید احمد خانؒ کی خدمات:

سرسید احمد خانؒ کی خدمات کو مندرجہ ذیل دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔تعلیمی خدمات

2۔ادبی خدمات

1۔ تعلیمی خدمات

تعلیم کے میدان میں سرسید احمد خانؒ نے مندرجہ ذیل گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام	آل انڈین محمدن ایجوکیشنل کانفرنس
مدرسۃ العلوم (ایم۔اے۔او ہائی اسکول) کا قیام	علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام
ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کا قیام	شفاخانہ اور یتیم خانہ کا سنگ بنیاد (اخلاقی خدمت)

ذیل میں مندرجہ بالا نکات کی وضاحت پیش کی جارہی ہے۔

سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام :

1862ء میں سرسید احمد خانؒ غازی پور چلے گئے۔ وہاں انہوں نے محسوس کیا کہ جب تک انگریزی کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کر کے مسلمانوں کو نہ پڑھائے جائیں تب تک وہ انگریزی کلچر سے کماحقہٗ واقف نہیں ہو سکتے۔ اور عربی و فارسی کی کتابیں بھی آسانی پیدا کرنے کے لیے اردو میں ترجمہ کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ اسی غرض سے انہوں نے 9 جنوری 1864ء کو ایک مجلس کی بنیاد رکھی جس کا نام ''سائنٹیفک سوسائٹی'' رکھا گیا۔ ڈیوک آف آرگائیل جو اس زمانے میں سکریٹری آف اسٹیٹ ہند تھے اس سوسائٹی کے مربی (پیٹرن) اور لفٹنٹ گورنر پنجاب و بنگال اس کے وائس پیٹرن بنائے گئے۔ شروع شروع میں اس سوسائٹی کا صدر دفتر غازی پور میں تھا اس کے بعد سید صاحب کا تبادلہ علی گڑھ میں ہو گیا تو ان کے ساتھ یہ سوسائٹی بھی علی گڑھ میں منتقل ہو گئی۔ 6 جون 1864ء کو سوسائٹی ممبران کا ایک جلسہ ہوا جس میں 28 کتابوں کے ترجمے کی تجویز منظور کی گئی۔ 8 جولائی 1865ء کو اٹھارہ کتابیں شائع کرنے کی تجویز پیش ہوئی۔ سرسید نے ان کتابوں کی اشاعت کے لیے ہندوستان کے راجوں مہاراجوں اور جوانوں سے چندے وصول کیے الغرض ان کتب کی اشاعت کے لیے ہر ممکنہ کوشش کی اور اپنا ذاتی پریس سوسائٹی کے لیے عطیہ کر دیا۔ 1887ء میں یہ سوسائٹی مدرسۃ العلوم میں ضم کر دی گئی۔

ڈاکٹر انور سدیدؒ لکھتے ہیں کہ:

''سرسید نے جو علمی و سیاسی خدمات سرانجام دیں، ان میں غازی پور کے مدرسے اور سینٹیفک سوسائٹی کا قیام بڑے اہم منصوبے تھے۔ مدرسے کا مقصد نونہالانِ وطن کو نئی تعلیم سے روشناس کرانا تھا اور سوسائٹی کا مقصد بڑوں کو علم نو سے متعارف کرانا۔ انگریزی تعلیم چونکہ مذہب کے خلاف تصور کی جارہی تھی، اس لیے اس سوسائٹی نے علمی اور تاریخی کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا۔'' (اردو ادب کی تحریکیں)

اس سوسائٹی کی جانب سے ایک اخبار نکالا گیا جس کا نام ''اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ'' تھا۔ 30 مارچ 1866ء کو اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ جولائی 1877ء میں اس اخبار کا نام ''علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ'' رکھ دیا گیا۔ پہلے پہل یہ ایک ہفت روزہ تھا پھر اس کو سہ روزہ کر لیا گیا۔ 1897ء میں اسے تہذیب الاخلاق کے ساتھ ملا کر شائع کیا گیا۔ اور اس کا نام ''علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ معہ تہذیب الاخلاق'' رکھا گیا۔ جنوری 1901ء کے بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ بعد میں نواب وقار الملک نے اسے دوبارہ جاری کیا اور انہی کی زیر ادارت چھپتا

رہا۔ پہلے اس کے مدیر محمد یار خان تھے، پھر سرسید اس کے مدیر بنے اور 1869ء سے 1877ء تک مولوی محمد اسماعیل اس کے ایڈیٹر رہے۔ ان کے بعد سرسید احمد خانؒ تاحیات اس کے ایڈیٹر رہے۔

مدرسۃ العلوم (ایم۔ اے۔ او ہائی اسکول) کا قیام:

مدرستہ العلوم کا دوسرا نام ایم۔اے۔او ہائی اسکول تھا۔1870ء میں انگلستان سے واپس آ کر ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کے بعد **''محمدن کالج فنڈ کمیٹی''** کی تشکیل گئی چنانچہ 24 مئی 1875ء کو سر ولیم نے اس مدرسہ کا افتتاح کیا۔

ایم۔ اے۔او کالج علی گڑھ کا قیام:

''محمدن کالج فنڈ کمیٹی'' کے سیکریٹری کے پاس کافی مقدار میں فنڈ جمع ہو گیا تھا اور حکومت نے سالانہ 4000 روپے کی گرانٹ کی منظوری بھی دے دی تھی۔ جس سے کالج کی عمارت کا تعمیری کام شروع کیا گیا۔ 8 جنوری 1877ء کو وائسرائے لارڈ لٹن نے ایم۔اے۔او کالج کا افتتاح کیا۔ ان دنوں سید صاحب ریٹائر ہو کر علی گڑھ میں مقیم تھے اور انہوں نے اپنی باقی کی زندگی کالج کے نام وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کالج میں اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دی گئی اور مشرقی علوم کی ترویج میں اس کالج نے بہت نمایاں کردار ادا کیا۔

آل انڈین محمدن ایجوکیشنل کانفرنس:

سرسید احمد خانؒ کا خیال تھا کہ صرف ایک کالج پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ناکافی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے 1886ء میں انہوں نے **''آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس''** کی بنیاد رکھی اور خود اس کے افتتاحی جلسے کی صدارت کی۔ کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں کہا کہ:

> **''اگرچہ ہم ایک قوم ہیں مگر ایک جگہ کے رہنے والے دوسری جگہ کے رہنے والے مسلمانوں کے قومی مسائل اور حالات سے بالکل ناواقف ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ کُل ہند قوم کے نمائندے ایک جگہ جمع ہو کر اپنے مسائل کا باہمی تبادلہ کیا کریں اور ان کے حل کی کوشش کریں۔''**

علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام:

ایم۔اے۔او کالج نے تعلیمی میدان میں بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔ اس کالج میں 1877ء سے بیسویں صدی کے آغاز تک بہت سے ہونہار طلبہ فیض یاب ہو کر نکلے۔ اب ان طلباء اور عوام الناس کی پرزور فرمائش تھی کہ اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے۔ چنانچہ سر آغا خان کی قیادت میں ایک تحریک شروع کی گئی جس نے 30 لاکھ روپے جمع کر لیے اور 1920ء میں یہ لوگ اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ تحریک آزادی (تحریک پاکستان) کے اکثر نوجوان اسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔

شفاخانہ اور یتیم خانہ کا سنگ بنیاد :

سرسید احمد خان جب مراد آباد میں صدر الامین کی حیثیت سے گئے تو انہوں نے وہاں مسلمانوں کی جانیں بچانے اور ان کی جائیدادوں کو ضبطی سے نکالنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ یہاں انہوں نے ایک شفاء خانہ اور ایک یتیم خانہ بھی قائم کیا ہندو اور مسلمانوں کو بلا تفریق سہولیات مہیا کی گئیں۔

2۔ ادبی خدمات:

ادب کے میدان میں سید صاحب نے مندرجہ ذیل تصنیفی خدمات سرانجام دیں۔

نام تصنیف	سن اشاعت	دیگر تفصیلات
آثار الصنادید		یہ سرسید کی پہلی تصنیف ہے۔اس میں دلی کے مشہور مقامات اور آثار قدیمہ کے علاوہ اس زمانے کے کاملین ،فقراء، علماء اور شعراء وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا اور گارسن ڈیٹاسی نے فرنچ میں بھی اس کا ترجمہ کیا جو 1861ء میں شائع ہوا۔
جلاء القلوب	1842ء	اس کتاب میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادت باسعادت کا حال مذکور ہے۔
تحفہ حسن	1844ء	
تحصیل فی جرح السائل	1845ء	یہ کتاب ''معیار العقول'' کا ترجمہ ہے۔
فوائد الافکار	1846ء	
قول متعین	1846ء	
کلمۃ الحق	1849ء	
راہ سنت	1850ء	
سلسلہ ملوک ہند	1852ء	اس میں راجہ جدھشٹر کے وقت سے دلی کے بادشاہوں کے حالات لکھے ہوئے ہیں۔
ترجمہ کیمیائے سعادت	1853ء	
تاریخ سرکشی بجنور		1855ء میں سید صاحب بجنور منتقل ہو گئے تھے جہاں انہوں تاریخ بجنور لکھی۔مزید 1857ء میں سرسید نے انگریزوں کی وفاداری کا نقطہ نظر بیان کیا ہے جو جنگ کے دوران سرسید نے انگریزوں کی طرفداری کی تھی۔

آئین اکبری کی تشریح وتحشی		سید صاحب نے آئین اکبری کی تصحیح وتحشی کی ۔آئین اکبری کے انگریزی کے مترجم ''مسٹر بلاک مین'' سید صاحب کی کاوش کے معرف اوران کی تصحیح کے معترف ہیں۔
تبین الکلام	1860ء	یہ کتاب بائیبل کی تفسیر ہے۔جس کوقدیم روش کے مسلمانوں نے ناپسند کیااوراس پرنکتہ چینی کی مگراہل یورپ نے اس کی بہت قدر کی۔اس تفسیر کے لکھنے کا مقصد مسلمانوں اور انگریزوں کے تعلقات کوبہتر بنانا تھا۔
رسالہ اسباب بغاوت ہند	1863ء	سید صاحب نے یہ رسالہ 1858ء میں تصنیف کیا اور 1863ء میں شائع ہوا۔اس رسالے میں انگریزوں پرتنقید کی گئی۔
وفادار مسلمانانِ ہند		
تاریخِ فیروزشاہی کی تصحیح		انہوں نے ایشیاٹک سوسائٹی کی فرمائش پر برنی کی ''تاریخ فیروزشاہی'' کی تصحیح بھی کی تھی۔
رسالہ احکام طعام اہل کتاب	1866ء	اس کتاب میں ثابت کیا گیا کہ عیسائیوں کا ذبح مسلمانوں پرحلال ہے۔اس کی تصنیف کی وجہ سے مذہبی لوگوں میں ایک شورش پیدا ہوگئی اورسید صاحب بہت بدنام ہوئے۔
رسالہ تہذیب الاخلاق	1870ء	یہ رسالہ 24 دسمبر 1870ء شائع ہوا۔یہی رسالہ سرسید کے نظریات کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔اس ماہنامے کی وجہ سے مسلمانانِ ہند کے خیالات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوگیا۔اس رسالے کے چھاپنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ سرسید احمد خان اپنے بیٹے محمود کے ساتھ انگلینڈ گئے تھے وہاں انہوں نے ایڈیسن اور سٹیل کے رسالے ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر پڑھے جن کے مطالعے نے سرسید کومتاثر کیا اورلندن سے واپس آکر انہوں نے اسی طرز میں تہذیب الاخلاق کی اشاعت شروع کی۔

تفسیر قرآن		اس کی چھ جلدیں شائع ہوئی تھیں ۔مگر یہ نصف قرآن تک پہنچیں ۔پہلی جلد 1297ھ میں طبع ہوئی تھی ۔اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ قرآنی واقعات پر بائیبل کے قصوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاد، دوزخ، بہشت اور معراج پر دوسرے لوگوں نے جونکتہ چینیاں کیں ان کا شافی جواب دیا گیا ہے ۔بعض تاویلوں ، غیر مستند احادیث اور ضعیف روایات سے احتراز کی ہدایت کی گئی جس سے قدیم ذہن کے مذہبی لوگ ان کے مخالف ہو گئے سید صاحب کو کافر اور ملحد کے خطابات دیئے گئے ۔اکثر اخبارات ورسائل صرف اسی غرض سے شائع کیے گئے کہ سید صاحب کے خیالات کو ہوا کیا جائے ۔اردو کے مشہور ظریف اخبار 'اودھ پنچ' میں سید صاحب کے مزحیہ کارٹون نکالے گئے اور ان پر مسخرے کیے گئے ۔مگر سید صاحب ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن رہے۔
خطباتِ احمدیہ		سرسید نے انگریز ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' دیکھی جس میں اسلام پر حملے کیے گئے اور سیر طیبہؐ پر بے بنیاد الزامات لگائے گئے تو سید صاحب سے برداشت نہ ہوا اور انہوں نے اپنی ضروریات کا اکثر سامان بیچ ڈالا اپنے گھر کو رہن رکھا اور دستوں سے ادھار لے کر اس کتاب کا نہایت ہی مدبرانہ جواب تحریر کیا جو انگریزی میں تھا اور بعد میں اس کو اردو میں ''خطباتِ احمدیہ'' کے نام سے ترجمہ کر کے شائع کیا گیا۔خود ولیم میور نے بھی سید صاحب کے جواب پر گہرے اطمینان کا اظہار کیا۔
سیرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)		یہ کتاب سیر طیبہؐ پر ایک بہترین تگ دو ہے۔
رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا		اس رسالے کے تین پرچے نکالے گئے جن میں واضح کیا گیا کہ مسلمان انگریزوں کے بدخواہ نہیں ہیں۔

ڈاکٹر انور سدیدؒ اپنی کتاب اُردُو ادب کی تحریکیں میں لکھتے ہیں کہ:

''کچھ مفکرین نے تصادم کی پالیسی کے بجائے مستقبل کی کھڑکی سے جھانک کر نظریات وافکارِ تازہ کے حصول کے لیے اپنی اپنی اقوام کو راغب کیا۔ان رہنماؤں میں سرسید احمد خان اور راجہ موہن رائے کی کوششیں صدیوں یاد رکھی جائیں گی۔''

جناب سید صاحب کا اندازِ تحریر:

یقیناً سید صاحب اردو جرائد نگاروں میں ایک بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں ۔ان کا قلم بہت زبردست اور ان کا تجزیہ علمی بہت اعلیٰ تھا۔ان کا

طرز تحریر زوردار مگر صاف اور سادہ ہے۔ اس میں کسی قسم کی عبارت آرائی نہیں ۔کچھ غلطیاں بھی اس میں نکلیں گی مگر سید صاحب قواعد اور صرف ونحو کی پابندی کی مطلق پروانہیں کرتے تھے وہ مقررہ قواعد اور انشاء پردازی سے بالکل بے نیاز تھے۔مگر یہی چیز انکی شہرت اور قابلیت کو نقصان پہنچانے کے بجائے اس میں اور اضافہ کرتی تھی۔ان کے طرزِ جدید نے قدیم تصنع نگاری پر جو بیدلؔ اور ظہوریؔ کی فارسی کی تقلید میں اردو میں بھی برتی جاتی تھی ایک ضرب کاری لگائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں تصنع سے زیادہ خوبیاں ہیں۔ **''مضمون کو دیکھو اور عبارت آرائی سے غرض نہ رکھو۔''** پر سید صاحب کا عمل تھا اور حقیقت میں یہی حال ان کی تمام تحریروں کا ہے۔ان کی عبارت ان کے ادائے مطالب میں کبھی قاصر نہیں ہوتی ان کو زبان پر عبور حاصل ہے۔نثر اردو لکھنے میں وہ ایسے مشتاق تھے کہ اس میں کوئی ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔مولانا حالیؔ تو ان کو اردو کا مورثِ اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔

بقول مولانا حالیؔ:

''وہ تحریر یا تقریر کی رو میں گرائمر کی کچھ پروانہیں کرتے تھے وہ ان
قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں بالکل آزاد تھے۔''

سید صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضمون کو خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی نہایت صاف اور بے تکلف زبان میں ادا کر سکتے تھے۔اور نیز اپنے مضامین کے حسن وقبح کو بھی نہایت زوردار الفاظ میں وضاحت سے پیش کر سکتے تھے۔ مگر سید صاحب اور غالبؔ کے معاصرانہ تعلقات کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرزا کی طرز خاص کا سید صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے اس کا نقش اول غالبؔ کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔

03-تحریک علی گڑھ کے دیگر محرکین کی خدمات:

تحریک علی گڑھ میں سید صاحب کے علاوہ مندرجہ ذیل محرکین شامل ہیں۔

01۔مولانا شبلی نعمانیؒ

02۔مولانا الطاف حسین حالیؒ

03۔نواب وقار الملک

04۔نواب محسن الملک

05۔مولوی چراغ علی

06۔مولوی ذکاءاللہ

مندرجہ بالا شخصیات **علی گڑھ تحریک** کا حصہ ہیں۔ نیچے **''اردو ادب کی تشکیل نو''** میں ان احباب کا مطلوبہ تذکرہ کیا جائے گا۔ کیونکہ یہی لوگ جہاں تحریک علی گڑھ کا حصہ ہیں وہاں یہ اردو ادب کی تشکیل نو میں بھی نہایت معتبر نام ہیں۔

اُردُو ادب کی تشکیلِ نو

سب سے پہلے تو ہم عناصر خمسہ کے بارے میں جان لیتے ہیں کہ وہ کون کون سی شخصیات ہیں اور ان کے کیا کیا کارنامے ہیں۔اردو ادب کی تشکیل نو کے لیے سید مہدی آفادی کے مطابق سب سے اہم پانچ شخصیات ہیں جنہوں نے اردو زبان کو پختگی عطا کی ہے۔انہوں نے ان پانچ شخصیات کو ارکانِ خمسہ کا نام دیا ہے، وہ ارکانِ خمسہ مندرجہ ذیل ہیں۔

اردو کے ارکان خمسہ

سرسید احمد خان	پروفیسر محمد حسین آزاد	ڈپٹی نذیر احمد	مولانا الطاف حسین حالی	مولانا شبلی نعمانی

اردو ادب کے ان پانچ ستاروں کے بارے میں سید مہدی افادی لکھتے ہیں کہ:

''میری غرض لائق عزت، سرسید، پروفیسر آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی سے ہے۔جن کے علم کے سائے میں کل کی چھوکری یعنی اُردُو اتنی روادار ہوگئی کہ، السنہء یورپ، یعنی مغربی بہنوں سے بے تکلف آنکھیں ملا سکتی ہے۔''

اب ان مصنفینِ خمسہ کی خدمات کا سرسری مطالعہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

01۔مولانا سر سید احمد خان

سرسید احمد خان کا ذکر پچھلے صفحات پر علی گڑھ تحریک کے باب میں کیا جا چکا ہے۔

02۔مولانا محمد حسین آزادؔ کی خدمات:

آپ مولوی باقر علی کے فرزند تھے۔آپ کے والد ''دہلی اردو اخبار'' کے مدیر تھے۔اس کے علاوہ مولوی باقر علی نے شمالی ہندوستان میں مضمون نویسی میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔وہ ذوقؔ کے دلی دوست تھے۔اسی طرح آزادؔ کی ابتدائی تعلیم استاد ذوقؔ کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔انہی کی شاگردی میں آزادؔ نے شاعری شروع کی۔ذوقؔ کی وفات کے بعد حکیم آغا جان عیشؔ سے اصلاح لیتے تھے۔آزادؔ پرانے دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے، جس سے مولوی نذیر احمد، ذکاءاللہ اور ماسٹر پیارے لال آشوب جیسے لوگ تعلیم حاصل کر کے نکلے تھے۔ استاد ذوقؔ کے ساتھ بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی تھی اور اعلیٰ پائے کے شعراء سے روشناس ہوئے تھے۔آزادؔ کے والد کو دلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ٹیلر کے قتل کے الزام میں پھانسی دی گئی تھی۔1857ء کے غدر کے بعد آزادؔ انگریزوں کی نظر میں ایک غدار تھے۔اپنی جان بچانے کے لیے آزادؔ اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور سرگرداں پھرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔آزادؔ کے پاس موجود ان کا اپنا کلام اور ان کے استاد محمد ابراہیم ذوقؔ کا کلام غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔غدر کی مصیبت کے بعد آزادؔ نے کسب معاش کے مختلف ذرائع اختیار کیے۔کچھ دنوں تک ایک فوجی اسکول میں ماسٹر رہے اور کچھ دنوں بعد یہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔آخر کار پھرتے پھراتے 1864ء میں لاہور پہنچے۔ اور مولوی رجب علی کے ذریعہ سے لفٹنٹ گورنر کے میر منشی پنڈت من پھول سے ملے جن کی سفارش سے سررشتہ تعلیم کے محکمہ میں 15 روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔چھوٹا عہدہ دار ہونے کی وجہ سے ان کو اتنا موقع نہیں ملتا تھا کہ بڑے بڑے سرکاری افسروں سے مل پاتے، جو ان کی

لیاقت اور قابلیت کے حساب سے ان کو عہدہ دلواتے۔ اتفاق سے اپنے دوست ماسٹر پیارے لال آشوب کے ذریعے سے محکمہ تعلیم کے سرشتہ دار میجر فلر صاحب تک رسائی حاصل ہوئی۔ میجر صاحب علوم والسنہ مشرقیہ سے کمال ذوق رکھتے تھے اور رسائی کی صورت یہ ہوئی کہ میجر صاحب نے لفظ ایجاد کو مؤنث لکھا تھا جس کی نسبت تذکیر و تانیث کا کچھ شبہ تھا۔ ماسٹر پیارے لال نے آزاد کو بلایا اور ان سے اس کی بابت دریافت کیا گیا۔ انہوں نے ''ایجاد'' کو مذکر کہا اور جب سند مانگی گئی تو سودا کا یہ شعر پڑھا۔

؎ بھڑ دے کا ایجاد ہے
نسخہ میں معجون زرنباد ہے (مرزا رفیع سودا)

اسی دن سے آزاد کی میجر صاحب تک رسائی ہوگئی اور ان کی کچھ ترقی بھی ہوئی۔ سب سے پہلے اردو اور فارسی کی درسی کتابیں لکھنے پر مامور ہوئے چنانچہ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب۔ اردو کی پہلی، دوسری اور تیسری اور قصص ہند اس زمانے کی ان کی مشہور تصنیفات ہیں جو اپنے زمانے میں نہایت مقبول ہوئیں۔ انہی تصنیفات کی وجہ سے پنجاب میں اسکولی تعلیم بہت عام ہوئی۔ آزاد کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ انہوں نے انجمن پنجاب کے قیام میں بہت بڑا حصہ لیا جس کی وجہ سے صوبہ پنجاب میں اردو کی ترقی اور ترویج ہوئی۔ میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر تعلیم مقرر ہوئے۔ سکسینہ صاحب کے بقول کرنل صاحب موصوف کو اردو زبان کا محسن سمجھنا چاہئے۔ 1874ء میں آزاد نے کرنل صاحب کو قائل کر کے انجمن پنجاب کی سرپرستی میں خود انجمن پنجاب کے سیکرٹری کی حیثیت سے مشاعرہ نظم جدید کی بنیاد ڈالی۔ 1865ء میں بعض خفیہ مقاصد کے لیے آزاد نے پنڈت من پھول کی معیت (معنی: ہمراہی) میں ترکستان کا سفر اختیار کیا، کابل اور بخارا بھی گئے۔ دو مرتبہ ایران میں جانے کا موقع ملا: پہلی مرتبہ 1865ء میں اور دوسری مرتبہ 1873ء میں۔ فارسی زبان کا عالم ہونے کی وجہ سے یہ سفر مولانا صاحب کے لیے مفید ثابت ہوا۔

کرنل ہالرائڈ نے ایک سرکاری اخبار **''اتالیقِ پنجاب''** کے لیے آزاد کو 75 روپے ماہوار پر سب ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ پیارے لال آشوب اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ تھوڑے عرصے بعد یہ اخبار بند ہو گیا اور اس کی جگہ **''پنجاب میگزین''** نکالا گیا تو آزاد اس کے بھی سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد مولانا حالی کچھ دن تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر رہے۔ اور 1887ء میں ملکہ وکٹوریہ کے گولڈن جوبلی کے موقع پر ان کی قابلیت کے صلہ پر ان کو **''شمس العلماء''** کا خطاب دیا گیا۔

اپنی بیٹی کی بے وقت موت، سفر ایران کے تعب (تھکاوٹ) اور دماغی کاموں کی محنت کی وجہ سے ان کی دماغی حالت خراب ہوگی۔ ساری عمر آپ کو اس دماغی بیماری نے نہ چھوڑا آخر کار 22 جنوری 1910ء کو لاہور میں اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی۔

شمس العلماء محمد حسین آزاد کی تصنیفات

فارسی ریڈریں (دو جلدیں)	آبِ حیات	نظم آزاد
قدیم اردو ریڈریں (تین جلدیں)	نیرنگِ خیال	دربار اکبری
نئی اردو ریڈریں (تین جلدیں)	سخندانِ فارس	نگارستانِ فارس

اردو کا قاعدہ وقواعد اردو	قند پارسی	سپاک ونماک
قصص ہند	نصیحت کا کرن پھول	جانورستان
جامع القواعد	دیوانِ ذوق	ڈرامہ ''اکبر'' 1882ء

آزاؔد کا طرزِ تحریر

مولانا آزاؔد اپنی تحریر میں جدید رنگ کے ساتھ قدیم رنگ کے بڑے ماہر تھے۔آپ کا طرزِ تحریر لاثانی ہے جس کی پیروی محال ہے۔ان کی تحریر میں عربی وفارسی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اور دوراز کار ضائع بدائع کا کہیں وجود نہیں ہے۔ان کی عبارت کی یہ خاص شان ہے کہ بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی، انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کے حسن کا اس میں حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ان کی تحریر میں تصنع اور تکلف نہیں پایا جاتا مگر لطیف استعارے اور تشبیہوں سے اس کو خوبصورت بنایا گیا ہے۔انگریزی انشاء پردازوں میں ڈی کوئینسی، لیمب اور اسٹیونسن جیسے صاحبانِ طرز سے ان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ان کی انشاء پردازی کے بارے میں ڈاکٹر سدیدؒ کہتے ہیں۔

''آزاؔد اردو کے پہلے عظیم انشاء پرداز اور رومانی نثر کے بانیوں میں سے تھے۔'' [اردو ادب کی تاریخ: ڈاکٹر انور سدیدؒ (ص۔318)]

بقول رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو (ص۔473)

''مولانا شبلی ان کو اُردو کا ایک بہت بڑا ہیرو سمجھتے تھے اور ان کی مَوت پر ان کو خدائے اُردو کہہ کے یاد کیا۔''

شاعری میں آزاؔد کی بنیادی عطا نظم جدید کے مشاعرہ کا اجرا ہے۔اس مشاعرے میں آزاؔد نے ''برسات''، ''زمستان''، ''تہذیب''، ''امید''، ''حب الوطن'' اور ''قناعت'' کے موضوعات پر نظمیں پڑھیں۔لیکن یہ نظمیں زیادہ تر انجمن پنجاب کے دستور العمل اور مقاصد کی پیروی کرتی ہیں اور ان کی تخلیقی رو کمزور ہے۔آزاؔد جس قدر بلند پایہ نثار تھے اتنے پائے کے شاعر نہ تھے۔''جغرافیۂ طبعی کی پہیلی'' اور ترجمہ شدہ نظم ''جذبِ دوری'' میں انہوں نے نظم کو ردیف اور قافیہ کی بندش سے آزاد کر دیا اور اسی طرح آزاد نظم کی ہیئت کو مزید وسعت ملی۔

تصنیفاتِ آزاؔد کی وضاحت:

ریڈریں اور اسکولی کتابیں:

اسکول کے طالب علموں اور مبتدیوں کے لیے اردو اور فارسی کی ریڈریں اور صرف ونحو کے ابتدائی رسائل لکھے گئے۔ان کی عبارت کو نہایت آسان اور عام فہم رکھا گیا۔

قصص ہند:

اس کتاب میں تاریخ ہندوستان کے مشہور مشہور حالات اور واقعات کو عجیب اور پرزور عبارت میں لکھا گیا ہے۔ان قصوں نے طلباء اور عوام الناس دونوں میں یکساں مقبولیت حاصل کی ہے۔اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس کتاب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ

جملوں کا توازن، عبارت کی روانگی، الفاظ کی رنگینی اور مضامین کی ترتیب ہم جنس کتابوں سے اس کا رتبہ بلند کرتی ہے۔

آبِ حیات:

آب حیات مولانا کی وہ کتاب ہے جو کہ ان کا تعارف بن چکی ہے۔ حلقہ ادب میں آپ کو ''صاحبِ آبحیات'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کتاب میں مشہور شعراء کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کے نمونے موجود ہیں۔ ایک اور خوبی یہ ہے کہ شعراء کی غزلوں کے ساتھ ان غزلوں کی وجہ تصنیف لکھنے کے بعد ان پر ہلکی پھلکی تنقید بھی کی گئی ہے۔ اشعار کے ساتھ اضافی نوٹوں نے اس کتاب کی قدر و قیمت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے ابتدائی صفحات پر اردو کی مختصر تاریخ اور اس کے تغیرات کا ذکر کیا گیا ہے۔

بقول رام بابو سکسینہ:

''ادب اردو آزاد کا ممنون ہے کہ انہوں نے ایک باقاعدہ اور مفصل تذکرہ شعراء ترتیب دیا۔'' (تاریخ ادب اردو: ص۔459)

سکسینہ صاحب مزید اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''الحق آزاد نے آبحیات لکھ کر ادب اُردو میں ایک جدید طرز کا اضافہ کیا جو مثل حالی کے سادہ اور عاری از زیب و زینت نہیں اور نہ مولوی نذیر احمد کی طرح ثقیل اور وزنی ہے وہ ایک زوردار اور سب سے جدا رنگ رکھتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو احاطۂ بیان سے باہر ہیں اور صرف دل ان سے لطف اٹھاتا ہے۔'' (تاریخ ادب اردو: ص۔469-470)

اس کتاب میں ایک کمی یہ رہ گئی ہے کہ اس میں غیر معتبر حوالہ جات سے بھی مدد لی گئی ہے۔ کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے واقعات میں کمی بیشی کی گئی۔ اکثر شعراء کے ذکر میں مصنف پر جانب داری کا الزام عائد ہوتا ہے جیسے: مصنف کے استاد جنابِ ذوقؔ کی حد سے زیادہ تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مرزا غالبؔ کے حالات میں لاپرواہی اور ان کی قابلیت پر در پردہ چوٹیں لگائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ مرزا دبیر کے خاندان کو کم کر کے دکھانا اور انشاء کے آخری زمانہ کے غیر موثق حالات کا لکھنا اس کے معائب میں شمار ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود اس کتاب کی قدر و قیمت میں ذرا برابر بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔

اس کتاب کی وجہ سے اردو تنقید کا صحیح معیار سامنے آیا اور شاید حالیؔ کی ''یادگار غالبؔ'' اسی کتاب کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ الغرض تذکرے اور تنقید کے میدان میں یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔

نیرنگِ خیال:

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے اور 1880ء میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا آزادؔ نے اس کتاب میں خیالی قصوں اور خواب وغیرہ کے پردے میں عمدہ اور مثبت نتائج نکالے ہیں۔ اس کتاب کے نفس مضمون سے کہیں زیادہ اس کا طرزِ بیان دلچسپ ہے۔ انگریزی میں **ایڈیسن**، **جان بنین**، اور **اسپنسر** کے ایلیگری (معنی: خیالی قصے) مشہور ہیں۔ فارسی میں **''مثنوی مولانا روم''** اور **''انوار سہیلی''** مشہور ہیں۔ سنسکرت میں **''ہتوا پدیش''** کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اور اسی طرح عربی میں **''اخوان الصفا''** اپنی مثال آپ ہے۔ سکسینہ صاحب کا خیال ہے کہ آزادؔ نے اپنے قصوں کی بنیاد یونانی قصوں پر رکھی ہے اور اس سے ان کے یونانی علم الاصنام کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

دراصل ڈاکٹر لٹیر نے ان کو یہ کتاب لکھنے پر راغب کیا تھا اور خود ہی ان کو ایک خاکہ بنا کر دیا تھا۔ پھر آزاد کی قابلیت دیکھئے کہ انگریزی کم جاننے کے باوجود بھی وہ ان کی اتباع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اس کتاب نے آزاد کے اعلیٰ طرز تحریر کی نشاندہی کی ہے۔

قندِ پارسی:

قند پارسی کی زبان فارسی ہے اور یہ جدید فارسی سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کے سفرِ ایران کا ذکر بھی موجود ہے۔

نصیحت کا کرن پھول:

یہ کتاب نصیحت کے پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ اس میں مکالمے کا انداز ملتا ہے۔ اس کی عبارت نہایت صاف اور آسان ہے۔ بچوں اور عورتوں کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

دیوانِ ذوق:

آزاد نے اپنے استاد محمد ابراہیم ذوق کی شاعری کو ترتیب دے کر اس کو ضائع ہونے سے بچالیا۔ اس میں آزاد نے ذوق کے کلام کے غدر میں ضائع ہونے کا واقعہ نہایت دردناک الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اور پھر جن مشکلات کو جھیل کر آزاد نے یہ کلام اکھٹا کیا ہے اس کا بھی ذکر کیا گیا۔ دیوان کے ابتدائی صفحات میں ایک مختصر دیباچہ ہے اور بعض غزلوں کے ساتھ ان کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس دیوان سے بیشتر شائع ہونے والے ذوق کے کلام میں اضافہ نظر آتا ہے۔ یعنی مولانا نے استاد کا وہ کلام اکھٹا کر لیا تھا جو اس سے پہلے غیر مطبوعہ تھا۔

دربارِ اکبری:

یہ کتاب ہندوستان کے مغل بادشاہ شہنشاہ اکبر کے حالات پر اور اس کے زمانے کے باکمالوں کے حالات پر لکھی گئی ہے۔ اس میں عہد اکبری کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔

سپاک ونماک:

یہ تصنیف متصوفانہ خیال کا ایک غیر مربوط مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ان دنوں کی یاد ہے جب کہ مولانا کی دماغی حالت قدرے منتشر تھی مگر مولانا کا ذوقِ ادب اتنا تھا کہ جن لمحات میں ان کو دماغی بیماری سے سکون ملتا وہ اپنے ادبی کام شروع کر لیتے تھے۔

جانورستان:

اس میں کچھ جانوروں کے حالات اور ان کی زبانوں کا ذکر ہے۔ یہ بھی انہی دنوں کی تصنیف ہے جب مولانا کی دماغی حالت غیر تھی۔

نگارستانِ فارس:

یہ تصنیف ایران و ہندوستان کے فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں رودکی سے حزیں تک اور واقف سے آرزو تک تقریباً 36 شعراء کے حالات ان کے نمونہ کلام سمیت درج ہیں۔ اس کتاب کی زبان بہت سادہ ہے مگر آبِ حیات کی طرح پُر لطف نہیں ہے۔

ڈرامہ ''اکبر'':

آزاد نے 1882ء میں ایک ڈرامہ **''اکبر''** بھی لکھا تھا۔ یہ ڈرامہ آزاد کے تخلیقی اسلوب کا آئینہ دار ہے اور ادبی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ اس کے بارے ڈاکٹر انور سدید (مرحوم) لکھتے ہیں کہ:

''آزاد یہ ڈرامہ مکمل نہ کر سکے تھے۔ غالباً اس وقت ان کی ذہنی حالت غیر ہونا شروع ہو چکی تھی۔ رَہَس اور نوٹنکیوں کے اس دور میں ''اکبر'' کو اردو کا پہلا ادبی ڈرامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔'' (اردو ادب کی تاریخ۔ص۔317)

الٰہیات:

یہ مولانا موصوف کی آخری کتاب ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے پوتے نے ان کے نام سے شائع کی تھی۔

نظمِ آزاد:

آزاد کے بیٹے مولوی محمد ابراہیم نے 1899ء میں **''نظمِ آزاد''** کے نام سے اس کو شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں مندرجہ ذیل منظومات شامل تھیں۔

- مثنوی شرافت حقیقی معرفت الٰہی
- اسلام علیک جیسے چاہو سمجھ لو
- جغرافیہ طبعی کی پہیلی
- مبارکباد جشنِ جوبلی
- ایک تارے کا عاشق
- محنت کرو

03۔مولانا الطاف حسین حالیؒ

مولانا کا اصل نام خواجہ الطاف حسین اور حالیؔ تخلص تھا۔وہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔نثر میں ''حیاتِ جاوید'' اور شاعری میں ''مسدس حالی'' اپنی مثال آپ ہیں۔وہ 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔خواجہ ایزد بخش کے بیٹے تھے،ابھی 9 سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے ان کی پرورش کی۔اسلامی رواج کے مطابق پہلے قرآن شریف حفظ کیا اور اس کے بعد عربی کی تعلیم شروع کی۔17 سال کی عمر میں ان کی ارینج میرج ہوگئی۔اس کے بعد وہ دلی چلے گئے اور وہاں دو سال تک عربی صرف ونحو اور منطق پڑھتے رہے۔

1856ء میں حصار کے کلکٹر کے دفتر میں ملازم ہوگئے اور 1857ء میں پانی پت آ گئے۔3-4 سال بعد جہانگیر آباد کے رئیس مصطفیٰ خان شیفتہؔ کے بچوں کے اطالیق مقرر ہوگئے۔نواب شیفتہؔ کی معیت میں خواجہ صاحب کی شاعری نے عروج حاصل کیا۔تقریباً آٹھ سال تک شیفتہؔ سے مستفید ہوتے رہے اور اس کے بعد دلی چلے گئے اور وہاں مرزا غالبؔ کے شاگرد ہو لیے۔مرزا غالبؔ کی وفات کے بعد حالیؔ نے لاہور کا رُخ کیا اور یہاں گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت اختیار کر لی۔محمد حسین آزادؔ کے ساتھ مل کر لاہور میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی۔لاہور میں چار سال کے قیام کے بعد دلی چلے گئے اور وہاں اینگلو عربک کالج میں معلّمی کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوگئے۔وہاں ان کی ملاقات سر سید احمد خان سے ہوئی اور سید صاحب کے خیالات نے انہیں اس قدر متاثر کیا کہ ''مدوجزر اسلام'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔1904ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ریٹائرمنٹ کے بعد پانی پت میں سکونت حاصل کر لی اور 31 دسمبر 1914ء کو یہی پر وفات پائی۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ کی تصنیفات:

مولانا حالیؒ کی شہرہ آفاق کتب مندرجہ ذیل ہیں۔

مذہب:

01- **تریاقِ مسموم**: پانی پت کا ایک پادری عمادالدین جو پہلے مسلمان تھا اور بعد میں عیسائی ہو گیا تھا اس نے اسلام کے خلاف کچھ اعتراضات اٹھائے تھے۔اعتراضات کے نام پر اُگلے گئے اس زہر کے لیے مولانا حالیؔ نے 'تریاقِ مسموم' کے نام سے ایک تریاق تیار کیا۔گو کہ اس کتاب میں کوئی خاص ادبی خوبی نہیں ہے مگر پھر بھی یہ تصنیف مولانا حالیؔ کی ذکاوت طباعی کا پتہ دیتی ہے۔

02- **مولود شریف**:اس کتاب میں مولود پاک کے بارے میں حقائق وشواہد پائے جاتے ہیں۔

03- **رسالہ خیر المواعظ**:----------

04- **شواہد الہام**:----------

اخلاقیات:

05- **مجالس النساء**:یہ ایک انعامی رسالہ ہے۔واسرائے ہند لارڈ نارتھ بروک نے اس کتاب کے صلہ میں حالیؔ کو مبلغ 400 روپے انعام دیا

تھا۔ یہ عورتوں کے لیے بہترین کتاب ہے اور ایک عرصہ تک گرلز اسکولوں کے درسی نصاب کا حصہ رہ چکی ہے۔ اس میں بہت سے ایسے الفاظ ومحاورات ہیں جو شریف خاندانوں کی عورتیں بولتی ہیں۔

سوانح:

06- **حیاتِ سعدی:** یہ شیخ سعدی شیرازیؒ کی سوانح عمری ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کی وجہ سے مصنف نے اردو نثاروں کی صفِ اوّل میں جگہ پائی ہے۔ اس کتاب سے مولانا کی سوانح نگاری کے فن کی قابلیت اور اسلوب بیان کا پتہ چلتا ہے۔

07- **حیاتِ جاوید:** یہ مولانا سرسید احمد خان کی سوانح عمری ہے۔ یہ کتاب لکھ کر حالؔی نے نہ صرف سید صاحب کو زندہ کیا ہے بلکہ خود بھی اس تصنیف کی بدولت حیاتِ ابدی پائی ہے۔ اس کتاب میں سرسید کو ایک لیڈر، مدبر، ریفارمر اور اہل قلم کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ سید صاحب کے علاوہ ان کے اکثر رفقائے کاروں کے حالات بھی اس کتاب میں لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ہیرو کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہے اسی لیے شبلی کا یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ ''**اس کتاب میں تصویر کا صرف ایک رُخ دکھایا گیا ہے۔**'' معائب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے یا پھر ان کی توجیہ کر دی گئی ہے۔

08- **یادگارِ غالبؔ:** اس کتاب میں مرزا غالبؔ کی شخصیت، ان کے حالات وواقعات اور ان کے لطائف وظرائف وغیرہ کو سینچ کر ایک گلدستے کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہر قسم کے کلام پر ناقدانہ قسم کی نظر ڈالی گئی ہے۔ چونکہ حالؔی، غالبؔ کے شاگرد تھے اس لیے اکثر واقعات ان کے چشم دیدہ اور معتبر ہیں۔ اشعار میں مشکل الفاظ کے معانی کے ساتھ وہ حالات بھی لکھے گئے ہیں جن میں یہ شعر کہے گئے تھے۔ اس سے قارئین کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ جس طرح آزادؔ نے اپنے استاد ذوقؔ کا دیوان لکھ کر ان کو زندہ کر دیا تھا اسی طرح حالؔی نے بھی غالبؔ کے شاگرد ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس میں ایک بات کی کمی رہ گئی ہے وہ یہ کہ حالؔی، غالبؔ کے شیدائی تھے اور تنقید میں کہیں کہیں حد سے زیادہ جانب داری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ خیر ان باتوں کی زیادہ پرواہ اس لیے نہیں کرنی چاہئے کیونکہ یہ تنقید کے میدان میں اردو کی ابتدائی کتابوں میں سے ہے اور شروع شروع میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔

09- **سوانح حکیم ناصر خسرو:** حکیم ناصر خسرو کی مکمل سوانح حیات مولانا حالؔی نے ترتیب دی تھی۔

10- **تذکرۂ رحمانیہ:** مولانا عبدالرحمٰن کی وفات پر یہ کتاب چھاپی گئی۔

مضامین و انشاء:

11- **مضامینِ حالؔی:** اس کتاب میں حالؔی کے وہ مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بالخصوص رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ حالؔی نے رئیس مصطفیٰ خان شیفتہؔ کے مکتوبات کو بھی ترتیب دے کر چھپوایا تھا۔

12- **مقالاتِ حالؔی:** ----------

13- **مکاتیبِ حالؔی:** مولانا الطاف حسین حالؔی کے مکتوبات کو ترتیب دے کر ایک کتاب کی صورت میں چھاپا گیا ہے۔ ان کے علاوہ حالؔی نے رئیس مصطفیٰ خان شیفتہؔ کے مکتوبات کو بھی ترتیب دے کر چھپوایا تھا۔

تنقید:

14- **مقدمہ شعروشاعری:** یہ کتاب مولانا کی شہرت کا سنگِ بنیاد ہے اور دوسو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک تنقیدی کتاب ہے ۔اس میں یونانی ورومی اور انگریزی وعربی فنِ عروض کے نقادوں کے خیالات ،شعر کی بابت قلم بند کیے گئے ہیں۔ یورپین شاعری میں مولانا صاحب تہہ تک غوطہ نہیں لگا سکے کیونکہ وہ اس بحرِ علم کے شناور نہیں تھے۔ زبان کی عدم واقفیت کی وجہ سے سنسکرت شاعری کو بالکل چھوڑ دیا۔ ان سب باتوں کے باوجود شعری تنقید کی پہلی کتاب ہونے کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت آئے دن تر و تازہ ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی ہے جو مغربی تعلیم سے بالکل نا آشنا تھا۔ ان کی تنقید کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ:

''مقدمہ شعروشاعری (1893ء) لکھ کر باقاعدہ تنقید نگاری کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے ساتھ اس سلسلہ میں شبلی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ان دونوں نے سوانح عمریاں لکھ کر اردو کو نئی روش سے آشنا کیا۔ ادھر شبلی نے تاریخ میں جو کام کیا وہ آج بھی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ نذیر احمد نے ناول نویسی کا آغاز کیا۔ محمد حسین آزاد جدید نظم کو متعارف کرنے کا باعث بنے۔''

(اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ ص 336-337)

شاعری اور نظمیں:

15- **دیوانِ حالی:**----------

16- **مجموعہ نظمِ حالی:**----------

17- **ضمیمہ اردو کلیاتِ حالی:**----------

18- **برکھا رُت:**----------

19- **مسدس حالی:**----------

20- **حب الوطن:**----------

21- **انتخاب کلامِ داغ:** مولانا حالی نے یہ کتاب لکھنی شروع کی تھی مگر مکمل نہ کر سکے تھے بعد میں سجاد حسین اور محمد اسماعیل پانی پتی نے اس کو تکمیل کا جامہ پہنایا۔

متفرق کتب:

22- **اصولِ فارسی:**

23- **طبقات الارض:** یہ کتاب ڈاکٹر لٹیر کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہوئی تھی۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں تھی اس کو کسی نے عربی میں ترجمہ کیا تھا اور مولانا حالی نے اسی عربی کتاب کو اردو میں ''طبقات الارض'' کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب مبادی جیالوجی پر مبنی ہے۔

24- **منطق** پر ایک رسالہ لکھا جو 1854ء میں تالیف ہوا۔

04۔مولانا ڈپٹی نذیر احمدؒ

مولوی نذیر احمد با اختلافِ روایات 1834ء یا پھر 4 دسمبر 1831ء کو ضلع بجنور کی ایک تحصیل نگینہ کے گاؤں ریہڑ میں پیدا ہوئے۔ ایک مشہور بزرگ شاہ عبدالغفور اعظم پوری کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔لیکن آپ کے والد مولوی سعادت علی ایک غریب آدمی تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر بجنور مولوی نصراللہ کے پاس بھی پڑھتے رہے۔چودہ سال کی عمر میں دلی چلے گئے اور وہاں اورنگ آبادی مسجد کے مدرسے میں داخل ہو گئے جہاں مولوی عبدالخالق ان کے استاد تھے جن کی پوتی سے انہوں نے عقد بھی کیا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی حالت اچھی نہ تھی۔دہلی کے آس پاس برائے نام مغل بادشاہت قائم تھی۔دینی مدارس کے طلباء محلے کے گھروں سے روٹیاں لا کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔مجبوراً نذیر احمد کو بھی یہی کچھ کرنا پڑتا تھا۔بلکہ ان کے لیے تو پریشانی یہ تھی کہ وہ جس گھر سے روٹی لاتے تھے اس میں ایک ایسی لڑکی رہتی تھی جو پہلے اس سے ہانڈی کے مصالحہ تیار کرواتی یعنی مرچیں پسواتی ، پیاز کٹواتی اور دھنیاں اور لہسن وغیرہ کُٹواتی تھی اور پھر روٹی دیتی تھی۔اور اگر کام کرتے ہوئے نذیر احمد سستی کرتے تو ان کی انگلیوں پر سل کا بٹہ مارتی تھی۔یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔

دلی کالج میں عربی کے مشہور پروفیسر مولوی مملوک علی کے اصرار پر آپ نے دلی کالج میں داخلہ لیا۔وہاں عربی ادب،فلسفہ اور ریاضی میں مہارت حاصل کی۔کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کے کہنے پر انگریزی پڑھنی بھی شروع کی مگر اپنے والد کی مخالف کی وجہ سے چھوڑنی پڑی۔اس زمانے میں حالؔی،آزادؔ،منشی کریم الدین،مولوی ذکاءاللہ اور پیارے لال ان کے ہم سبق تھے۔

مولانا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک مدرس کی حیثیت سے کیا اور دن رات کی محنت اور اپنی قابلیت سے جلد ہی ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے تب آپ کی تنخواہ سو روپے ماہوار ہو گئی تھی۔غدر کے دنوں میں انہوں نے کسی مَیم کی جان بچائی تھی جس کے صلہ میں سرکار سے ایک تمغہ اور کچھ زر نقد انعام بھی ملا تھا۔انسپکٹر مدارس سے ان کی ترقی ہوئی اور ان کا تبادلہ الہٰ آباد میں ہو گیا۔اور یہیں پر مولوی صاحب نے انگریزی میں بھی اچھی خاصی دسترس حاصل کر لی تھی اور 1861ء میں ان کو دوسرے رفقاء کے ساتھ انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ کرنے پر معمور کیا گیا ۔اس کتاب کا ''تعزیراتِ ہند'' کے نام سے ترجمہ کیا گیا۔جو نہایت مقبول ہوا آج تک مستعمل ہے۔اس کے صلہ میں آپ کو تحصیل دار بنا دیا گیا اور پھر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔انہوں نے نجوم کی ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا جو کہ اس زمانے کے رزیڈنٹ کشمیر کی تصنیف تھی۔اس ترجمے کے عوض آپ کو مبلغ ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔

سالار جنگ،نظام دکن نے ان کی شہرت سن کر ان کی خدمات ریاست میں منتقل کرالیں جہاں انہیں آٹھ سو روپے ماہوار تنخواہ پر افسر بندوبست مقرر کیا گیا۔اسی عرصہ میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا اور سالار جنگ کے ایما سے انگریزی ملازمت چھوڑ کر حضور نظام کی مستقل ملازمت اختیار کر لی جس میں وہ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ممبر مال بمشاہرہ سترہ سو روپیہ ماہانہ مقرر ہوئے۔ان کے بیٹے اور عزیزوں کو اچھے اچھے عہدوں پر معقول جگہیں دی گئیں۔سالار جنگ کے حکم سے انہوں نے ایک نصاب تعلیم تیار کیا اور سالار جنگ کے بیٹے نواب لائق علی خان ان کے شاگرد تھے۔

ایک عرصہ تک اپنے عہدہ کے فرائض منصبی انجام دے کر ملازمت سے دست کش ہو گئے۔اس کے بعد مولوی صاحب نے اپنی زندگی تصنیف و تالیف میں گذاری۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے تقریریں شروع کر دیں آپ کا پہلا پبلک لیکچر 1888ء میں ہوا تھا۔اس علمی و ادبی میدان میں بھی حکومت نے انہیں 1897ء میں شمس العلماء کا خطاب دیا اور 1902ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے انہیں ایل۔ایل۔ڈی کی اضافی ڈگری عطا کی۔1910ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔او۔ایل کی ڈگری عطا کی۔D.O.L یعنی ڈاکٹریٹ آف اورنٹیل لرننگ (عالم علوم مشرقیہ)۔آپ کا انتقال 3 مئی 1912ء کو ہوا۔آپ اردو کے پہلے ناول نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کی تصانیف:

مولانا کی عبارت بہت آسان، صاف اور سادہ ہوتی تھی۔البتہ کبھی کبھی عربی اور فارسی کے بڑے بڑے غیر مانوس الفاظ لے آتے تھے۔اور کہیں کہیں رنگین عبارت اور ضائع بدائع سے اور بعض مقامات پر انگریزی الفاظ سے بھی کام لیتے تھے جن سے عبارت میں چستی کے بجائے بھونڈا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ان کے یہاں آزاد کی سی شیرینی اور لطافت نہیں ہے۔ان کے ناول، لیکچر اور افسانوں میں سب سے اہم بات ان کا ظریفانہ انداز ہے جو ان کی تحریر و تقریر کی رونق بنتا ہے۔

ناول و حکایات:

01 **مراۃ العروس:** سب سے پہلی کتاب جس سے مولانا کی شہرت اور ترقی ہوئی وہ **''مراۃ العروس''** ہے۔یہ ایک معزز خاندان کی پرائیویٹ زندگی کا ایک قصہ ہے۔اس کی تصنیف اس وقت ہوئی تھی جب مولانا ڈپٹی کلکٹر تھے۔قصے کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک جاہل ان پڑھ لڑکی ایک شریف گھرانے کی تعلیم کے ذریعے سے کیونکر بدل گئی۔یہ کتاب ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مقبول ہے اور عورتیں اس کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتی ہیں۔اس کی زبان سلیس اور بامحاورہ ہے اور تعجب کی بات ہے کہ مصنف عورتوں کی زبان کو انہی کے لہجے میں لکھنے پر کیونکر قادر ہوئے۔اس کتاب کو پبلک میں تو مقبولیت ملی ہی تھی کہ ساتھ میں گورنمنٹ نے اس کے ایک ہزار نسخے خریدے اور مصنف کو مبلغ ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔اس کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر دیسی زبانوں میں ہو گیا ہے۔

02 **بنات النعش:** مولوی نذیر احمد کی دوسری کتاب ''بنات النعش'' ہے جو ''مراۃ العروس'' کے بعد اور اسی کی طرز پر عورتوں کی تعلیم کی غرض سے لکھی گئی ہے۔اس میں بھی مکالمے کی صورت میں اکثر جگہ معلوماتِ عامہ اور مبادی سائنس کے متعلق مفید اور دلچسپ باتیں لکھی گئی ہیں۔ پبلک اور گورنمنٹ دونوں میں اس کتاب کو یکساں مقبولیت حاصل ہوئی۔

03 **توبۃ النصوح:** ''بنات النعش'' کے بعد ''توبۃ النصوح'' کا نمبر آتا ہے۔یہ مولانا کا سب سے بہترین ناول سمجھا جاتا ہے۔اس میں مولانا نے فرضی قصے کے طور پر دکھایا ہے کہ ایک فاسق و فاجر شخص جس کا نام نصوح ہے ہیضہ میں مبتلاء ہو جاتا ہے اور جب وہ سوتا ہے تو ایک خواب دیکھتا ہے جس کے بعد وہ خوفِ خدا سے لرز جاتا ہے اور پابند شرع ہو کر تمام محرمات سے توبہ کر لیتا ہے۔اس کی بیوی اور بعض عزیز بھی اس کے ہم خیال ہو جاتے ہیں مگر اس کا بڑا لڑکا اس کی راہ پر نہیں آتا اور مصائب میں مبتلاء ہو جاتا ہے۔اس میں مولانا نے اولاد کی بری

اٹھان کے برے نتیجے اور کم سِنی میں ان کی سخت گیری اور نگرانی کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

04 **ابن الوقت**: اس میں ایک ایسے ہندوستانی شخص کا ذکر کیا گیا ہے جو غدر میں انگریزوں کی مدد کرتا ہے اور اس مدد کے صلے میں انگریز اس کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر دیتے ہیں۔ مغربیوں کے عہدوں کے غرور میں وہ اپنے عزیز و اقارب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور جب انگریز اس کو چھوڑ چھاڑ کر چلے جاتے ہیں تو وہ تنہا رہ جاتا ہے اور اپنے عزیزوں کے سامنے شرمندہ ہوتا ہے اور پھر اپنے ہندوستانی دوستوں میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ خیالی شخص مولانا خود ہیں اور افسانے کی صورت میں اپنی روداد سناتے ہیں۔ واللہ اعلم،

05 **ایامیٰ**: اس کتاب میں مولانا نے بیوہ عورتوں کی شادی پر بہت زور دیا ہے اور ہندوستان میں ان کی افسوس ناک حالت کو بیان کر کے شرعاً ازدواجِ ثانی کے جواز کو ثابت کیا ہے۔

06 **محصنات**: مولانا نے اپنی تصنیف ''محصنات'' میں تعداد ازواج کا نقصان دکھایا ہے۔

07 **رویائے صادقہ**: اس کتاب میں اہل اسلام کے کچھ مذہبی عقائد کی ایک دلچسپ مقالمے کی صورت میں بحث کی گئی ہے۔

08 **فسانہ مبتلاء**: ----------

09 **منتخب الحکایات**: مولانا کی یہ تصنیف اسکولی بچوں کو پڑھانے کے لیے ایک درسی کتاب تھی۔

مذہبی و اخلاقی کتابیں:

10 **ترجمہ قرآن شریف اور ادعیۃ القرآن**: قرآن مجید کا یہ ترجمہ نہایت صاف اور بامحاورہ لکھا گیا ہے۔ اس سے عام آدمی بھی آسانی سے قرآن کے مطالب تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اس سے بیشتر قرآن کے جو ترجمے ہوئے تھے ان کی زبان قدیم تھی اور اکثر الفاظ متروک ہونے کی وجہ سے عام آدمی کو سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اس ترجمے کو نذیر احمد نے چار علماء کی مدد سے تین برس میں مکمل کیا تھا۔ اس ترجمے میں ایک چیز بے مزہ ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض جگہ ترجمے کی متانت قائم نہیں رہتی اور اکثر الفاظ کا مطلب اردو الفاظ و محاورات کے بے جا تصرف سے جاتا رہتا ہے اور نیز یہ کہ کثرت تشریح اور اضافۂ تمثیلات کی وجہ سے ترجمہ، ترجمہ نہیں رہتا بلکہ ایک تفسیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں ادعیہ القرآن کی تالیف بھی کی۔

11 **دہ سورہ**: یہ مولانا کی عمر کے آخری حصے کی تصنیف ہے۔

12 **الحقوق والفرائض**: یہ بھی مولانا کی عمر کے آخری حصے کی تصنیف ہے۔

13 **مطالب القرآن**: یہ مولانا کی آخری تصنیف ہے جو ان سے نامکمل رہ گئی تھی مگر اب اس کو مکمل کرنے کے بعد چھاپ دیا گیا ہے۔

14 **امہات الاُمّہ**: احمد شاہ نامی ایک عیسائی مبلغ نے ''امہات المؤمنین'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں پیغمبر اسلامؐ کی ازواجِ مطہرات کی نسبت کچھ بے جا الزامات لگائے تھے اور مولوی نذیر احمد نے اس کے جواب میں ''امہات الامہ'' لکھی تھی۔ کچھ نے اس کی تعریف کی اور کچھ نے سخت برا سمجھا اس کے بارے میں اتنا اختلاف بڑھا کہ اس کی جلدیں آخر میں جلا دی گئیں اور ترمیم کے بعد اس کو دوبارہ چھاپا گیا۔

15 **اجتہاد**: ----------

متفرق کتابیں:

16 **صرف صغیر:**-------------------------

17 **رسم الخط:** مولانا کی یہ تصنیف اسکولی بچوں کو پڑھانے کے لیے ایک درسی کتاب تھی۔

18 **موعظہ الحسنہ :**----------------------------

19 **افسانہ غدر:** یہ کتاب ایڈورڈ صاحب کی ایک تصنیف کا ترجمہ ہے، جس میں انہوں نے 1857ء کے غدر کے حالات کو دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔

20 **نصاب خسرو:**---------------------------

21 **چند پند:**------------------------------

22 **مبادی الحکمۃ مایُعنیک فی الصرف:** مولانا کی یہ تصنیف اسکولی بچوں کو پڑھانے کے لیے ایک درسی کتاب تھی۔

23 **مجموعہ لیکچر:** مولانا نے ریٹائر ہونے کے بعد تقریریں شروع کر دی تھیں۔ سکسینہ صاحب کا خیال ہے کہ ان کا پہلا پبلک لیکچر 1888ء میں ہوا۔ مزید مولانا صاحب سید صاحب کی معیت میں سوسائٹی میں اور کالج میں وقتاً فوقتاً تقریں کرتے رہتے تھے ان کی ان تقریروں کو بعد میں کتابی شکل دے دی گئی ہے۔

24 **مجموعہ بینظیر:** مولانا صاحب اپنی تقریروں کو پر لطف بنانے کے لیے ہلکے پھلکے شعر کہتے تھے۔ ان کے اشعار کو ان کی وفات کے بعد مجموعہ بینظیر کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔

قانونی کتابوں کے ترجمے:

25 **تعزیراتِ ہند:** یہ دراصل ''انڈین پینل کوڈ'' کا اردو میں ترجمہ ہے۔ اس پینل کوڈ کے ترجمے کے لیے پہلے مولوی کرم بخش اور مولوی عظمت اللہ کو مقرر کیا گیا اور پھر لفٹنٹ گورنر ولیم میور کے حکم سے مولوی نذیر احمد کو ان کے کام کی نگرانی اور نظر ثانی کے لیے مقرر کیا گیا۔ مولوی صاحب نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کام کو سرانجام دیا۔

26 **قانون شہادت:** یہ ''ایوی ڈنس ایکٹ'' کا ترجمہ ہے جو لپرون کی کتاب سے اردو میں کیا گیا۔

غیر مطبوعہ مواد:

27 **عمال کے ہدایت نامے:** مندرجہ بالا سب تصنیفوں کے علاوہ مولانا کی سات، آٹھ چھوٹی چھوٹی کتابیں اور رسائل ہیں جو قیام حیدر آباد کے زمانے میں وہاں کے عمال کو بطور ہدایت نامہ لکھے گئے تھے مگر چھپ نہ سکے۔

نوٹ:

مولانا نذیر احمد کے پاس ایک مطبع بھی تھا جس نام ''شمسی پریس'' تھا یہ تمام کتب انہی کے اپنے مطبع سے چھاپی جاتی تھیں۔

05۔مولانا شبلی نعمانیؒ:

(03 جون 1857ء تا 18 نومبر1914ء)

مولانا شبلی کے بارے میں رام بابو سکسینہ اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں کہ:

''اگر کوئی ایک شخص ایک شاعر۔فلسفی۔مورخ' ناقد' ماہر تعلیم۔معلم۔واعظ۔رفارمر۔جریدہ نگار۔فقیہ۔محدث۔سب کچھ ہوسکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی کہ انہوں نے ان سب کمالات مختلفہ اور علوم وفنون متنوعہ کا اپنی ذات میں اجتماع کرلیا تھا اور اس شعر کے صحیح مصداق بن گئے تھے۔ وَ لَیۡسَ عَلَی اللّٰہِ لِمُسۡتَنۡکَرٍ اَنۡ یَّجۡمَعَ الۡعَالَمَ فِیۡ الۡوَاحِد مگر اِن سب میں ادب' تاریخ اور ریسرچ میں ان کا رتبہ بہت بلند تھا۔''

مولانا شبلی نعمانی 03 جون 1857ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک موضع بندول میں پیدا ہوئے۔وہ شیخ حبیب اللہ کے بیٹے تھے۔ان کے والد ایک وکیل تھے۔ان کے والد نے انہیں ابتدائی تعلیم مولوی شکر اللہ سے دلوائی۔انہوں نے عربی اور معقولات کی تعلیم مولانا فاروق چریا کوٹی سے حاصل کی۔ان دنوں مولانا فاروق چریا کوٹی غازی پور کے ہیڈ مولوی، فلسفی، ریاضی دان اور ادب وغیرہ کے استاد مانے جاتے تھے۔مزید تعلیم کے لیے رام پور جا کر مولوی عبدالحق خیر آبادی سے معقولات پڑھے۔مولوی ارشاد حسین محدث سے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔لاہور میں ادیبِ کامل مولانا فیض الحسن سے حماسہ پڑھا، وہاں سے سہارنپور آئے اور مولوی احمد علی سے علوم حدیث کی تکمیل کی۔ 1876ء میں 9 سال کی عمر میں عازم حج ہوئے۔رام بابو سکسینہ کہتے ہیں کہ سفر حج کے دوران انہوں نے اپنے جوش عقیدت سے فارسی میں ایک پُر زور قصیدہ بھی کہا تھا۔حج بیت اللہ کر کے سیدھے اعظم گڑھ آئے اور دوبارہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں محو ہو گئے۔اور اسی زمانے میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''اسکات المعتدی'' لکھی۔

بقول رام بابو سکسینہ۔بحوالہ ''تاریخ ادب اردو'' (ص۔۴۸۵):

''شوقِ کتب بینی کا یہ حال تھا کہ کتب فروشوں کی دکان پر بیٹھ کر اکثر کتابیں دیکھا کرتے تھے۔اس زمانے میں ردِ وہابیہ میں بھی کچھ رسالے لکھے جس میں ''اسکات المعتدی'' جو عربی میں ہے زیادہ مشہور ہے۔''

انہوں نے وکالت کا امتحان بھی پاس کیا تھا اور اپنے والد کے حسب آرزو کچھ عرصہ وکالت بھی کی لیکن مولانا کی طبیعت اس شعبے کے موافق نہ تھی اسی وجہ سے وکالت ترک کر دی۔کہتے ہیں کہ آپ نے سرکاری ملازمت بھی کی تھی یعنی کہیں کے امین ہو گئے تھے۔چند دن بعد یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور اب ہمہ تن خدمت علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔مولانا صاحب کے چھوٹے بھائی جن کا نام ''مہدی'' بتایا جاتا ہے وہ علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔1882ء میں مولانا صاحب اپنے بھائی سے ملنے علی گڑھ گئے۔خان بہادر محمد کریم کے توسط سے ڈپٹی کلکٹر مولوی سمیع اللہ خان سے ملے اور ڈی۔سی صاحب کے توسط سے مولانا کی ملاقات سرسید احمد خان سے ہوئی۔ان دنوں کالج میں فارسی کے پروفیسر کی آسامی خالی تھی اس کے لیے شبلی نے درخواستِ ملازم جمع کرا دی۔وہ درخواست منظور ہوئی اور 1881ء میں علی گڑھ کالج میں 45 روپے ماہوار تنخواہ پر فارسی اور عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔وہاں اسلام دوست پروفیسر آرنلڈ کو عربی سکھائی اور ان سے فرنچ زبان کی تعلیم

حاصل کی۔ کچھ دن شہر میں رہنے کے بعد خوش نصیبی سے سید صاحب کے بنگلے کے قریب رہنے کی جگہ مل گئی۔ سرسید کی وفات کے بعد یہ ملازمت چھوڑ دی اور اس کے بعد حیدر آباد میں محکمہ تعلیم کے ناظم مقرر ہوئے۔ ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین شبلی ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

تصنیفاتِ شبلی:

مولانا کی تصانیف بہت کثرت سے ہیں جن میں حسب ذیل بہت مشہور ہیں۔

سیرۃ النبیؐ (دو جلدیں)	علم الکلام	سفر نامہ روم و مصر و شام	مکاتیب شبلی
سوانح مولانا روم	الکلام	مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم	رسائل شبلی
الفاروق	شعر العجم (پانچ جلدیں)	تاریخ اسلام و فلسفۂ اسلام	دیوان شبلی
المامون	موازنہ انیس و دبیر	حیات خسرو	دستہ گل
سیرۃ النعمان	اورنگ زیب عالم گیر	تنقید جرجی زیدان	مثنوی صبح امید
الغزالی	الجزیہ	مقالات شبلی	مجموعۂ نظم اردو

علی گڑھ میں شبلی کو یہ خیال آیا کہ اسلام کے اکابرین اور جانثاروں کے تذکرے قلمبند کیے جائیں۔ علی گڑھ میں ان کو سرسید کے چھاپے خانے کی سہولت کے علاوہ مصر و شام تک کی مطبوعہ کتابیں دستیاب تھیں۔

01 1884ء میں مولانا نے **''مثنوی صبح امید''** لکھی۔ یہ مثنوی اتنی مشہور ہوئی کہ مدرسے کے طلباء اس مثنوی کو سُر ساز کے ساتھ اسٹیج پر پڑھتے تھے۔ اس مثنوی میں سرسید احمد خان کے اوصاف و کمالات اور خدمات کا ذکر تھا۔

02 شبلی کی تصنیف **''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم''** جو 1886ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں بطور ایڈریس پڑھی گئی تھی 1887ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس سے لوگوں کو مولانا کی تصنیفات اور تبحر تعلیم کا پتہ چلا اور مولانا لوگوں میں مقبول عام ہوئے۔

03 مولانا نے عباسیہ خلفاء کی تاریخ لکھنے کی سوچی اور انگریزی کی تقلید میں اس کا نام **''ہیروز آف اسلام''** رکھنے کی سوچی۔ اس امر کے لیے انہوں نے **''المامون''** اور **''سیرت النعمان''** لکھی اور **''الفاروق''** لکھنی شروع کر رہے تھے کہ 1892ء میں سفرِ روم و شام اختیار کیا۔ اس سفر میں پروفیسر آرنلڈ بھی ان کے ہمراہ تھے انہوں نے قسطنطنیہ اور ایشیا کوچک اور شام و مصر کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی۔ اس سفر کی اہم غرض یہ تھی کہ ''الفاروق'' کی تیاری کے لیے صحیح اور معتبر مآخذات کا پتہ لگایا جائے، اور اسلامی بلاد (شہروں) کی شان و شوکت اپنی آنکھوں سے دیکھی جائے۔ اس سفر سے واپسی پر انہوں نے **''سفر نامہ روم و شام''** نہایت دلچسپ انداز میں لکھ لیا تھا۔

04 1898ء میں سرسید انتقال کر گئے جس سے شبلی دل برداشتہ ہو گئے اور کالج سے اپنا سلسلہ ختم کر کے اعظم گڑھ واپس چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ''الفاروق'' کی تیاری میں دن رات ایک کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی 1883ء کو افتتاح شدہ ایک قومی انگریزی اسکول جو وہاں تھا، شبلی نے اس اسکول کی ترقی کے لیے بھی کوششیں کیں۔ 1899 میں سفرِ کشمیر پیش آ گیا مگر اتفاق سے مولانا وہاں بیمار پڑ گئے اور اسی

حالت میں ان کی کتاب ''**الفاروق**'' اختتام پزیر ہوئی۔

05 اپنی تالیف وتصنیف کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے نواب وقار الامرا کے زمانۂ وزارت میں مولانا نے حیدرآباد کا سفر کیا۔سب سے پہلے وہ مولوی سید علی بلگرامی کی کوشش سے ناظم محکمہ تعلیم بمشاہرہ دوسو(200) روپیہ ماہوار مقرر ہوئے جو بعد کو تین سو روپیہ ہوگیا۔مولانا یہاں چار برس تک رہے اور اس عرصے میں محکمہ تعلیم نے بہت ترقیاں کیں۔مولانا سید علی بلگرامی نے ''**کتب آصفیہ**'' کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس میں شبلی کی بھی چند کتابیں شامل ہیں۔

06 اسی دوران جب مولوی عزیز مرزا کا دور دورہ تھا تو مولانا شبلی نے حیدرآباد میں مشرقی یونیورسٹی کھولنے کی اسکیم تیار کی تھی۔مولانا نے اس زمانے میں اپنی تصنیفات کے ضمن میں ''**الغزالی**''، ''**سوانح مولانا روم**''، ''**الکلام**''، ''**علم الکلام**''، اور ''**موازنہ انیس ودبیر**''، مکمل کیں۔انیس اور دبیر کے مَراثی موازنے میں مولانا نے دبیر کے ساتھ عدم انصاف کا مظاہرہ کیا ہے۔

نَدوۃ العلماء:

1311ھ بمطابق 1894ء کو ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔اس کے قیام کی غرض یہ تھی کہ ضروریاتِ زمانہ کو سامنے رکھتے ہوئے عربی مدارس کے لیے ایک مفید نصاب بنایا جائے اور نیز یہ کہ مسلمانان ہندوستان کے آپس میں جو اختلافات ہیں ان کو ختم کیا جائے۔یہ عمدہ خیال مولوی عبدالغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر کے تھے۔مگر اس کی تکمیل مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرادآبادی کے خلیفہ مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔وہی اس کے بانی اور ناظم اوّل تھے۔مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی نے اس کے قواعد وضوابط مرتب کیے۔''**مسودہ دارالعلوم ندوۃ العلماء**'' کے آخری صفحہ پر مندرجہ ذیل پانچ مقاصد لکھے گئے تھے۔

01 نصابِ تعلیم کی اصلاح اور علوم دین کی ترقی اور تہذیب اخلاق اور شائستگی اطوار۔

02 علماء کے باہمی نزاع کا دفع اور اختلافی مسائل کے ردوقدح کا پورا پورا انسداد۔

03 عام مسلمانوں کی صلاح وفلاح اور اس کی تدابیر۔مگر سیاسی اور ملکی معاملات اس سے علیحدہ ہیں۔

04 ایک عظیم الشان السلامی دارالعلوم قائم کرنا جس میں علوم وفنون کے سوا عملی صنائع کی بھی تعلیم ہوگی۔

05 دینی امور میں فتوے دینے کے واسطے محکمہ افتاء کا ہونا، جس میں بڑے بڑے عالم اور مفتی ہوں گے۔

اکابرین قوم مثلاً: سرسید، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ نے بھی اس کے اغراض ومقاصد کو پسند کیا اور اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ سے اس کا خیر مقدم کیا۔نواب وقار الملک اپنی جیبِ ذاتی سے سو روپیہ ماہوار اس ندوہ کو دیتے تھے۔مولانا شبلی نے ایک تجویز پیش کی کہ اس ندوہ کے علماء کی جماعت کے تحت ایک مدرسہ کھولا جائے جو طلباء کو عصری ضروریات کی تعلیم دے سکے۔چنانچہ 1312ھ بمطابق 1898ء کو اسی تجویز کے تحت دارالعلوم کے کچھ درجے کھول دیئے گئے۔1899ء میں رؤسائے شاہجہانپور کی جانب سے ندوۃ العلماء کو کچھ زمین عطیہ کی گئی جس کو ندوۃ کی کمیٹی نے ٹھیکے پر دے دیا جس سے ندوہ کو سالانہ سات سو روپے ملتے تھے۔ایک عظیم الشان کتب خانے کی بنیاد رکھی گئی جس میں تقریباً دس ہزار کتب داخل ہوچکی ہیں۔اس کے علاوہ مطبوعات یورپ، مصر، قسطنطنیہ، ٹونس اور تہران

وغیرہ کے تقریباً ایک ہزار قلمی نسخے ہیں اور اکثر نادر الوجود کتابیں ہیں جو خود مصنفین کے ہاتھوں سے لکھی ہیں یا پھر ان مصنفین کے قریب قریب کے زمانے کی لکھی ہوئی ہیں اور ان پر مصنفین کے دستخط بھی موجود ہیں۔

اس ندوہ کے لیے ایک خطرہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ سر اینٹونی میکڈانل جو اس وقت ممالک متحدہ کے لفٹنٹ گورنر تھے ندوہ کے سخت مخالف ہو گئے۔ ندوہ کو سیاسی سازشوں کا آلہ کار سمجھ کر اس کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ مولوی احمد رضا خان بریلوی کی طرف سے جاری ہونے والے رسالوں میں بڑا جوش و خروش ٹپکتا تھا۔ ایسی ہی چند وجوہات تھیں کہ ندوہ کی مخالفتیں شروع ہونے لگیں۔ اس کے مقابلے میں ایک جنگجو جماعت ''**جدوہ**'' قائم کی گئی جس کے اجلاس کلکتہ میں ہوتے تھے۔ یہ حالات دیکھ کر شبلی صاحب حیدر آباد سے لکھنؤ آئے اور ندوہ کے ابتر حالات کو سنبھالا دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ گورنمنٹ کو جو شکوک تھے ان کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کام میں کرنل عبدالمجید خان صاحب نے بھی شبلی کی بہت مدد کی۔ ندوہ کی مالی حالت اس قدر بگڑ چکی تھی کہ یہ ختم ہونے کو آ گیا تھا۔ شبلی نے مالی حالت کی بہتری کے لیے اکثر دیسی ریاستوں کا سفر کیا۔ رام پور سے مبلغ پانچ سو روپیہ سالانہ اور بھوپال سے مبلغ اڑھائی سو روپیہ سالانہ اعانتی رقمیں مقرر ہوئیں۔ اسی طرح ہز ہائینس آغا خان نے پانچ سو روپیہ سالانہ دینے کا وعدہ کیا اور تعمیر عمارت کے لیے نواب صاحب بہاول پور کی جدہ ماجدہ نے پچاس ہزار روپیہ دیا۔ گورنمنٹ نے دارالعلوم کے لیے لکھنؤ میں دریائے گومتی کے کنارے پر ایک وسیع اور خوشنما قطع اراضی دیا۔ اور ساتھ ہی انگریزی زبان اور تدریس علوم دینیہ کے لیے چھے ہزار روپیہ سالانہ منظور کیا۔ 28 نومبر 1908ء کو سر جان ہیوٹ نواب بہادر لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس طرح سے مولانا کی کوششیں ثمر آور ہوئیں مگر علماء کے مابین اختلافات ہنوز ویسے ہی تھے یہ اختلاف کا بھوت ان ملاؤں کو چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ان کے لیے متحد الخیال ہونا مشکل کام تھا۔ مولانا شبلی کی آزاد خیالی کی وجہ سے وہ لوگ ان پر پورا اعتماد نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے مولانا بددل ہو کر 1913ء میں لکھنؤ چلے گئے۔ اسی اثنا میں ایک نہایت افسوس ناک واقعہ پیش آیا کہ مولانا موصوف کو ٹانگ میں ایک اتفاقیہ گولی لگ گئی جس کا زخم ٹھیک ہونے کو بہت لمبا عرصہ لگ گیا اور بالآخر ان کی ٹانگ کاٹنی پڑی۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ:

ندوہ کو چھوڑنے کے بعد مولانا نے اپنی دیرینہ خواہش کو تکمیل دینا چاہی کہ وہ ایک دارالمصنفین بنانا چاہتے تھے جس میں کئی مصنفین اکھٹے ہو کر کتب لکھیں۔ اس کام کے لیے جب انہوں نے اپنے ایک دوست نواب صفی الدولہ سید علی حسن خان بہادر عرف علی میاں سے مشورہ لیا تو انہوں نے بہت اصرار کیا کہ دارالمصنفین لکھنؤ میں قائم کیا جائے لیکن شبلی چاہتے تھے کہ دارالمصنفین لکھنؤ میں نہ بنایا جائے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دارالمصنفین کا ندوۃ العلماء سے کوئی لنک ہو۔ مولانا کسی کام سے بمبئی تشریف لے گئے تھے کہ اچانک ان کے چھوٹے بھائی محمد اسحاق کی موت ہو گئی اور ان کو واپس آنا پڑا۔ اعظم گڑھ میں واپس آ کر مولانا نے دارالمصنفین کی بنیاد ڈالنا چاہی اور سید علی میاں کو بھی ایک خط لکھا کہ دارالمصنفین کی افتتاحی تقریب میں تشریف لائے۔ جب علی میاں لکھنؤ سے اعظم گڑھ پہنچے تو شبلی اپنی ذاتی جائیداد یعنی اپنا گھر اور ایک باغ دارالمصنفین کے لیے وقف کر چکے تھے اور کئی دوسرے لوگوں نے بھی امداد دی تھی۔ علی میاں نے پھر سے سرد آہ بھر کے اپنا خیال دہرایا کہ یہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے بجائے لکھنؤ میں زیادہ بہتر تھا تو مولانا نے مسکرا کر کہا کہ فی الحال اس کو یہی

چلنے دو ضرورت پڑنے پر اس کو لکھنؤ منتقل کر لیں گے۔ اسی عرصے میں سید صاحب نے **شعر العجم** کا پانچواں حصہ اور **سیرت النبیؐ** کی دو جلدیں مکمل کیں، باقی کی چھے جلدیں مولانا کے شاگرد خاص سید سلمان ندوی نے مکمل کی تھیں۔ اس طرح سیرت النبیؐ کی کل آٹھ جلدیں آج بھی ہر عام و خاص کے مطالعہ کے لیے دستیاب ہیں۔

مولانا شبلی کی قابلیت و خدمات کا اعتراف:

01- بقول رام بابو سکسینہ:

''سر سید مرحوم مولانا کو اُن کے طرز تحریر پر مبارک باد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم تو لکھنؤ اور دلی دونوں کے لیے باعث رشک ہو۔''

02- 1992ء میں سلطان ٹرکی نے مولانا کو تمغہ مجیدی عنایت کیا۔

03- برٹش گورنمنٹ نے مولانا کو شمس العلماء کا خطاب عنایت فرمایا۔

04- مولانا کو الہٰ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور مختلف کمیٹیوں کے معزز رکن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ مثلاً:

سر ہارکورٹ بٹلر کی صدارت میں شملہ میں منعقد ہونے والی ''ترقی علوم مشرقیہ'' کی کمیٹی کے آپ رکن تھے۔

کمیٹی بابتہ نزاع مابین زبان اردو ہندی کے آپ رکن تھے۔

گورنمنٹ کی منعقدہ کمیٹی ''اتحاد ہندو مسلم'' میں بھی مولانا کی رکنیت تھی۔

مولوی چراغ علی

(1895-1844)

مولوی چراغ علی 1846ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد بخش تھا۔ چراغ علی کے آباء کشمیر کے رہنے والے تھے ان کے والد ہجرت کر کے میرٹھ میں آباد ہوئے تھے اور یہیں مولوی چراغ علی کی ولادت ہوئی۔ فکر معاش کی وجہ سے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر پھر بھی اپنے شوق کی وجہ سے عربی اور فارسی میں اچھی خاصی دسترس حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ یورپ کی مختلف زبانوں سے بھی ان کو واقفیت تھی۔ ''مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ بیت الخلاء میں بھی کتابیں رکھی رہتی تھیں اور وہاں بھی پڑھنے سے نہ چوکتے تھے۔'' (بحوالہ دانیال گائیڈ ص۔369 نیو کورس 2015ء تا معہ بعد):

ملازمت کے بارے میں یہ کہ وہ حیدر آباد میں معتمد مال کے عہدے پر فائز رہے۔ اُن کو **''نواب اعظم یار جنگ بہادر''** کا خطاب بھی دیا گیا۔ آخر کار 1895ء میں بمبئی میں انتقال کر گئے۔

مولوی چراغ علی کی تصنیفیں:

01 مولوی صاحب **''تہذیب الاخلاق''** کے لیے دینی موضوعات پر مضامین لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی مندرجہ ذیل تصنیفات ہیں۔

02 **تعلیقات:**----------

03 **تحقیق جہاد:**----------

04 **اسلام کی دینوی برکتیں:**----------

05 **قدیم قوموں کی مختصر تاریخ:**----------

06 انہوں نے انگریزی میں بھی بعض کتابیں لکھی تھیں۔

نواب وقار الملک

(مولوی مشتاق حسین زبیری 1841-1917)

نواب وقارالملک کا اصل نام مشتاق حسین تھا۔ وہ 24 مارچ 1841ء کو پیدا ہوئے۔ آپ ضیاءالدین احمد زبیری (جو مشہور ریاضی دان اور علی گڑھ تحریک کے ستون مانے جاتے ہیں) کے ماموں ہیں۔ پہلے پہل ایک مکتب میں داخل ہوئے اس کے بعد مولوی راحت علی امروہوی کے شاگرد ہو گئے۔ انہوں نے ان کو جدید عربی، حدیث اور فقہ پڑھائی۔ اس کے بعد وہ گورنمنٹ کے ملازم ہو گئے جہاں 1861ء میں ان کی ملاقات سرسید احمد خان سے ہوئی۔ 1866ء میں ایک معزز کارکن کی حیثیت سے انہوں تحریک علی گڑھ کے لیے اپنی خدمات شروع کر دیں۔ وہ سائنٹیفک سوسائٹی کے ممبر بھی تھے۔ 1870ء میں سوسائٹی کی جانب سے مسلمانوں میں تعلیمی ترقی کے شعور کی غرض سے ہونے والی مضمون نویسی کے مقابلے میں آپ نے دوسرا انعام حاصل کیا۔

1875ء میں آپ کی خدمات برطانوی حکومت کی جانب سے حیدرآباد میں منتقل کرا دی گئیں۔ آپ کی 17 سال کی انتھک خدمات کے صلے میں آپ کو 9 دسمبر 1890ء کو **"نواب"** کا خطاب دیا گیا اس طرح آپ کا پورا نام **مشتاق حسین وقارالملک** ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے 1908ء میں آپ کو نواب کا خطاب دیا تھا جبکہ نظام حیدرآباد نے آپ کو **"وقارالدولہ، وقارالملک انتصار جنگ"** کے خطابات سے نوازا تھا۔ 1892ء میں علی گڑھ میں M.A.O کالج میں شمولیت کر لی۔ جب کالج کے فنڈ کے لیے کمیٹی بنائی گئی تو آپ کو اس کمیٹی کا فعال ممبر بنایا گیا۔ آپ نے اس کالج کی تعمیر کے لیے 7 لاکھ 50 ہزار روپے کی خطیر رقم اکھٹی کر لی۔ 1906ء میں آپ شملہ وفد کے ایک رکن بھی تھے اور 1906ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا تو وقارالملک اس کے پہلے سکریٹری بنے۔ 1907ء میں آپ کو A.M.O کالج کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ جب ان کو علی گڑھ کالج کا سکریٹری بنایا گیا تو ان کو مسلم لیگ کی سیکریٹری شپ چھوڑنی پڑی۔ سرسید نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی ایک عمارت کا نام انہی کے نام پر **"مشتاق منزل"** رکھا ہوا تھا۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے 1912ء میں وقارالملک نے سکریٹری کالج کونسل کا عہدہ واپس کر دیا۔ 1915ء میں ان کو ایک جھٹکا لگا اور 27 جنوری 1917ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے اور ان کو امروہہ میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

01 مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی موضوعات پر وقارالملک "تہذیب الاخلاق" میں اپنے مضامین لکھتے رہتے تھے۔

02 سرگذشت نپولین بوناپارٹ: کے نام سے انگریزی کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔

03 سرسید کے بعض سوالوں کے جواب میں 1870ء میں ایک ضخیم رسالہ لکھا۔

04 نواب صاحب کے خطوط کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

نواب محسن الملک

(نواب محسن الملک، منیر نواز جنگ، سید مہدی علی 1837-1907)

اصل نام سید مہدی علی تھا، اٹاوہ میں 1817ء میں پیدا ہوئے۔ میر ضامن علی کے فرند ہیں۔ آپ کے بڑے بھائی میر غلام عباس اور چھوٹے بھائی کا نام سید امیر حسن تھا۔ ابتدائی تعلیم اِٹاوہ میں حاصل کی، عربی اور فارسی میں خاصی دسترس حاصل کر لی تھی۔ جب آپ اِٹاوہ میں تحصیلدار تھے تب آپ کی سرسید احمد خان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ 1864ء میں آپ نے سائنٹیفک سوسائٹی میں شمولیت کی۔ آپ نے کمشن کا امتحان بھی ٹاپ لسٹ میں پاس کیا اور شمال مغربی صوبوں کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ بطور ڈپٹی کلکٹر ان کی پہلی پوسٹنگ ضلع مرزا پور (موجودہ اتر پردیش) میں ہوئی۔ 1874ء ترقی کر کے حیدر آباد میں مالیات کے انسپکٹر جنرل مقرر ہو گئے۔ انہوں نے حیدر آباد میں فارسی کی جگہ پر اردو کو سرکاری زبان بنا دیا۔ آپ کو بیس سال کی خدمات کے صلے میں نظام حیدر آباد نے ''منیر نواز جنگ اور ''نواب محسن الملک'' کے خطابات سے نوازا۔ 1893ء میں حیدر آباد سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے سرسید کی تحریک کو وقت دینا شروع کر دیا۔ 1898 میں سرسید کی وفات کے بعد آپ کو ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کا سیکریٹری بنایا گیا اور اپنی وفات تک آپ اسی عہدے پر فائز رہے۔ 1907ء میں انتقال ہوا اور علی گڑھ میں دفن ہوئے۔

نواب محسن الملک کی تصنیفات:

01 تہذیب الاخلاق کے اہم مضامین نگار تھے۔

02 **قانونِ مال:**----------

03 **قانونِ فوجداری:**----------

04 **رسالہ میلاد شریف:** ان کی شہرت کی پہلی وجہ یہی رسالہ تھا۔

05 **تقلید عمل بالحدیث:**----------

06 **آیات بینات:**----------

07 **کتاب المحبت والشوق:**----------

08 **مسلمانوں کی تہذیب:**----------

09 **مکاتیب الخلان:**----------

10 **مجموعہ لیکچرز:**----------

مولوی ذکاء اللہ دھلوی

(1910-1832)

مولوی ذکاءاللہ دہلی میں 1832ء میں پیدا ہوئے۔حافظ ثناءاللہ کے بیٹے تھے اور وہ ڈاکٹر رام چندر کے شاگرد تھے اور ایک وقت میں مرزا کوچک سلطان بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے کے اتالیق تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور 12 سال کی عمر میں دلی کالج میں داخل ہوگئے۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسی کالج میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔اس کے بعد آگرہ کالج میں فارسی اور اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔سات آٹھ برس تک تعلیمی کاموں میں مصروف رہتے ہوئے 1855ء میں بلند شہر و مراد آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز ہوگئے اور گیارہ سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔1869ء میں دلی نارمل اسکول کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے۔1872ء میں اورنٹیل کالج لاہور میں پروفیسری کے واسطے نامزد ہوئے مگر اس عہدے پر فائز ہونے سے پہلے وہ میور سنٹرل کالج الہٰ آباد میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔26 سال بعد اسی عہدے سے ریٹائر ہوکر پنشن حاصل کی۔

ادب میں انہوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔مختلف علوم وفنون پر ڈیڑھ سو کے لگ بھگ کتابیں تصنیف کیں۔ان میں اکثر کتابیں طلباء کے لیے لکھی گئی ہیں۔انگریزوں اور ان کی حکومت کے بڑے دلدادہ تھے۔انہوں نے ملکہ وکٹوریا اور یورپین تہذیب کی تاریخ بھی لکھی۔عہد وکٹوریا کو تین جلدوں میں مکمل کیا۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے علاوہ رسالہ مخزن اور زمانہ میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ **''تاریخ ہندوستان''** کی تدوین ہے جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ان کی کتابوں میں ادبی شان بہت کم ہے اور ان کا طرزِ تحریر کم دلچسپ ہے۔

بقول ڈاکٹر سید محمد عبداللہ:

''پنساری کی دکان کی مانند ان کے پاس ہر قسم کا موضوعِ تحریر موجود ہے۔'' (اردو ادب:ص۔۱۲۳)

ان کی تحریر کی شان حالی، شبلی اور آزاد جیسی جاندار نہیں ہے۔انہوں نے اپنی ادبی پہچان بنانے کے بجائے سرسید کے موقف کو ترجیح دی۔اور ان کے خیات کی ترویج کے لیے لکھا۔ان کی زیادہ تر کوشش انگریزی کتابوں کے ترجموں تک محدود رہی۔آپ کی خدمات کے بدلے میں حکومت نے آپ کو شمس العلماء اور خان بہادر کے خطابات سے نوازا۔

مولوی ذکاءاللہ کی تصنیفات:

01 مہماتِ عظیم: اس کتاب میں ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں انگلستان اور دوسرے ممالک میں ہونے والی لڑائیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

02 مضامینِ مولوی ذکااللہ: علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے علاوہ رسالہ مخزن اور زمانہ میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

03 تاریخ ہندوستان: یہ کتاب مولانا کا اعلیٰ کارنامہ ہے جو دس جلدوں پر مشتمل ہے اور اس پر نہایت محنت سے کام کیا گیا ہے۔

04 **آئین قیصری:** اس کتاب میں کوئین وکٹوریہ کے دور میں ہونے والی انتظامی تبدیلیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ کوئین وکٹوریہ اوراس کے شوہر کے حالات بھی اسی کتاب میں لکھے گئے ہیں۔

05 **مولوی سمیع اللہ خان** بہادر،سی۔ایم۔جی،کی سوانح عمری بھی مولوی ذکاءاللہ نے لکھی تھی۔

06 **تاریخِ اسلام:** آخر میں مولانا تاریخ اسلام لکھ رہے تھے مگر اس کو مکمل نہ کر سکے۔

مولوی ذکاءاللہ کی تصانیف کے بارے میں ''تاریخ ادب اردو'' مصنفہ رام بابو سکسینہ کے صفحہ نمبر ۴۸۳ پر لکھا ہے کہ:

''اُن کی کثیر التصانیفی پر مولانا حالی نے یہ پھبتی کہی تھی کہ مولوی ذکاءاللہ کا دماغ ایک بنئے کی دوکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے۔ممکن ہے اس میں یہ بھی لطیف اشارہ ہو کہ بنئے کے یہاں عمدہ اور قیمتی چیزیں کہاں ملتی ہیں۔''

04- تحریک علی گڑھ کے اثرات :

01 تحریک علی گڑھ کے اثرات سے تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا جیسے

i ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ

ii اسلامیہ کالج لاہور

iii سندھ مدرسہ کراچی

iv اسلامیہ کالج پشاور وغیرہ

02 اس تحریک کی وجہ سے مغربی تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم کا بھی رواج عام ہوا جس سے قومی وملکی ترقیاں ہوئیں۔

03 تحریک پاکستان اور پھر قیام پاکستان تحریک علی گڑھ کی بدولت ممکن ہوا۔تحریک پاکستان کے تمام ارکان تحریک علی گڑھ نے پیدا کیے تھے۔

04 سرسید کی بدولت مسلمانوں میں تعلیم کا شعور پیدا ہوا اور انہیں سرکاری ملازمتوں کے مواقع میسر آئے۔

05 ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے آج ہر باشعور شخص کو تحریک علی گڑھ کا ممنون ہونا چاہئے۔

06 تحریک علی گڑھ کی وجہ سے مسلمانوں کو اعلیٰ اذہان کے مالک لائق سیاست دان میسر آئے۔

07 مسلم لیگ اور شملہ وفد تحریک علی گڑھ کے اراکین کی محنت کا نتیجہ ہے جنہوں نے مسلمانوں کی اکثریت کو منوایا اور علیحدہ پارٹی بنا کر انتخابات میں حصہ لیا۔

08 اردو زبان وادب کے فروغ میں تحریک علی گڑھ نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔اردو میں تنقید،سوانح نگاری،مضمون نگاری اور خودنوشت تذکرے وغیرہ کی بنیاد علی گڑھ تحریک کے سایہ میں مستحکم ہوئی۔

تحریک علی گڑھ کی خدمات کا ادباء کی زبانی اعتراف:

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (بہترین ادب 1955ء، ص9)

''نہ صرف اردو زبان کو وسعت ملی، بلکہ اردو ادب کے اسالیبِ بیان اور روحِ معانی بھی متاثر ہوئے۔''

جناب انور سیدیؒ (اردو ادب کی تحریکیں)

''یہ اعزاز علی گڑھ کو حاصل ہے کہ اردو زبان کے دورِ طفولیت میں ہی
اس کی عملی حیثیت کو اس تحریک نے قبول کیا اور ادب کو عین زندگی بنا دیا۔''

ڈاکٹر انور سیدیؒ (اردو ادب کی تحریکیں۔ص314)

''ادبی سطح پر علی گڑھ تحریک نے اردو نثر کا ایک باوقار، سنجیدہ اور متوازن معیار قائم کیا اور اسے
شاعری کے مقفیٰ اور مسجع اسلوب سے نجات دلا کر سادگی اور متانت کی کشادہ ڈگر پر ڈال دیا۔''

05- اہم نکات:

01 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان کسمپرسی کا شکار ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کو امید کی شمع دکھانے کے لیے سر سید احمد خان کی خدمات کی شکل میں جو چراغ روشن ہوا اس کو تحریک علی گڑھ کہتے ہیں۔

02 سادہ لفظوں میں سر سید اور ان کے رفقاء کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی خدمات کا دوسرا نام تحریک علی گڑھ ہے۔

03 اس تحریک میں سر سید احمد خان کے ساتھ حالؔی، شبلی، آزادؔ، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ شامل تھے۔

04 مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کرنے اور ان کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کے لیے ان مصنفین نے اپنی خدمات سر انجام دیں۔

05 سر سید احمد خان: سائنٹی فک سوسائٹی، علی گڑھ کالج، مدرسۃ العلوم، اے۔ایم۔او اسکول کا قیام عمل میں لائے۔

06 دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ العلماء شبلی کے کارنامے ہیں۔ انہوں نے سوانح نگاری اور تنقید کی بنیاد رکھی۔

07 آزاد نے آبِ حیات لکھ کر تذکرے اور تنقید کی بنا رکھی۔

08 ڈپٹی نذیر احمد پہلے ناول نگار مانے جاتے ہیں۔

09 سر سید احمد خان اپنے بیٹے محمود کے ساتھ انگینڈ گئے جہاں انہوں نے ایڈیسن اور سٹیل کے رسالے ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر پڑھے اور ان سے بے حد متاثر ہوئے اور وطن واپس آ کر اسی تاثر میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔

تحریک علی گڑھ کا ردِ عمل

ایک مشہور سائنس دان سر آئزک نیوٹن کہتے ہیں کہ ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اگر تحریک علی گڑھ ایک عمل ہے تو اس کا ردِ عمل بھی ہونا چاہئے۔ ردِ عمل ہونا کیا چاہئے بلکہ اس کا ایک بہت بڑا ردِ عمل موجود ہے۔ تحریک علی گڑھ اور خصوصاً اس تحریک کے بانی سر سید احمد خان بہادر کے نظریات کی مخالفت کی گئی۔ ان پر تنقید کی گئی، اس تنقید کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک پہلو سنجیدہ ہے اور دوسرا پہلو غیر سنجیدہ ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ سید صاحب کی تحریک بارش کی مانند ہے، کسان چاہے گا کہ بادل خوب برسے اور ایک کمہار چاہے گا نہیں! نہیں! دھوپ نکلنی چاہئے ورنہ میرے برتن نہیں سوکھیں گے اور نقصان ہوگا۔ جن کو توکل ہوتا ہے کہ بارش فطری عمل ہے مِینہ برسنا چاہئے، مِینہ کے بعد دھوپ بھی نکلے گی اس سے دونوں کو فائدے ہوں گے کمہار کے برتن صرف ایک دن کی تاخیر سے خشک ہوں گے مگر کسان کو اس کا بیش بہا فائدہ ہوگا۔ آیئے سید صاحب پر کی جانے والی تنقید کا جائزہ لیتے ہیں۔

01 سنجیدہ رویۂ تنقید

02 غیر سنجیدہ رویۂ تنقید

01۔ سنجیدہ رویۂ تنقید

۱ مولانا شبلی نعمانی

۲ مولانا ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

۳ مولوی علی بخش شرر

۴ مولوی سید امداد علی

۵ نواب محسن الملک

02۔ غیر سنجیدہ رویۂ تنقید

۱ اودھ پنچ اخبار

۲ منشی سجاد حسین

۳ محمد اکبر، الٰہ آبادی

۴ مولانا ابوالکلام آزاد

۵ مچھو بیگ ستم ظریف

01۔ سنجیدہ رویۂ تنقید

۱۔ مولانا شبلی نعمانی کی تنقید:

مولانا شبلی نعمانی مذہبی عقائد میں سرسید احمد خان سے کچھ زیادہ پیچھے نہ تھے۔ مثلاً اپنی کتاب ''**الکلام**'' میں وہ معتزلی نظر آتے ہیں۔ سرسید احمد خان کے ساتھ ساتھ دیوبندی علماء ان کے بھی سخت مخالف تھے۔ شبلی نعمانی، سرسید احمد خان کی سیاست کے گن گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شبلی کی پالیسی کا اندازہ ان کی اپنی ایک تحریر سے لگایا جاسکتا ہے جو کہ انہوں نے خود اپنی وفات سے چند دن پہلے یو۔ پی گورنمنٹ کے ایک سیکریٹری کو بجھوائی تھی۔ اس میں لکھتے ہیں کہ:

> **''میں مدت العمر کبھی انگریزی حکومت کا بدخواہ نہیں رہا چنانچہ اس پر میری تمام تصانیف شاہد ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ 1908ء میں، میں نے الندوہ میں ایک مضمون کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت اور وفاداری مذہباً فرض ہے۔''**

۲۔ مولانا ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی تنقید:

سرسید احمد خان سے ڈپٹی صاحب کے اختلافات فکری نوعیت کے تھے۔ انہوں نے شبلی کی طرح علمِ بغاوت بلند کرنے کے بجائے اپنی فکری انفرادیت کو تحفظ دیا لیکن سرسید احمد خان کے اعتماد اور تعاون کو ٹوٹنے نہ دیا۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں سید صاحب کے فطرتی اور عقلی انتہا پسندی کی تصویریں بڑی خوبصورتی سے بنائی ہیں۔ پس! نذیر احمد کا اختلاف علی گڑھ تحریک کے دائرے کو وسیع کرنے میں صحت مند ثابت ہوا۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ڈپٹی صاحب نے اپنا ناول ''ابن الوقت'' سید صاحب کے بارے میں لکھا۔ یعنی اس ناول کا ہیرو جونگریز کا وفادار تھا اور انگریز کے جانے کے بعد تنہا رہ گیا تھا وہ سرسید ہی تھا۔

۳۔ مولوی علی بخش شرر کی تنقید:

مولوی علی بخش شرر، سرسید احمد خان کی نیک نیتی سے متفق نہ تھے۔ ان کا اختلاف جدت اور بدعت کا تھا۔ انہوں نے سرسید کی شکل میں فتنۂ فطریتی کا خطرہ محسوس کیا اور ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔

۴۔ مولوی امداد علی:

مولوی سید امداد علی نے اپنی کتابوں: ''**امداد آفاق**''، ''**تائید اسلام**'' اور ''**شہاب ثاقب**'' میں سرسید احمد خان کے نظریات کے مخالف نظر آتے ہیں۔ ظاہری سطح پر ان کا اختلاف مذہبی نوعیت کا نظر آتا ہے۔

02۔ غیر سنجیدہ رویۂ تنقید

۱۔ اودھ پنچ اخبار:

علی گڑھ تحریک کے غیر سنجیدہ ردِ عمل میں اودھ پنچ کا اخبار پہلے نمبر پر آتا ہے۔اس اخبار کو اردو کا پہلا ظریف اخبار ہونے کا مرتبہ بھی حاصل ہے۔منشی سجاد حسین اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ان کے علاوہ منشی مچھو بیگ عاشق (عرف ستم ظریف) اس اخبار کے لیے مضامین لکھتے تھے۔ان کے علاوہ تربھون ناتھ ہجرؔ، منشی جولا پرشاد برقؔ، احمد علی کمنڈوی، اکبرالہٰ آبادی اور نواب سید محمد آزادؔ اس اخبار میں کام کرتے تھے۔ یہ اخبار محض خبر رسانی نہیں کرتا تھا بلکہ پبلک میں اپنی آزادانہ رائے رکھتا تھا اور قومی حقوق کا تحفظ کرتا تھا اور ہندوستانی رؤسا کا ناصح اور محتسب بھی تھا۔

تحریک علی گڑھ کے ردِ عمل کے حوالے سے اس کا یہ کام تھا کہ اس کا ایک صفحہ اکبرالہٰ آبادی کے لیے مختص تھا جو کہ سید صاحب کی مخالفت میں لکھتے تھے۔اس کے علاوہ سید صاحب اور ان کے ہم خیالوں کے مزاحیہ کارٹون نکالے جاتے تھے۔نیز یہ اخبار کانگرس کا حامی تھا اور آخر تک اس نے کانگرس کی حمایت کی۔

۲۔ منشی سجاد حسین:

منشی سجاد حسین اودھ پنچ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔وہ منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر کے بیٹے تھے جو گورنمنٹ سے پنشن لے کر حیدر آباد دکن میں سول جج مقرر ہو گئے تھے۔منشی سجاد حسین 1856ء میں کوکوری میں پیدا ہوئے۔انٹرنس کا امتحان، کیننگ کالج سے پاس کر کے اور کچھ دنوں مختلف مخالفتیں کر کے 1877ء میں اپنا مشہور اخبار اودھ پنچ نکالا۔ان کی اعلیٰ طبعی کی وجہ سے بہت سے اہل کمال ان کے پاس جمع ہو گئے تھے جن میں پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی شامل ہیں۔جو اس اخبار کے لیے مضمون لکھتے تھے۔کبھی مذہبی اختلافی مضامین کو اپنے اخبار میں جگہ نہیں دی۔1901ء میں منشی سجاد حسین فالج میں مبتلاء ہو گئے 1912ء میں ان کا اخبار بند ہو گیا اور 1915ء کو طویل علالت کے بعد سجاد حسین نے وفات پائی۔

اودھ پنچ اخبار نے تحریک علی گڑھ کی کھل کر مخالفت کی۔ان کے اخبار میں تحریک علی گڑھ کی مخالفت میں مضامین کے لیے الگ سے صفحات مختص ہوتے تھے۔

۳۔ اکبرالہٰ آبادی:

اکبر نے بھی علی گڑھ تحریک اور سر سید کے متعلق صد ہا اشعار لکھے ہیں جن میں سے بعض اشعار اس قدر پر لطف ہیں کہ اکبر کے مخالفین بھی ان کی داد دینے پر مجبور ہو گئے۔علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی کے متعلق اکبر کی رائے کا اندازہ ان کے ان اشعار سے ہوتا ہے۔

؎ ابتداء کی جناب سید نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پر ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا

انہوں نے سرسید سے اختلاف کے باوجود ان کی شخصی خوبیوں کی قدر کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ انہوں نے بعض اخباروں میں ان کی خدمات کا اعتراف بھی کیا۔

؎ سید کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اٹھائے رنج سہے گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام

اکبرالہٰ آبادی سرسید احمد خان کی مغرب پسندی پر طنزیہ انداز میں تنقید کرتے تھے۔ اکبر کو مشرقی اقدار، علوم، رسوم ورواج اور مذہب و تہذیب بہت عزیز تھی۔ وہ گورنمنٹ ملازم ہونے کی وجہ سے مغربی تہذیب پر کھل کر تنقید تو نہیں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے طنز وظرافت کے ذریعے سے دل کی بات کہنے کا راستہ اختیا کیا۔

؎ واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبہ کو کم اور کلیسا نہ ملا

؎ نظر ان کی وہی کالج پر بس علمی فوائد پر
گریں گزر چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد:

مولانا ابوالکلام آزاد علی گڑھ تحریک کے مخالفوں میں سب سے آخری زاویہ نگار ہیں۔ جو بیسویں صدی میں سامنے آئے۔ ان کا اختلاف نظری تھا۔ اسی لیے زیادہ حقیقت بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ''الہلال'' میں علی گڑھ تحریک کے مذہبی، تعلیمی، تہذیبی اور تمدنی نقطۂ نظر کی مخالفت کی۔ ان کی مخالفت سرسید کے تعلیمی نظام پر بھی ہے۔ جس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ نوجوان انہیں خوبیوں سے عاری نظر آتا ہے ان کے خیال میں جدید تعلیم کی آڑ میں مذہب کو قربان کر دیا گیا ہے۔

ابوالکلام آزاد کے اختلافات کا ایک زاویہ ادبی نوعیت کا بھی ہے۔ سرسید نے اردو نثر کو سائنسی اسلوب عطا کیا۔ ابوالکلام آزاد نے اس سادگی پر شعریت کا مرصع غلاف چڑھا دیا۔ اور نثر کو جذباتی اظہار کا وسیلہ بنایا۔ **''الہلال''** اور **''تذکرہ''** کی نثر اجزائے تند و کشف کا مجموعہ ہے۔ تاہم ابوالکلام کا علم اردو نثر کو ایک دفعہ پھر ماضی بعید کی طرف لے جانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد **''غبار خاطر''** میں سادگی اور سہل ممتنع کی کیفیت پیدا کرنے پر مائل ہو گئے۔ انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کی خدمات کا اظہار بھی کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اس دور کا کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جو ''تہذیب الاخلاق'' کے حلقۂ ادب سے متاثر نہ ہوا ہو۔''

۵۔ مچھو بیگ عاشق:

مچھو بیگ عاشق، مرزا اصغر علی بیگ کے بیٹے جن کا اصل نام ''مرزا محمد مرتضیٰ عرف مرزا مچھو بیگ عاشقؔ ''تھا، ستم ظریف کے نام سے اخبار اودھ پنچ میں اپنے مضامین لکھتے تھے۔ انہوں نے بھی سرسید احمد خان کی خدمات کو نہیں سراہا اور ان پر تنقید کی۔

ان کی تصنیف شدہ نظم ونثر کی کتابیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ **گلزار نجات**----------

۲۔ **میلاد شریف** (منظوم)----------

۳۔ **آفتابِ قیامت** (لیکچر کے انداز میں ایک ظریفانہ نظم جو الہٰ آباد میں پڑھی گئی تھی)

۴۔ **بہار ہند** (اردو مہاورے کی ایک نا تمام لغت)

۵۔ **مثنوی نیرنگِ خیال**----------

۶۔ **چشمِ بصیرت** (بعض مضامین جو اودھ پنچ میں نکل چکے تھے۔)

۷۔ **اردو دیوان** (ان کا اردو دیوان ان کے بیٹے محمد صدیق کے پاس ہے جو تا حال چھپا نہیں ہے۔ بحولہ سکسینہ تاریخ ادب اردو: ص۔۵۲۳)

رومانوی تحریک

زمانی اعتبار سے یہ طے کرنا ممکن نہیں کہ اردو میں رومانی تحریک کا باقاعدہ آغاز کس وقت ہوا۔علی گڑھ تحریک کے خلاف جو ردِعمل انیسویں صدی کے اواخر میں ہوا اس میں رومانی بغاوت کے عناصر موجود تھے۔محمد حسین آزاد نے ''**نیرنگِ خیال**'' میں ایسی رنگین جلوہ آرائیاں کیں جنہیں ایک رومانی تخلیق کرسکتا تھا۔میر ناصر علی، مہدی افادی، عبدالحلیم شرر اور سجاد انصاری کے ہاں بھی خیال کی آزادہ روی طغیانِ اظہار کے زاویے رومانی نوعیت کے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں نئے علوم نے متخیلہ کو آزادی عطا کی تھی۔چنانچہ خوب تر جہان کی تلاش اس دور کا ایک غالب رومانی رجحان ہے جو ادب کے علاوہ معاشرت، تہذیب اور سیاست کے اداروں اور شخصیتوں میں بھی پروان چڑھا۔ ''**رسالہ مخزن**'' کے صفحات سے ایسے متعدد ادیب ابھرے جنہوں نے رومانی تصورات کو فروغ دیا۔ان میں سے علامہ اقبالؒ، سجاد حیدر یلدرم، ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری اور متعدد دوسرے ادباء کے نام آتے ہیں۔آثار و قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رومانیت کی تحریک کو عہد اقبالؒ میں زیادہ فروغ حاصل ہوا۔اور اس تحریک نے کم وبیش چالیس برس تک ہر صنف سخن کے ادباء کو اپنے داخلی جادو اور لاابالی پن سے متاثر کیے رکھا۔اس تحریک نے ایک فوج کی طرح پیش قدمی کر کے قدیم پر فتح یاب ہونے کی کوشش کی، جذبے کو بلند پروازی سکھائی ادیب کو اندر کی کائنات سے متعارف کرایا، اور نئے لفظ اور جدت آفریں خیال کے امتزاج سے روح پرور ادب تخلیق کیا۔المیہ یہ ہوا کہ رومانی ادبا ستاروں کی دھول کا تعاقب تو کرتے رہے لیکن اپنی منزل کو بھلا بیٹھے۔چنانچہ چوتھی دہائی میں رومانی تحریک کے بطون سے اردو کی طاقت اور منظّم ترقی پسند تحریک پیدا ہوئی جس نے معاشرے کی قدروں پر رومانی انداز میں ضرب لگائی، لکھے ہوئے منشور پر عمل کیا اور ایک خاص سانچے کا ادب پیدا کیا۔

رومانیت کی مختلف تعریفیں

مبداء

''**رومانیت**'' لفظ ''**رومانس**'' (Romance) سے نکلا ہے۔لاطینی زبان میں "Romannz" یا "Romanic" یا "Roananiz" کے نام سے پکارا جاتا تھا اور ان میں موجودہ لٹریچر (ادب) کو ''**رومانس**'' کا نام دیا جاتا تھا۔ابتداء میں من گھڑت منظوم قصوں کو اور بعد میں نثری قصہ کہانیوں کو "Romance" کے نام سے پکارا جانے لگا پھر مافوق الفطرت عناصر، عجیب وغریب واقعات اور عشق ومحبت پر مبنی ادبی تحریروں کو ''رومانس'' پکارا جاتا رہا۔

رومانیت کے بارے میں مختلف محققین کی آراء پیش خدمت ہیں۔

کرمول

کرمول نے آزادی پسندی کے میلانات کو رومانیت کہا۔

ڈیوڈلیشز

ڈیوڈلیشز نے مسرت، حسن اور جذبات نگاری کو رومانیت قرار دیا۔ بعض نے عشق و محبت کی کیفیات کو ''رومانس'' کہا تو بعض کے نزدیک انوکھے واقعات کو ''رومانس'' کہا جاتا رہا۔

جیکولورین

جیکولورین کے نزدیک رومانی رویہ عقل دشمنی، انسانیت اور مصنوعی زندگی کے خلاف فطری احساسات و جذبات کی وکالت کرتا ہے۔

''اردو ادب میں رومانیت کی اصطلاح انگریزی اصطلاح "Romanticism"
کے ترجمے کے طور پر استعمال کی جاتی ہے ۔ انگریزی کی اصطلاح
Romanticism رومان Roman اور رومانس Romance سے بنی ہے۔''

یورپ میں رومانیت Romanticism کا لفظ ادبی اصلاح کے لیے اٹھارہویں صدی عیسوی میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ اس اصطلاح کا اطلاق حسین قسم کے ادب پر ہوا۔ اس میں بنیادی طور پر تو انہی خصوصیات کو ملحوظ رکھا گیا۔ جو رومانس لینگویجز کے ادب میں موجود تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ رومانیت کے مفہوم میں وسعت آنے لگی اور یہ اصطلاح کلاسیکی اور حقیقت پسندی کی اصطلاحوں کی متضاد اور مخالف اصطلاح بن گئی۔

روسو

اٹھارہویں صدی عیسوی میں فرانس کے مفکر ''روسو'' کے افکار کے اثرات نمایاں رہے۔ اس کے مطابق انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر دکھائی دیتا ہے۔ وہ انسان کے بنیادی فطری نیکی کا بھی قائل ہے۔ اس کے افکار میں "Back to Nature" کا تصور ملتا ہے۔ چنانچہ روسو کو رومانیت کا نقیب اور اس کی آواز کو رومانیت کا مطلع کہا جاتا ہے۔ رومانیت کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں ان میں۔

ڈاکٹر فخر الحق نوری نے ''شعور ادب'' کے صفحہ نمبر 288 پر لکھا ہے کہ:

''فرد کے شدید جذبات کا شدید اظہار، آزادہ روی، انا کا غلبہ، انفرادیت، احساساتی اور تخیلاتی رجحان، تصورات کی دنیا میں جذباتی آسودگی ، فرد کی داخلی کیفیات ، عورت اور مرد کا جذباتی اور جنسی رشتہ، خیالات کا بہاؤ، فطرت کی طرف رجوع، ماضی بعید کے خواب، تمدنی زندگی کے بجائے فطرت کے قریب، غیر متمدن اور دیہی زندگی کا مشاہدہ، فطرت کے مناظر، روایت کی تردید، طریقہ راسخ قدما سے انحراف، ہیت پر مواد کی ترجیح، غیر منظم محیر العقول اور وحشی عناصر میں دلچسپی اور جذباتی اہمیت شامل ہیں۔''

رومانی شعراء

رومانی شعراء نے شاعری میں طغیان جذبات کو زیادہ اہمیت دی، زندگی کی بکھری ہوئی دھند سے خواب ناک آرزوؤں کی تعبیر تلاش کی اور فطرت کے جمالِ جہاں تاب کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ اس قسم کی شاعری میں کیف کم اور لذتیت زیادہ تھی اور اس نے نوجوانوں کو زیادہ مسحور کیا۔

01 ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (متوفی ۱۹۳۸ء)

اگر ہم قیام پاکستان سے پہلے اقبالؒ کی شاعری کو دیکھیں تو ان کی رومانیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اقبالؒ کی شاعری میں رومانیت کے عناصر موجود تھے جس نے بعد میں آنے والوں کو متاثر کیا۔ قومی شاعر ہونے کی بنا پر سب سے پہلے ہم اقبالؒ کے حوالے سے رومانیت کو دیکھتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ ابتداء میں رومانی شاعر تھے۔ اسی لیے **ابر کوہسار، آفتاب، چاند، شمع، ستارۂ صبح** اور **جگنو** جیسی نظموں میں تحیر بھی ہے اور حسن کی روحانی انداز میں پرستش بھی۔ اقبالؒ نے رومانی زاویوں سے ماضی کی عظمتوں کو اجاگر کیا ہے۔

اقبالؒ کی رومانیت بنیادی طور پر ان کے فلسفے میں بھی پوشیدہ ہے۔ ان کے رومانوی تصور کا فکری زاویہ نظریہ خودی میں اور مثبت سطح پر عملی زاویہ مردِ مومن کے کردار میں ابھرا۔

؎ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب ، کار آفریں ، کارکشا ، کارساز

؎ خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ — خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ (اقبالؒ)

ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''اقبال کے ہاں جذبات اور وجدان کی افراط کا غلبہ اس قدر زیادہ ہے کہ اگر ان کو رومانوی شاعر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔'' بحوالہ: (اردو ادب کی رومانوی تحریک: ص۔29)

؎ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

؎ اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے (اقبالؒ)

02 شبیر حسین خان جوشؔ ملیح آبادی (متوفی ۱۹۸۱ء)

جوش ملیح آبادی، فقیر محمد گویا کے خاندان سے تھے، ملیح آباد میں ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ گئے لیکن شرارتوں کی بنا پر کالج سے نکال دیئے گئے۔ کچھ عرصہ حیدر آباد میں ملازمت کی لیکن نظام کے خلاف ایک ایک نظم لکھنے پر ریاست بدر کر دیئے گئے۔ ان کی قومی نظموں میں انگریزی حکومت کے خلاف شدید جذبہ موجود ہے۔ ان کی خودنوشت سوانح **''یادوں کی برات''** ان کی رنگا رنگ زندگی اور برے دنوں کی معاشی بدحالی کا آئینہ ہے لیکن اسے زیادہ شہرت جوشؔ کے اٹھارہ معاشقوں کی وجہ سے ملی، انہوں نے اپنے میلانات میں شعر گوئی، عشق

بازی، علم طلبی اور انسان دوستی کو شمار کیا ہے۔ان کی شاعری کے مجموعوں میں سے **''روح ادب''** ، **''شعلہ وشبنم''** ، **''نقش ونگار''** ، **''فکرونشاط''** ، **''سیف وسبو''** ، **''جنون وحکمت''** اور **''عرش وفرش''** بہت مشہور ہیں۔

جوشؔ بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے،اس رومانویت کا ایک زاویہ ان کی انقلاب پسندی بھی تھا اور اس کا طوفانی ابال سیاسی نوعیت کا تھا۔انہوں نے مناظر، مظاہر، اشیاء اور نسوانی پیکروں کو رومانی آنکھ سے دیکھا اور تاثر کا جمالیاتی زاویہ تشبیہوں اور استعاروں سے آراستہ کیا۔اس کا ایک دل آویز نقش حسب ذیل ہے۔

؎ یہ ابلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں
ہر سراپا بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل
عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کا خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز ، پتھریلا شباب (جوشؔ ملیح آبادی)

جوش کے نعرۂ انقلاب میں للکار اور رجز کا انداز موجود ہے لیکن یہ نعرہ داخلی طور پر کھوکھلا اور بے روح ہے۔اور یہ ایک ایسا خیالی جہاں تخلیق کرتا ہے جو بے حقیقت ہے۔

؎ اٹھ اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر
؎ عقولِ مردہ و مرطوب نوع انساں میں شرار و شعلہ و دود و بخار پیدا کر (جوشؔ)

جوشؔ نے جذبے کی افقی سطح کو چھوا اور اس کے ارضی زاویے کو نمایاں کیا۔اس عمل میں الفاظ ان کے غلام اور تشبیہات ان کی کنیزیں نظر آتی ہیں۔ترقی پسند تحریک نے ان کی انقلابی آواز کو اپنے منشور کے مطابق پا کر انہیں اپنی تحریک کا رکن بنالیا لیکن جوشؔ منشور کی پیروی کرنے کے بجائے اپنی ذاتی آواز میں گھن گرج پیدا کرنے میں مصروف رہے۔جوشؔ نے غزل کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی اور پابند نظم کو اظہار کا وسیلہ بنایا۔ان کی جدید مرثیہ نگاری کو اردو شاعری میں دقیق مقام حاصل ہے۔ان کی رباعیات میں بھی طغیانِ جذبات گرجیلے انداز میں سامنے آتا ہے۔

؎ کیا شیخ ملے گا لن ترانی کر کے توہینِ مزاجِ جوانی کر کے
؎ تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے (جوشؔ)

جوشؔ کی نظموں میں سماج کو بدلنے کا ترقی پسند زاویہ موجود ہے۔انہوں نے خطابیہ انداز میں قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ **''غلاموں کی بغاوت''** ، **''ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام''** اور **''نظامِ نو''** میں جوشؔ نے مزاحمتی رویہ اختیار کیا اور احتجاج کا لہرا اٹھایا۔لیکن کمزوری یہ ہے کہ انقلاب کا فلسفہ سامنے نہیں آتا۔چنانچہ جوش وجذبہ اور نعرہ بازی داخلی ایقان سے عاری نظر آتی ہے۔

03 محمد داؤد خان اختر شیرانی (متوفی ۱۹۴۸ء)

حافظ محمود شیرانی کے بیٹے اختر شیرانی ٹونک میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اردو نظم میں حالی کی اصلاحی روش کے برعکس داخلی جذبے کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے نسوانی حسن اور عشق والہانہ کی کیفیات کو نظم کی صورت دی۔ اختر شیرانی حسین عورت کے پرستار اور اس سے باتیں کرنے کے مشتاق تھے۔ ان کی زندگی رومانی بغاوت کی مثال تھی۔ ان کے والد حافظ محمود شیرانی عتیقیات کے مطالعے میں مگن رہنے والے محقق تھے۔ ردِعمل کے طور پر اختر شیرانی نے تعلیم سے فرار اختیار کیا اور عشق اور خمریات میں پناہ حاصل کر لی اور آخر موت بھی کثرتِ مے کی وجہ سے ہوئی۔ ان کی شاعری کی ممتاز کتابوں میں

صبح بہار	اخترستان	لالۂ طور	طیور آوارہ	شہناز اور شہرود

کا شمار ہوتا ہے۔

اختر شیرانی کی شاعری میں کائنات عورت کے جمالیاتی روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ انہوں نے ایک خوابِ شیریں میں زندگی گذاری محبوب سے ملاقات کی یاد کو ذہنی طور پر زندہ رکھا اور اس کی خدائی کو تسلیم کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

ے ہمارے پر بتوں کے تار بے خواب اس کے نغموں سے بتوں کے مرمریں نغموں سے نکہت اس کی آوارہ

ے غرض جب تک یہ دنیا ہے اور اس کی خوش نمائی ہے ہماری زندگی پر صرف عورت کی خدائی ہے (اختر شیرانی)

حکیم نیر واسطی نے اختر کی محبوبہ سلمٰی کے حقیقی وجود کی نشاندہی کی ہے لیکن اس کی حیثیت ایک افسانے سے زیادہ نہیں، ان کی محبت افلاطونی عورت کا سراپا عنبریں دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ چنانچہ اختر کے نہاں خانۂ خیال میں ایک نہیں کئی محبوبائیں تھیں جن کا ذکر انہوں نے والہانہ انداز میں کیا۔

ے کبھی سلمٰی کے رومان حسیں کے تذکرے کیجئے کبھی عذرا کے افسانے کو عشق رائیگاں کہیئے

ے کبھی پرویں کی مرگِ عاشقی پر فاتحہ پڑھیئے کبھی شمسہ کے زہر آلود ہونٹوں کا بیاں کیجئے (اختر شیرانی)

''اودیس سے آنے والے بتا''، **''جہاں ریحانہ رہتی ہے''**، **''عورت اور پھول''**، **''قلوپطرا''**، **''جوگن''** اور **''اے عشق کہیں لے چل''** جیسی نظموں میں اختر نے پاپ کی نکلنے اور ریحانہ، زہرہ اور سلمٰی جیسی کسی مہ جبیں کی زلفوں میں پناہ لینے کی آرزو کی ہے۔

''اُٹھ ساقی تلوار اُٹھا''، **''عشق آزادی اور شاعر''**، **''جھونپڑی کا دیا''** اور **''خرابی و تعمیر''** جیسی نظموں میں اختر شیرانی نے سیاسی اور انقلابی شاعر بننے کی کوشش کی لیکن یہ ان کا اصلی رنگ نظر نہیں آتا۔ ان کی غزل کے جمالیاتی زاویوں میں عورت اور شراب کا پرتو جھلکتا ہے۔ اردو شاعری میں اختر شیرانی کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے جیتی جاگتی عورت کو نظم میں اہم موضوع کی حیثیت دی اور نظم کو خارج سے باطن کی طرف موڑ دیا۔ انہوں نے گیت میں تخلیقی اظہار کیا تو مفارقت سے ابھرنے والی یادوں کو اہمیت دی جس سے اردو گیت کو نئی جہت مل گئی۔ **''چاندنی راتوں میں''** اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

04 حفیظؔ جالندھری (متوفی ۱۹۸۳ء)

حفیظؔ ابتداء میں فطرت کے ثنا خواں کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اور انہوں نے بہت سی معصوم حیرتوں کو جگایا۔ چنانچہ شباب کی بے فکری، خودنگری اور نغمگی ان کی شاعری کے اوصاف ہیں جو ''**نغمہ زار**'' کی نظموں سے ظاہر ہیں، ''**سوز وساز**'' میں وہ جستجوئے جمال میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ حفیظؔ تلمیذالرحمٰن تھے، اپنی ذاتی صلاحیت سے انہوں نے غزل، گیت اور نظم تینوں اصناف کو یکساں قادرالکلامی سے استعمال کیا اور نغمہ زار، سوز وساز، تلخابۂ شیریں، شاہنامۂ اسلام جیسی کتابیں تخلیق کیں، پاکستان کا قومی ترانہ بھی حفیظؔ کے ذہن رسا کا اعجاز ہے۔

حفیظؔ نے اقبالؔ، حالیؔ اور ٹیگورؔ کے نمایاں اثرات قبول کیے، ہیت کے تجربات میں انہوں نے عظمت اللہ خان کے آگے قدم بڑھانے کی سعی کی، ان کی شاعری میں اخلاقی اور جذباتی دونوں قسم کی اپیل موجود ہے اور یہ داخلی موسیقی کے سہارے دل میں اتر جاتی ہے۔ انہوں نے ''**رقاصہ**''، ''**ابھی تو میں جوان ہوں**''، ''**اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے**''، ''**اب خوب ہنسے گا دیوانہ**'' وغیرہ نظموں سے قلب وروح کو تازگی بھی عطا کی اور سامان عبرت بھی فراہم کیا۔ ان کے ہاں شعری غنائیت کا جادو چھوٹے چھوٹے مصرعوں کے تسلسل وتواتر سے بھی جاگ اٹھتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

؎ اُٹھی حسینۂ سحر — پہن کے سر پہ تاجِ زر
لباس نور زیب پر — چڑھی فرازِ کوہ پر
وہ خندۂ نگاہ سے — پہاڑ طور بن گئے
وہ عکس جلوہ گاہ سے — سحاب نور بن گئے
نوائے جوئبار اٹھی — صدائے آبشار اٹھی
ہواؤں کے رباب اٹھے — خوش آمدید کے لئے (حفیظؔ)

حفیظؔ کی رومانویت کا ایک زاویہ **اسلام اور مشاہیر اسلام**، **ارض وطن** اور **مشاہیر وطن** کی محبت سے بھی عیاں ہے۔ ان کا **شاہنامۂ اسلام** تاریخ کے بیانیہ کو شعری پیکر میں پیش کرنے کی عمدہ مثال ہے۔ ڈاکٹر صادقؔ کا یہ خیال درست نہیں کہ

''**یہ نظم خلد میں تخلیق ہوئی اور اس کی جڑیں زمین میں اتر نہیں سکیں۔**'' (بیسویں صدی کا اردو ادب: ص۔۱۷۷)

ڈاکٹر محمد انور سدیدؒ لکھتے ہیں کہ:

''**غزل میں حفیظؔ ایک عاشقِ صادق کی صورت میں سامنے آتے اور عرضی کیفیات کو جذباتی لہجے میں پیش کرتے ہیں۔**''

حفیظؔ کی غزل میں عصری آگہی کا پرتو بھی موجود ہے۔ مثلاً:

؎ جس نے اس دور کے انسان کیے ہیں پیدا — وہ ہی میرا بھی خدا ہو، مجھے منظور نہیں
کھا جو تیر دیکھا کمیں گاہ کی طرف — اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی (حفیظؔ)

انہوں نے اردو گیت کو صرف عورت سے پیار اور محبت کے اظہار کے لیے مخصوص نہیں کیا بلکہ گرد و پیش کی اشیاء اور مظاہر سے والہانہ محبت کو بھی گیت کے وسیلے سے ہی ظاہر کیا۔ جس سے اردو گیت کو معنوی وسعت ملی۔

05 ڈاکٹر محمد دین تاثیر (۱۹۵۰ء)

ڈاکٹر محمد دین تاثیر اگرچہ ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے لیکن بنیادی طور پر ایک رومانی ادیب تھے اور اپنے لا ابالی جذبے سے پابندی اور قید کو قبول نہیں کرتے تھے، ترقی پسند تحریک سے انحراف بھی ان کے رومانی مزاج ہی کی ایک جست تھی۔ انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیمبرج سے لی تھی لیکن اپنے مشرقی مزاج کو قائم رکھا۔ ان کی شاعری کا مجموعہ **''آتش کدہ''** ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

تاثیر کی شاعری میں اقبالؔ کا آہنگ اور حفیظؔ کی موسیقی توجہ کھینچتی ہے، ان کی آزاد نظموں میں مغرب کے رومانی شاعروں کے اثرات نمایاں ہیں، موضوعاتی اعتبار سے انہوں نے سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی اور **''بہار آفرینا گناہ گار ہیں ہم''** ، **''دہقاں کا مستقبل''** اور **''انسان''** جیسی نظمیں لکھیں۔ لیکن ان کی جن نظموں کی زیادہ پذیرائی ہوئی ان میں **''رس بھرے ہونٹ''**، **''دیوداسی''** ، **''مان بھی جاؤ''**، **''لندن کی ایک شام''** شامل ہیں۔ ان نظموں میں جذبہ داخل کے سرچشموں سے پھوٹتا ہے۔

دھواں دھار مژگاں		ستارہ سی آنکھیں
چنبیلی سے شاداب اب لب بھیگے بھیگے		
چنبیلی کی کونپل پہ شبنم کے قطرے		
ہرے	کھیت	چشمے
یہ مژگاں ، یہ آنکھیں ، یہ لب پیار پیارے		
نظر کے ستارے ، ہنسی کے شرارے		

تاثیر نے شاعری کی طرف پوری توجہ نہیں دی اس کے باوجود انہیں اردو کے جدید اور تازہ فکر رومانی شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے شعری تجربات سے جدید شاعری کو بہت فروغ ملا ہے۔

06 احسان دانشؔ (متوفی ۱۹۸۳ء)

انسان دانشؔ کی شاعری مسرت کے لمحۂ نایاب اور محرومیوں کی افراط سے پیدا ہوئی۔ ان کے والد قاضی دانش علی کاندھلہ کے رہنے والے تھے اور غربت کی وجہ سے احسان دانشؔ کو زیور تعلیم سے آراستہ نہ کر سکے۔ وہ زندگی کی پستی سے بلندی کی طرف سفر کے دوران ہزاروں تجربات سے گذرے اور انہیں بڑی قادر الکلامی سے نظم اور غزل کی اصناف میں پیش کیا۔ **نوائے کارگر**، **آتشِ خاموش**، **چراغاں**، **شیرازہ**، **مقامات**، **زخم و مرہم** اور **فصل و سلاسل** ان کی شاعری کے چند گراں قدر مجموعوں کے نام ہیں۔ مذہبی شاعری میں ان کا جوہر نعت میں کھل کر سامنے آیا۔ ان کے دوسرے ادبی کارناموں میں ان کی خود نوشت سوانح **''جہان دانشؔ''** ، **غالبؔ کی شرح** ، **رموزِ غالبؔ**،

لغات الاصلاح اور ضرب الامثال اور اردو مترادفات شامل ہیں۔

احسان دانش نے اپنی شاعری میں بنیادی طور پر اس غم کو اجاگر کیا جو انسانی دردمندی سے پیدا ہوتا ہے۔ان کی شاعری جگ بیتی بھی ہے اور آپ بیتی بھی۔ ''**سولن کی شام**'' ، ''**بیتے ہوئے دن**'' ، ''**صبح بنارس**'' اور ''**شام اودھ**'' ایسی نظموں میں وہ ایک فطرت نگار اور رومانی شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ ''**بیگانۂ انجام**'' اور ''**جشن بے چارگی**'' جیسی نظموں سے درونِ دل سے ابھرنے والی گہری کسک موجود ہے،احسان نے زندگی کا تماشا بھی کیا اور خود تماشا بھی بنے۔ چنانچہ ان کے لہجے میں فریاد زیادہ ہے اور اس کے زیر سطح معاشرے کے اخلاق زوال پر عدم اطمینانی موجود ہے۔ان کی غزل میں تلاطمِ حیات میں شامل ہونے اور موجوں کا نظارہ کرنے کا انداز صاف دکھائی دیتا ہے۔

؎ قطرے کی ترائی میں تھے طوفاں کے نشیمن ذرے کے احاطے میں بگولوں کا سفر تھا

؎ وہ معترض ہیں میرے چراغوں پہ خود جنہیں آتا ہے روشنی میں نظر ، کم ، بہت ہی کم

؎ آئی ہے اب کہ دشتِ جنوں میں عجب بہار مٹی کا سرخ رنگ ، ، تمنا کے زرد پھول (دانش)

07 روشؔن صدیقی (متوفی ۱۹۷۱ء)

روشؔن صدیقی نے ارضی حقیقتوں کو رومانی نظر سے دیکھا اور حبِ وطن کے جذبے کو نمایاں کیا۔ان کی شاعری میں سیاسی شعور زیادہ پرزور نہیں تاہم انہوں نے حسن کو ازلی اور ابدی حقیقت سمجھا اور اجتماعی مشقت سے حسین مستقبل کا خواب دیکھا۔

08 حامد اللہ افسؔر میرٹھی

افسؔر میرٹھی کی شاعری میں سادگی اور موسیقیت ہے،بچپن کے معصوم خوابوں کی لطافت نے انہیں ہمیشہ مسحور کیے رکھا۔

''**میں جس کو ڈھونڈتا ہوں**'' ، ''**مالن**'' اور ''**مسافر**'' جیسی نظموں میں رس بھری مسکراہٹیں ہلکورے لیتی نظر آتی ہے۔

09 علی اختؔر حیدرآبادی (متوفی ۱۹۵۸ء)

اختؔر حیدرآبادی کی شاعری میں بھولی بسری یادوں اور ارضِ وطن کی اشیاء اور مظاہر کے لیے والہانہ شیفتگی موجود ہے اور پڑھنے والے ان کی رومانی لطافتوں سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔

10 اختؔر انصاری دہلوی (پیدائش ۱۹۰۹ء)

اختؔر انصاری نے نوائے جاوداں سے چہرۂ کائنات کو تبدیل کرنے کی تمنا کی،ان کی رومانیت شکستِ خواب کی المیہ کیفیت سے پیدا ہوئی۔

11 ساغؔر نظامی

ان کی شاعری میں خود پسندی نے ایک قدر کی حیثیت اختیار کر لی تھی، چنانچہ انہوں نے اپنی ذات میں کائنات کا جلوہ دیکھا اور رومانی کرنیں بکھیرنے کے بجائے انہیں اپنی شخصیت کے نقطے پر مرتکز کرنے کی شعوری کاوش کی۔

12 الطافؔ مشہدی (پیدائش ۱۹۱۴ء)

الطاف مشہدی نے زلف ورخسار کی عبادت کی اور شاعری میں حساس دنیادار شاعر کا پرتو پیش کیا۔ معنوی طور پر الطافؔ کے ہاں اخترؔ شیرانی کی بازگشت موجود ہے۔ **''اقبالؒ کا پیغام''** اور **''پتہ بھی نہیں ہلتا بغیر اس کی رضا کے''** ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ ان کی غزل میں بے ساختگی اور خستگی موجود ہے۔

ڈاکٹر انور سدیدؒ کے مطابق:

(الطافؔ مشہدی نے) **''شاعری میں ایک حساس دنیادار شاعر کا پرتو پیش کیا۔''**

رومانی نثر کے معمار

سرسید احمد خان نے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو نثر کی جس روایت کو فروغ دیا تھا اس میں متانت اور سنجیدگی زیادہ تھی اور خیال کی رومانی لپک مفقود تھی۔ چنانچہ اس قسم کی نثر کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا تو چند ایسے ادبا سامنے آئے جنھوں نے حقیقت کو دلآویز اسلوب میں پیش کرنے میں دلچسپی لی اور نثر میں شعر و نغمہ کی کیفیت پیدا کر دی، نثر کی اس تحریک کو فروغ دینے میں ایک اہم کردار رسالہ ''مخزن'' نے بھی ادا کیا جس کے مدیر شیخ عبدالقادر ادب میں اسلوب ہئیت اور معنی کی نیرنگیوں کو سمونے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ لیکن اس قسم کے نثر نگار زیادہ تعداد میں علی گڑھ سے ابھرے جہاں سرسید کے عہد کی نثر کے خلاف ایک رویہ موجود تھا۔ اس قسم کے ادیبوں میں ایک اہم نام سجاد انصاری کا ہے۔

01 سجاد انصاری (متوفی ۱۹۲۴ء)

سجاد انصاری کا تعلق اس نوجوان نسل سے تھا جسے علی گڑھ میگزین نے پروان چڑھایا تھا۔ انہیں شاعری سے بھی دل چسپی تھی لیکن انہیں شہرت اس نثر سے ملی جو نہ افسانہ ہے، نہ انشائیہ نہ تنقید لیکن اس نثر میں ان سب اصناف کی خوبیاں موجود ہیں۔ یہ ایسی رومانی نثر ہے جو اپنے داخلی اوصاف کی بنا پر شاعری کا درجہ رکھتی ہے اور انسان کی چھٹی حس کو بیدار کر دیتی ہے۔ سجاد انصاری کی عطا ایسے رومانی جملے کی تخلیق ہے جو روح کو سرشار کر دیتا ہے۔ چند جملے ملاحظہ کیجئے۔

01 ''انسان نہ حق ہے اور نہ باطل۔ اس کا وجود محض فریبِ کائنات ہے۔''

02 ''میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو یا تو ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم۔''

سجاد انصاری کی تخلیقی نثر مشرق کی روحانی قدروں کی امین ہے۔ یہ شگفتنِ گل کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ادب میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

02 مہدی افادی (متوفی ۱۹۲۱ء)

مہدی افادی محکمہ مال میں تحصیلدار تھے لیکن ادب سے انہیں والہانہ لگاؤ تھا۔ ان کی زندگی میں ایک مخصوص نوع کا حسن اور لطافت تھی جس کا بھرپور نقش ان کی نثر میں اتر آیا تھا۔ ان کے مضامین میں حواسِ انسانی کے ادراک کا زاویہ نمایاں ہے اور وہ جذبے کو آتش فشاں کی طرح اچھالنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے عورت کو یونانی، ایرانی اور عربی آنکھ سے دیکھا اور اسے بدوی صداقت سے پیش کر دیا۔ اس کی ایک مثال حسبِ ذیل ہے۔

''عورت وہی باکیف ہوگی جو لذت آشنا ہوگی اور جس میں لذتِ احساس کامل ہو۔ یہ عالمِ فطرت کی نیرنگیاں ہیں، شراب کی طرح کہ جتنی پرانی ہو مزے دار ہوتی ہے۔''

مہدی کی نثر اتنی لذت انگیز ہے کہ قاری اس کے کیف میں ڈوب جاتا ہے اور یہ خوبی ہی اس نثر کی کامیابی کا باعث ہے۔

03 سجاد حیدر یلدرم (متوفی ۱۹۴۳ء)

سجاد حیدر یلدرم، مشہور ناول ''آگ کا دریا'' کی مصنف قرۃ العین حیدر کے والد ہیں۔ان کے رومانی مزاج کی تربیت میں علی گڑھ اور شبلی نے زیادہ حصہ لیا۔اس مزاج کو ترکیہ میں قیام کے دوران بھی پروان چڑھنے میں مدد ملی۔ یلدرم نے اشیاء اور مظاہر کو نئے زاویوں سے دیکھا اور حقیقت کا انوکھا روپ اجاگر کیا۔انہوں نے اپنی مندرجہ ذیل تصنیفات:

☆ ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ''

☆ ''چڑیا چڑے کی کہانی'' اور

☆ ''حضرتِ دل کی سوانح عمری''

میں انکشافِ ذات کا زاویہ اور جذبے کی رومانی لپک موجود ہے اور یہ انشائیہ ہی کے محاسن ہیں۔اس نثر کا ایک نمونہ حسبِ ذیل ہے جو ان کی کتاب ''خیالستان'' سے ماخوذ ہے۔

''اگر میں صحراء نشین ہوتا تو طلوع وغروبِ آفتاب کے نظارے سے ہر روز متاثر ہوتا۔چاندنی رات کو میں دیکھتا کہ چاند اور ستارے زمین کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں، اندھیری رات میں تمام عالم کی تاریکی اور ہر چیز کی خاموشی مجھ پر اثر کرتی اور میں اپنے دل میں عمیق حسیات محسوس کرتا۔''

04 ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء)

ابوالکلام آزاد کسی مدرسے کے تعلیم یافتہ نہیں تھے، انہوں نے تمام تعلیم اپنی ذاتی استعداد سے حاصل کی تھی ان کی نثر کا خمیر عربی اور فارسی کی تہذیبی روایت سے اٹھا تھا۔انہوں نے لفظ اور خیال کو اس طرح مربوط کیا ہے کہ پورا جملہ ایک مکمل کردار کی صورت میں سامنے آجاتا ہے اور یہ ایسا کردار ہے جس میں قوت اور حرکت بھی ہے اور یہ ہیجان پیدا کرنے کی قوت بھی رکھتا ہے۔ان کی نثر کا مزاج بدوی ہے اور یہ ایک صحرائی نغمے جیسا کیف پیدا کرتی ہے۔''**تذکرہ**''، ''**قول فیصل**'' اور ''**ترجمان القرآن**'' کی نثر اور ''**غبار خاطر**'' کی نثر میں واضح فرق نظر آتا ہے۔اوّل الذکر سے آزاد کی عالمانہ شان اور مؤخر الذکر سے شخصیت کا مرقع سامنے آتا ہے۔

''**غبار خاطر**'' کی نثر کے تمثیلی انداز میں ایک داخلی قوت موجود ہے جو مفہوم کو خوش سلیقگی سے قاری تک منتقل کرتی ہے اور اسے محسور کر دیتی ہے۔یہ انشائی مزاج ابوالکلام کی نثر کا خاصہ ہے اور صرف انہی سے منسوب ہے۔

05 نیاز فتح پوری (متوفی ۱۹۶۶ء)

نیاز فتح پوری کی نثر میں خیال اور خیال کی مصوری، شوق اور شوق کی تحلیل لفظی، حسن اور حسن کی پیکر آفرینی نمایاں ہے۔وہ اگرچہ

دارالعلوم ندوہ کے تعلیم یافتہ تھے لیکن انہوں نے مذہب کو عقلیت کی میزان پر رکھ کر دیکھا اور نتائج کا برملا اظہار ''نگار'' میں کیا۔ ''شہادت کی سرگزشت''، ''شاعر کا انجام'' اور گیتان جلی کے ترجمہ ''عرضِ نغمہ'' میں انہوں نے زندگی کو ایک آزاد فکر ادیب کی نظر سے دیکھا اور ذاتی تاثر کو اس طرح پیش کیا کہ جذبے کی طغیانی صورت سطح پر ابھر آئی۔ چنانچہ نیاز نے جذبات پرستی کو ایک مذہب بنا دیا۔

06 قاضی عبدالغفار (متوفی ۱۹۵۶ء)

قاضی عبدالغفار نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت اختیار کی لیکن پھر وہ صحافت کی طرف مڑ گئے اور ہمدرد، جمہور، صباح اور پیام میں کام کیا۔ قاضی صاحب کا ذہن مغربی لیکن دل مشرقی تھا۔ انہوں نے اردو نثر کو ایک ایسا اسلوب دیا ہے جس کے باطن میں جذبات کا آتش کدہ روشن ہے لیکن سطح پر سکون اور ہموار ہے۔ ان کی ساری قوت اس استدلال میں ہے جو نقطہ نظر کو مضبوط اساس فراہم کرتا ہے۔ ''لیلیٰ کے خطوط''، ''مجنوں کی ڈائری'' اور ''تین پیسے کی چھوکری'' میں فکر کے زاویے جذباتی نثر میں لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔

07 عبدالرحمٰن بجنوری (متوفی ۱۹۱۸ء)

عبدالرحمٰن نے علی گڑھ سے بی۔اے کی ڈگری لی اور مزید تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے، قیام یورپ کے دوران انہیں انگریزی شعراء کا مطالعہ بالاستیعاب کرنے کا موقع ملا تو اس کے حاصل کو انہوں نے غالبؔ کے مطالعے میں صرف کیا۔ عبدالرحمٰن بجنوری ایک رومانی ادیب کی حیثیت میں اپنے اس وجدانی جملے کی وجہ سے مشہور ہیں کہ

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدس' دوسری دیوان غالبؔ''

''محاسنِ کلامِ غالبؔ'' بظاہر تنقید کی مختصر سی کتاب ہے لیکن اس میں بجنور کی رومانی نثر کے تمام اوصاف موجود ہیں۔ بجنور کی نثر الفاظ کی ساحری ہے اور اس نثر کے جادو سے انکار کرنا ممکن نہیں۔

08 فلک پیما (متوفی ۱۹۵۰ء)

فلک کا کلام طلوع رسالہ ہمایوں سے ہوا تھا۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے اور یہیں سرکاری ملازمت میں ساری عمر صرف کر دی، ان کے مضامین میں تحصیلِ مسرت ایک اہم جذبے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ فلک پیما انسان کی رگ و پے میں قوت اور مسرت کا خون دوڑانے کے خواہاں تھے۔ انہوں نے ''مضامین فلک پیما'' کے بے حد شگفتہ اسلوب میں بامعنی باتیں لکھی ہیں اور ڈرامائی تحرک پیدا کیا ہے اور اسی سے ان کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔

09 مجنوں گورکھپوری

مجنوں گورکھپوری تنقید نگار بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں: ''ان کا زمانے پر زور تو نہیں چل سکا۔ اس لیے ان کی قوت اپنے گریبان پر صرف ہوتی ہے۔ مجنوں کے کرداروں میں زندگی کی نوک پلک اور خدوخال نہیں پائے جاتے۔ وہ سیدھے اور سپاٹ ہیں۔ وہ عام انسانوں کی طرح چلتے پھرتے اور باتیں کرتے دکھائی نہیں دیتے بلکہ ان کی نظریں دور کی خلا میں کسی موہوم

چیز کو ڈھونڈ رہی ہیں اور ان کی باتیں یکساں حد تک تصوراتی اور جذباتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے گرد ایک رومانوی دھن چھائی ہوئی ہے جسے انہوں نے زندگی کا نعم البدل سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔''

مجنوں کے بیشتر افسانے حال سے ماضی کی طرف مرجعت کرتے ہیں۔ان کے کردار حقیقی زندگی سے متعلق ہیں لیکن ان کا ذہنی ربط روحوں کے ساتھ قائم ہے اور وہ اکثر اوقات ان روحوں کے تبسم سے انہیں زندگی کی سطح پر بھی لے آتے ہیں۔مجنوں افسانے کے خاتمے پر جب حال کی طرف لوٹتے ہیں تو ماضی کے تحیر سے حال کی حقیقت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔اس زاویے سے دیکھئے تو مجنوں کا رومانی یوٹوپیا ماضی میں دفن ہے اور وہ بار بار اس پراسرار کے دروازے کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

10 خلیقی دہلوی

خلیقی دہلوی کی تحریروں میں مشرقی و مغربی رومان نگاری کے رنگ بکھرے پڑے ہیں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کٹیس، شیلے اور ٹیگور سے از حد متاثر ہیں۔

حلیقی کی دنیا بے حد رنگین اور حقیقت کی تلخیوں سے ماورا ہے۔یہ دنیا اشاروں، رنگوں اور لطافتوں کی چادر میں لپٹی ہوئی ہے اور خلیقی نے ایک باکمال مصور کی طرح اس دنیا کی ایسی تصویریں کھینچی ہیں جن میں فطر کا حسن بسیط امتیازی مشاہتوں میں سمٹ گیا ہے۔

نتیجہ:

اردو نثر کے متذکرہ بالا جائزے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے لکھنے والے علمی نثر اور ادبی نثر میں حدِ امتیاز قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔سرسید نے ادبیات کے دائرے میں داخل کرنے کے بجائے نثر کی علمی اور کاروباری افادیت کو پیش نظر رکھا لیکن سر سید اور ان کے رفقاء کے بعد کے دور میں ادیبوں نے مطالعے، مشاہدے، تجربے اور تجزیاتی عمل کو شخصیت کی لطافت سے مس کرنے کا موقع بھی دیا اور اپنے داخل کی طلب پر رنگ آمیزی کی کوشش نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ نثر تخلیقی ذہن سے نکلا ہوا وہ پارہ ادب ہے جو بعض اوقات شاعری کے مدار میں بھی داخل ہو جاتا ہے۔اہم بات یہ ہے کہ اس نثر کا لکھنے ولا بے حد فعال اور تخلیقی ذہن کا مالک تھا اور اس نے نثر کو علم یا اطلاق فراہم کرنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے وہ پیرایۂ اظہار اختیار کیا جس سے غنچہ دل کھل جاتا ہے اور قاری نثر نگار کے جذبات واحساسات میں شرکت کے لیے آمادہ ہونے لگتا ہے۔

ترقی پسند ادبی تحریک

ترقی پسند ادبی تحریک کی نظریہ پسندی اور اُردُو ادب

ترقی پسند تحریک کے قیام کا ابتدائی اعلان احمد علی، محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہان کے مشورے سے ۱۹۳۳ء میں کیا گیا تھا۔ لیکن اس کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ اس تحریک کے آغاز سے پہلے برصغیر کے عوام اور ادبا مختلف سماجی اور سیاسی منطقوں میں رومانی شکستوں کا سامنا کر چکے تھے، مسلمانوں کے لیے علیحدہ صوبہ بنانے کے لیے بنگال کی تقسیم اور پھر اس فیصلے کی تنسیخ تحریک خلافت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد اور پھر دو مختلف قوموں کی متحدہ بقا کے تصور کی ناکامی، نہرو رپورٹ اور ہندو مسلم فسادات نے ذہنی اور سماجی انتشار کو ہوا دی تھی، اس زمانے کے روس میں اشتراکی حکومت کے قیام نے پوری دنیا کو متاثر کیا تھا۔ سیاسی نظریہ سازوں میں سے لینن اور مارکس اور ادیبوں میں سے طالسطائی اور گورکی نے نوجوانوں کے ذہن اور قلب پر بھرپور اثرات ڈالے تھے جن سے مذہبی اقدار کو ٹھیس لگی اور مادے کو برتر حیثیت دی جانے لگی۔ قدیم رسوم کو رجعت پسندانہ قرار دیا گیا۔ معاشرتی تغیر کو پیداواری رشتوں کے ساتھ متعلق کر دیا گیا اور اشتراکی فوقیت قائم کرنے کے لیے ایک ایسے نظام کا منصوبہ وضع کیا گیا جس کا مذہب انسانیت تھا۔ اس نظام میں مذہب کو باطل اور خالق کائنات پر ایمان غیر ضروری قرار دیا گیا۔

متذکرہ بالا تصورات برصغیر کے روحانی مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن پہلے تین عشروں کے واقعات نے ہندوستانی نوجوانوں کو بھی ان تصورات پر غور کرنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ اس کی ایک صورت اختر حسین رائے پوری کے مقالہ ''ادب اور زندگی'' سے سامنے آئی، ایک اور صورت افسانوں کی کتاب ''انگارے'' تھی جسے سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کے افسانہ نگار زندگی کی بے کیفی اور یک رنگی سے گھبرائے ہوئے اور جذباتی اور انقلابی تصورات سے بھرے ہوئے تھے۔ ''انگارے'' کے افسانوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کم اور غصہ و ہیجان زیادہ تھا۔ چنانچہ اس کے خلاف شدید ردِ عمل پیدا ہوا اور کتاب ضبط کر لی گئی۔ احمد علی کے افسانوں کی کتاب ''شعلے'' میں اگرچہ آگ کم تھی لیکن اس کا انداز بھی ''انگارے'' جیسا ترقی پسندانہ ہی تھا۔

ترقی پسند تحریک کو اوّلین فکری اساس اختر حسین رائے پوری کے مقالہ ''ادب اور زندگی'' (۱۹۳۴ء) نے فراہم کی جس میں گورکی اور طالسطائی کے خیالات کو اردو دان طبقے میں متارف کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں پیرس میں آندرے مارلو، رومین رولاں اور گورکی کی رہنمائی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس سے متاثر ہو کر سجاد ظہیر، ڈاکٹر تاثیر اور ملک راج آنند نے نانکنگ رستوران لندن میں ترقی پسند انجمن کا پہلا اعلان نامہ مرتب کیا۔ اس کی کچھ نقول ہندوستان میں بھی بھجوائی گئیں اور اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کانفرنس میں یہ انجمن قائم کر دی گئی۔ انجمن کا پہلا منشور لاہور میں مرتب ہوا اور اسے ڈاکٹر تاثیر، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور صوفی تبسم نے ابتدائی شکل دی تھی۔ منشی پریم چند کا خطبہ صدارت اس کانفرنس کی ایک اہم ادبی دستاویز تھی، جس میں کہا گیا کہ

''جس ادب سے ہمارا ذوقِ صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرکت پیدا نہ ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کا سچا استقلال پیدا نہ کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔''

لیکن جب انجمن کا منشور منظور کیا گیا تو اس میں پریم کے خطبے کی بازگشت موجود نہیں تھی اور ادب کو ایک آلہ کار کی حیثیت دے دی گئی۔ چنانچہ کہا گیا کہ

''ادب کو زندگی کے لیے مفید اور ترقی میں معاون، اور جبر و استحصال کے خلاف صف آرا ہونا چاہیے، ادب کو سچائی عقلی حقیقت اور انسانیت کا ترجمان اور اسلوب، ہئیت اور موضوع کے اعتبار سے تخلیقی جدت کا حامی ہونا چاہیے۔''

ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ

''یہ سب اصول اپنی جگہ اہم، قابلِ قبول اور معقول تھے۔''

حقیقی صورت یہ تھی کہ روزِ اوّل سے ہی تحریک کی جہت اشتراکیت کی طرف مڑ گئی تھی، چنانچہ ادب کو پروپیگنڈے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ سیاست ادب پر غالب آ گئی اور ادباء کے خلاف تادیبی کاروائیاں بھی عمل میں لائی جانے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند تحریک حکومت کے احتساب کا شکار بھی ہوئی اور اس کے خلاف مذہب پسند حلقوں نے بھی شدید ردِعمل ظاہر کیا۔

آزادی کے بعد جب ترقی پسند ادبا کو اشتراکی پیش قدمی کی آہٹ قریب سنائی دی تو اس تحریک کا سیاسی روپ کھل کر سامنے آ گیا۔ چنانچہ اس تنظیم کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور ترقی پسند ادبا بکھر گئے۔ ان میں سے چند ایک نے صحافت پیشہ اختیار کر لیا، کچھ ادبا سرکاری اداروں میں ملازم ہو گئے لیکن ان سب نے اپنی نظریاتی جہد کو قائم رکھا۔ چند ایک ترقی پسند ادبا تقلیب سے گذرے تو وہ مذہب کی حقانیت پر ایمان بھی لے آئے اور حمد و نعت لکھنے کے علاوہ اسلام کی تدریس بھی کرنے لگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر دور میں کچھ نئے ادبا ترقی پسند فکر کے پاسبان بھی بنتے رہے۔ ترقی پسند تحریک کے احیا کی کوشش دو ایک مرتبہ ہوئی۔ ۸۶۔۱۹۸۵ء میں اس کی گولڈن جوبلی لندن، کراچی اور لکھنؤ میں تزک و احتشام سے منعقد کی گئی لیکن اب اس تحریک کا جوہر نچڑ چکا تھا۔ چنانچہ اثر و عمل کا دائرہ بھی سمٹ گیا۔

ترقی پسند تحریک ایک موثر اور پرجوش سماجی تحریک تھی، اس تحریک نے معاشی ناانصافی کے دور میں انسانیت اور مساوات کو مذہب کا درجہ دیا اور ادب کو سائنسی تجزیاتی نقطۂ نظر سے آشنا کیا، اس تحریک نے استحصال کے خلاف سماجی انصاف کا احساس پیدا کیا۔ رجائیت اور امید کی شمع روشن کی۔ عام انسان، محنت کش اور کسان کو ادب کا موضوع بنایا۔ نئے موضوعات کے لیے نئی لفظیات وضع کیں لیکن اس تحریک کے سب اثرات مثبت نہیں تھے۔ اس تحریک نے مذہب کو نفی کر کے فرد سے روحانی طمانیت چھین لی تھی، چنانچہ فرد نہ صرف پیداواری قوتوں اور مادے کا غلام بن گیا بلکہ اشتراکی نظریئے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر بھی مجبور ہو گیا۔ ادب میں ہنگامی موضوعات اور ردِعمل کے جذباتی تاثر کو جگہ مل گئی۔ حقیقت نگاری کے نام پر عریانی اور فحاشی کو فروغ ملنے لگا۔ فرد کے اندر کی آواز اجتماع کے شور و غل میں گم ہو گئی اور فروغ نظریہ کے لیے ادب کے بجائے پمفلٹ لکھے جانے لگے۔ اس تحریک نے ادب سے اس کی فطری ملائمت چھین لی اور ردِعمل کو فروغ

ملاتو دشنام کی سرپرستی بھی کی جانے لگی جس سے ادب کی ثقاہت مجروح ہوئی، آخری بات یہ کہ ادب کے مقابلے میں شخصیت کو منور کرنے کا رجحان بھی اس تحریک ہی نے پیدا کیا۔ گذشتہ چند سالوں کے دوران ترقی پسند ادیب نے نہ صرف اپنے بلند آدرش کی نفی کی بلکہ ایک عام دنیا دار انسان کے مقابلے میں سماجی لوٹ، نفع اندوزی، حصولِ شہرت اور منفعت کے وسائل کے تعاقب میں زیادہ حصہ لیا اور یوں اپنی سابقہ محرومیں کا ازالہ کرلیا۔ باایں ہمہ بعض ترقی پسند ادبا نے اچھا ادب بھی پیدا کیا مگر ان لمحات میں جب وہ نظریاتی جکڑ بندیوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

ترقی پسند تحریک کے مقاصد

ترقی پسند کے مندرجہ ذیل مقاصد تھے۔

01 اردو ادب کو ادب برائے زندگی قرار دینا اور ادب سے تنقید حیات کا کام لینا۔

02 اردو ادب کی نوعیت کو بدل دینا۔

03 علوم اور فنون کے رشتوں کو مضبوط اور استوار کرنا۔

04 ادب کو زندگی کی حقیقتوں کا فعال ترجمان بنانا اور اس سے مستقبل کے لیے راہنمائی لینا۔

05 ادب کو سامراج، جاگیرداروں، سرمایہ داروں، قدیم روایات، رجعت پسندی، مذہب کی گرفت اور رسوم کہنہ سے آزاد کرانا اور استحصال کرنے والوں کی مذمت کرنا۔

06 ادب کے ذریعے معاشی انقلاب کی راہ ہموار کرنا۔

07 انسانیت کو مذہب قرار دینا۔

08 پسماندہ طبقوں کی حمایت کرنا۔

09 ادب کے در پردہ، مارکسزم، کمیونزم اور سوشلزم کی ترویج و اشاعت کرنا۔

10 جمہوریت اور آزادی کے لیے جدوجہد کرنا۔

ترقی پسند شعراء

01 فیض احمد فیضؔ (متوفی ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء)

فیض احمد فیضؔ بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے۔انہوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر عشق سے انقلاب کی طرف قدم بڑھایا اور جذبہ و نظریہ دونوں کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کی۔فیضؔ کی تربیت سیالکوٹ میں فارسی اور عربی کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ایم۔اے۔او کالج میں تدریس کے دوران وہ ڈاکٹر رشید جہان اور سجاد ظہیر سے متعارف ہوئے اور ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے۔پنڈی سازش کیس اور لینن امن انعام نے ان کی شہرت کو بانداز دیگر کروٹ دی۔۔زندگی کے آخری ادوار میں فیضؔ نے تیسری دنیا کے رسالہ ''لوٹس'' کی ادارت بھی کی۔فیضؔ کی تقریباً پندرہ شعری اور نثری تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ان میں نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دست تہہ سنگ، سرِ وادیِ سینہ، شامِ شہر یاراں، مرے دل مرے مسافر ان کی شاعری کی کتابیں ہیں۔فیضؔ کا کلیات ''نسخہ ہائے وفا'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

فیضؔ ترقی پسند تحریک کے سب سے مقبول اور ممتاز شاعر تھے۔انہوں نے اپنے اندر کی رومانی آواز کو زندہ رکھا۔چنانچہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ عاشقی فیضؔ کی عبادت ہے اور ترقی پسندی ان کا فرض ہے۔جب فرض غالب آجاتا ہے تو ان کے سامنے ایک دیوار کھڑی ہو جاتی ہے لیکن فیضؔ جب عشق کی عبادت کرتے ہیں تو اس میں دونوں جہان ہار کے بھی مطمئن نہیں ہوتے۔شام، تنہائی صبح آزادی، سرودِ شبانہ، چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز جیسی نظمیں متذکرہ عبادت ہی کی مظہر ہیں۔خلیل الرحمٰن اعظمی نے درست لکھا ہے کہ فیضؔ نے عوامی شاعر اور وضاحت وصراحت کے پیرائے کو ذہنی طور پر کبھی قبول نہیں کیا۔دوسری طرف جب فیضؔ ترقی پسند شاعری کی طرف آئے یا لائے گئے تو یہ بھی کہا گیا کہ ''نقش فریادی'' کے بعد فیضؔ کے ہاں جو ٹھہراؤ اور ایک رکی رکی سی کیفیت ملتی ہے نقطۂ نظر کے انجماد ہی کا نتیجہ ہے اور اس سے فیضؔ کے راستے میں دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں۔تاہم جب فیضؔ اپنے اندر کی آواز سنتے تو بے مثل نظم معرضِ تخلیق میں آجاتی جو اقبالؔ اور جوشؔ کی نظم سے نوعیت اور مزاج کے اعتبار سے علیحدہ تھی۔فیضؔ کی انفرادیت ان کی بے مثل امیجری میں ہے۔ انہوں نے انفرادی طرزِ احساس کو فروغ دیا، نئے استعارے اور تراکیب وضع کیں اس کی ایک مثال درج ذیل ہے۔

؎ جا بجا رقص میں آنے لگے چاند کے بھنور　　چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
؎ ڈوبتے تیرتے مرجھاتے رہے کھلتے رہے　　رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے (فیضؔ)

دوسری طرف بھی انہیں لمحے کے بندھن میں گرفتار ہو جانا پڑا تو ان کے ہاں احتجاج اور للکار بھی پیدا ہوئی۔اس کی ایک مثال حسبِ ذیل ہے۔

؎ لاؤ سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار　　طیش کی آتشِ جرار کہاں ہے لاؤ
؎ وہ مہکتا ہوا گلزار کہاں ہے لاؤ　　جس میں گرمی بھی ہے ،حرکت بھی توانائی بھی (فیضؔ)

فیضؔ نے حسی تلازمات کے نئے پیکر تراشے، تمثالوں کی نئی جلوہ گری کی اور لفظ کو نیرنگِ نظر بنا دیا۔ہر چند ان کے ہاں سوداؔ کی تمکنت اور غالبؔ کی خود آرائی موجود ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ مستعار روشنی کو بھی اپنی ذات کے لمس سے جدید تر بنا دیا ہے۔چنانچہ اختلاف واثبات کی

مختلف لہروں میں فیضؔ کے فن کی داد زیادہ دی گئی اور انہیں اقبالؒ کے بعد ایسے شاعروں میں شمار کیا گیا جنہوں نے اردو نظم اور غزل دونوں کو متاثر کیا۔ان کی غزل کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

؎ یہ موسمِ گل گرچہ طرب خیز بہت ہے　　احوالِ گل و لالہ غم انگیز بہت ہے
؎ ویراں ہے مے کدہ ، خم و ساغر اداس ہیں　　تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے (فیضؔ)

؎ یہ بازی عشق کی بازی ہے ، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنے ہارے بھی تو بازی مات نہیں (فیضؔ)

02 علی سردار جعفری

علی سردار جعفری نے اپنی جوانی سوشلسٹ تصورات میں بسر کی، ترقی پسند تحریک کی بنا ڈالی گئی تو اس میں انہیں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آئی اور تحریک کے عملی مبلغ کی صورت میں انہوں نے رسالہ ''نیا ادب'' میں معاون مدیر کی حیثیت سے شمولیت کی۔ان کی شاعری ترقی پسند منشور کی پابند اور اشتراکی مقاصد کے حصول کا وسیلہ ہے۔انہوں نے مزدوروں، کاشت کاروں اور محنت کشوں کے مسائل پر ولولہ انگیز نظمیں لکھیں اور آنے والی سحر کا خواب دیکھا۔

؎ ہماری آنکھوں سے آج شعلے برس رہے ہیں
مگر وہ کل کا حسین دن دیکھو کتنا نزدیک آرہا ہے
ہماری آنکھوں سے جب بہاریں چھلک پڑیں گی (علی سردار جعفری)

علی سردار جعفری لفظ کو اکہری صورت میں استعمال کرتے ہیں۔ملاحوں کی بغاوت، تلنگانہ، انقلاب روش، جشن بغاوت، سامراجی لڑائی میں تموجِ جذبات بے حد نمایاں ہے۔لیکن فن کی جمالیاتی صورت نظر نہیں آتی۔لیکن اب ان کے اس رویے میں تبدیلی آ گئی ہے اور انہوں نے جمالیات کو شاعری کی اصل تسلیم کر لیا ہے۔چنانچہ ان کے ہاں اس قسم کے مصرعے بھی اب جلوہ گر ہیں۔

؎ پتیوں کی پلکوں پہ اوس جگمگاتی ہے　　انگلیوں کے پیڑوں پہ دھوپ پر سکھاتی ہے
؎ چاند کے کٹورے سے چاندنی چھلتی ہے　　دل کے سبزہ زاروں میں، پھر بھی اک اندھیرا ہے (علی سردار)

03 مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین کی زندگی اور شاعری کی تربیت مارکسی تعلیمات کی روشنی میں ہوئی۔عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم۔اے کرنے کے بعد وہ سیاسی سرگرمیں میں حصہ لینے لگے۔ترقی پسند تحریک ان کے عمل کو جولاں گاہ تھی، ان کا مزاج رومانی اور مقاصد انقلابی تھے۔فیضؔ کی طرح مخدوم کے ہاں بھی نرم اور گرم آواز بیک وقت اٹھتی ہے۔ان کی شاعری میں للکار بھی ہے اور محبوب کے قدموں کی چاپ بھی، ملبوسِ عروسی بھی ہے اور مزدور کا کفن بھی، باغیانہ آواز کی مثال یہ ہے۔

؎ پھونک دو قصر کو ، گر کُن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے ، جو دنیا ہے یہی (محی الدین)

دوسری طرف ان کی نظم ''اندھیرا'' میں رجائیت صحت مندانہ انداز میں طلوع ہوتی ہے۔مخدوم ترقی پسند نظریے سے بے حد مخلص تھے اور وہ اس تحریک کے اہم شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔

04 ساحرلدھیانوی (متوفی ۱۹۸۰ء)

ساحرؔ کی شاعری میں ردِعمل کی لہران کی ابتدائی زندگی کی محرومیوں اور باپ کے جابرانہ رویے سے پیدا ہوئی، چنانچہ ان کی دردمندی میں بھی تلخی اور زہرناکی نمایاں ہے اور مسرت میں اداسی لپٹی ہوئی ہے۔

؎ ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوش گوار نہیں (ساحرؔ)

''تاج محل'' ، ''مادام'' ، ''چکلے'' ، ''ثناخوانِ تقدیس مشرق'' ساحرؔ کی چند ایسی نظمیں ہیں جنہیں مقبول عام حاصل ہے۔ان کی غزل میں نبرد آزمائی کا زاویہ نمایاں ہے۔

؎ اے غمِ دنیا تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی (ساحرؔ)

05 اسرارالحق مجازؔ (متوفی ۱۹۵۵ء)

مجازؔ کی شاعری میں رومان انقلاب کی طرف پیش قدمی کرتا ہے اور محبوبہ کو اپنے آدرش پر قربان کر دیتا ہے لیکن اس کا حاصل بھی محرومی ہے۔جس سے فرار حاصل کرنے کے لیے مجازؔ نے پہلے اپنے آپ کو شراب میں گم کر دیا اور پھر محرومیوں کے ازالے کے طور پر موت کی آغوش میں پناہ حاصل کر لی۔مجازؔ نے ترقی پسند نظریات کے زیر اثر ''انقلاب'' ، ''سرمایہ داری'' ، ''آوارہ'' اور ''مجھے جانا ہے اک روز'' جیسی نظمیں لکھیں تو ان میں تلخی در آئی۔ ''رات اور ریل'' ، ''انقلاب'' اور ''شوقِ گریزاں'' میں انہوں نے خارج کی طرف جست بھری ہے۔ ''آہنگ'' ، ''شبِ تاب'' اور ''سازِ نو'' ان کی شاعری کے نمائندہ مجموعے ہیں۔ایک شعر حسبِ ذیل ہے۔

؎ یہ اپنی وفا کا عالم ہے ، اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیک رگِ جاں بھول گئے (مجازؔ)

06 جاں نثار اخترؔ (متوفی ۱۹۷۶ء)

جاں نثار اخترؔ کے ہاں پہلے محبوبہ نے آدرش کی صورت اختیار کی، پھر وطن کو محبوبہ کے متبادل طور پر قبول کیا اور آخر میں انہوں نے ترقی پسند نظریے کی متابعت اختیار کر لی۔چنانچہ ان کا لہجہ جو پہلے لطیف اور رومانی تھا بعد میں ایک کھوکھلی للکار بن گیا۔''کون سا گیت سنو گی انجم'' ،

''مراجعت''، ''خاموش آواز'' اور ''امن نامہ'' نظموں میں ان کی آواز کے زیر و بم نمایاں طور پر متاثر کرتے ہیں لیکن جب وہ

؎ محبت کے نغمے ابلتے رہیں جواں ساز نغموں میں ڈھلتے رہیں
سدا زندگانی غزل خواں رہے زمانے میں غالبؔ کا دیواں رہے (اخترؔ)

جیسے اشعار لکھتے ہیں تو ان کا معیار متاثر ہو جاتا ہے۔

07 احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمیؒ نے وادیٔ سون ضلع خوشاب میں ایک اعوان قبیلے میں آنکھ کھولی، ان کی تربیت خان بہادر پیر حیدر شاہ نے کی، جو افسر مال تھے۔ ادبی زندگی کی ابتداء نظم نگاری سے کی۔ سرکاری نوکری چھوڑ کر لاہور آئے تو رسالہ ''پھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے۔ ادب لطیف، سویرا اور نقوش کے علاوہ کچھ عرصے کے لیے امروز کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیئے، لیکن ۱۹۵۸ء میں امروز سے علیحدہ ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے ترقی پسند رسالہ ''فنون'' جاری کیا اور مجلس ترقی اردو ادب میں کنٹریکٹ پر کام کرنے لگے۔ شاعری میں ''دھڑکنیں'' (رم جھم)، ''جلال و جمال''، ''شعلۂ گل''، ''دشتِ وفا''، ''دوام'' اور ''محیط'' ان کے ضخیم مجموعے چھپ چکے ہیں۔

ندیمؔ کے ہاں ترقی پسند رویہ اکتسابی ہے۔ ''دھڑکنیں'' کے قطعات میں ان کا مزاج رومانی ہے لیکن ترقی پسند تحریک نے انہیں بلند آہنگ ہونے پر مائل کیا۔ چنانچہ ان کے ہاں دو لہجے پیدا ہوئے۔ ایک لہجہ ان کی فطری رِقت کا غماز ہے اور دوسرا غیر معمولی جوش EUOPHORIA سے ہمکنار ہے۔ صدیق کلیم کے خیال میں:

''قاسمی اس کوشش میں رہتا ہے کہ ذہن کو ماورائیت سے مادیت کی طرف رجوع کرے۔''

لیکن یہ ان کی شاعری کی کمزوری نہیں بلکہ قوت ہے۔ معرضیت ندیمؔ کے فن کا قیمتی عنصر ہے اور یہ ان کی موضوعاتی نظموں میں زیادہ واضح ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ

''ندیمؔ نے خود کو ہر زمانے کی تازہ کروٹوں سے اخذ و اکتساب کی طرف مائل رکھا۔''

وہ رنگِ زمانہ کو اپنی شاعری میں شوق سے قبول کرتے ہیں اور زمانہ بھی انہیں قبول کرنے میں تاخیر نہیں کرتا۔ یہ شعری خاصیت ان کے علاوہ چند ایک شعراء کو نصیب ہوئی ہے۔ ندیمؔ کی نظم ایک بے حد خوب صورت دائرہ بناتی ہے، یہ دائرہ خیال کو پھیلنے کی اجازت نہیں دیتا اور قاری پر مستقیم ابلاغ کرتا ہے۔ چنانچہ اسے تحلیقِ مکرر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کی غزل کے کلاسیکی مزاج پر چھٹی دہائی کی غزل نے بہت سے اثرات ڈالے ہیں۔ چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

؎ تجھ سے چھٹ کر بھی تری سرخیِ عارض کی قسم چپکے چپکے ترے دل میں کئی بار آتا ہوں
؎ وقت کی اپنی طبیعت عشق کا اپنا مزاج زندگی پر چھا گیا ہے ایک پل گذرا ہوا
؎ زمیں پہ سانس بھی لینا پہاڑ کاٹنا ہے مجھے خدا کی قسم ہے کہ آدمی ہے علیم

؎ شام ہوتے ہی نکل آتا ہے آستیں سے یدِ بیضا میرا (احمد ندیم)

08 ظہیر کاشمیری

ظہیر کاشمیری ترقی پسند نظریے میں ایقان رکھنے والے شاعر ہیں۔ان کی پیدائش امرتسر میں ہوئی۔ جہاں اسی زمانے میں جلیا نوالہ باغ کا واقعہ پیش آیا تھا۔ چنانچہ ظہیر نے ظلمتِ شب کا سفر امیدِ سحر میں کاٹا اور ساحرِ افرنگ کو پنجہ احمر کی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ظہیر نے حقیقت کو ایک انقلابی کی نظر سے دیکھا اور اسے بلند آہنگی سے پیش کیا۔

؎ ہمیں ہے علم کہ ہم ہیں چراغ آخرِ شب ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

؎ ہمارا عشق ہمیں تمکنت سکھاتا ہے کشیدہ سر بھی ہیں ، پا بند زلفِ یار بھی ہیں

؎ بایں کمال کہ دامن سلگ سلگ اٹھا طوافِ شعلہ رخاں ، بار بار کرتے ہیں (ظہیر)

09 کیفی اعظمی

کیفی اعظمی نقطۂ نظر کو فن کی جمالیاتی اقدار پر فوقیت دینے والے شاعر ہیں۔انہوں نے فن کا دھندلا اجالا پیدا کرنے کے بجائے حقیقت کو سورج کا چراغ دکھانے کی سعی کی۔

10 منیب الرحمٰن

منیب الرحمٰن نے ترقی پسند شاعری کی گھن گرج کو منقلب کرنے کی کوشش کی ''سمندر'' اور ''بہار'' جیسی نظموں میں انہوں نے لطیف اخفا قائم رکھا اور رجائی زاویہ پیدا کیا۔

11 شور علیگ

شور علیگ نے پابند نظم میں مروجہ مزاجِ شعر کے مطابق غربت، بھوک اور سرمایہ داری کے خلاف موثر نظمیں لکھیں۔

12 سلام مچھلی شہری (متوفی ۱۹۷۳ء)

سلام مچھلی شہری نے حقیقت کی زہرناکی کو رومانی نظر سے دیکھا۔**''پوجا''** ، **''ایک پینٹنگ''** جیسی نظموں میں انہوں نے ترقی پسند سانچے سے انحراف بھی کیا ہے۔ان کی نظم کاغذ پر اتر کر شعلۂ مستعجل بن جاتی ہے۔

13 اختر الایمان

اختر الایمان ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے کے باوجود اس کے پختہ پیروکار نظر نہیں آتے۔ چنانچہ ان کے تجربات کا کردار باقی ترقی پسند شاعری سے مختلف ہے۔انہوں نے موضوعات کے داخل اور خارج کو ٹٹولنے اور اسے اندر کی کائنات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی اور نظم میں جذبے کے تسلسل کو فن کاری سے پیش کرنے کی طرح ڈالی۔اس کی ایک مثال مندرجہ ذیل اقتباس ہے۔

رات میں دیر تک اڑتے بادل کھلے چاند کی کشمکش
ٹکٹکی باندھ کر ایسے دیکھا کیا، جیسے یہ ماجرا
میری ہی داستان کا کوئی پارہ ہے
کون آوارہ ہے؟
تو کہ میں؟

اختر الایمان کی شاعری اُداس رومانی دھند میں لپٹی ہوئی ہے اور وہ داغ ہائے غم تاب کو منجمد کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ''خزاں''، ''زرد پتے''، ''خشک شجر بنجر زمین اور ڈھلتی شام'' وغیرہ استعاروں سے حیران کن تصویریں تخلیق کی ہیں۔ ایک لڑکا، پگ ڈنڈی، ڈرسنہ اسٹیشن، عہد وفا، تبدیلی اور بازآمد چند ایسی نظمیں ہیں جن میں اختر الایمان فن کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں، ان کا شعری اسلوب بے حد سیال اور نثر کا ہمسایہ ہے لیکن اس کی شعریت قائم رہتی ہے۔

14 معین احسن جذبی

معین احسن جذبی نے زیادہ تر سماجی نا آسودگی پر ملالِ فراواں کا اظہار کیا **''چنانچہ''** اور **''فروزاں''** کی بیشتر نظموں اور غزلوں میں جذبی نے ہزیمت، جنسی گھٹن اور اقتصادی بدحالی کو اہم موضوع کی حیثیت دی، انقلاب کی طرف ان کی پیش قدمی بالواسطہ ہے اور وہ گرز لہرانے کے بجائے دل کو سلگانے کی سعی کرتے ہیں۔ ''طواف'' اور ''موت'' جیسی نظموں میں یہ کیفیت نمایاں ہے۔

؎ جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے، اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے (معین احسن)

؎ جب جیب میں پیسے بجتے ہیں، جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت پہ ذرّہ ہیرا ہے، اس وقت پہ شبنم موتی ہے (معین احسن)

15 محمد صفدر میر

صفدر میر کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے جدید نظم کی اسلوبیاتی ساخت کو چابک دستی اور فن کاری سے استعمال کیا۔ انہوں نے پُر اسرار رمزیت اور نئے اظہار سے ایک نئی تازگی کا احساس دلایا۔ نظریاتی طور پر وہ سیاسی اور سماجی آزادیوں کے علم بردار اور ایک عالمی معاشرے کی تخلیق کے آرزومند ہیں، لیکن نظریاتی وابستگی کے باوجود انہوں نے شاعری کے کلیشے قبول کرنے سے احتراز کیا اور تمثال گری کی ایک نئی روش وضع کی انہوں نے فنی بعد کو قائم رکھا اور ہلکے سے شعری ایہام سے حُسن پیدا کیا، صفدر میر کا شعری مجموعہ **''درد کے پھول''** کی بیشتر نظموں میں شاعر کے اندر کی آواز نمایاں نظر آتی ہے۔ ''برف باری''، ''موت''، ''ایک لمحہ'' اور ''دھول ایسا رستوں میں بکھرا پھرتا ہوں'' میں آفاقی وسعت موجود ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ پر صفدر میر کی نظموں پر رجزیہ انداز غالب ہے لیکن یہ فنی اعتبار سے کمزور ہیں۔

علی جواد زیدی، پرویز شاہدی، سلیمان اریب اور احسن احمد اشک نے وضاحت وصراحت کے اسلوب کو ذہنی طور پر قبول کیا اور اپنی

شاعری میں برہنہ گفتاری کو جذباتی جلال کے ساتھ پیش کیا۔ان کی نظموں میں اجتماعی خیالات کی بازگشت زیادہ ہے۔

16 فارغ بخاری

فارغ بخاری نے ترقی پسند نظریے کے تحت ستاروں کے آگے دیکھنے کی سعی کی اور رجائیت کا ایک مخصوص انداز پیدا کیا۔

؎ کچھ نہیں گرچہ تری راہ گذر سے آگے دیکھنا کفر نہیں حدِ نظر سے آگے (فارغ بخاری)

17 ادا جعفری صاحبہ

ادا جعفری صاحبہ معروضی حقیقتوں کی شاعرہ ہیں۔انہوں نے ترقی پسند معاشرے کو مادرِ عظیم کی شفقت اور مادی رجحانات کو روحانی پرتو عطا کر دیا۔''میں ساز ڈھونڈتی رہی''، ''شہر درد'' اور ''سازِ سخن بہانہ ہے'' میں انہوں نے زندگی کو ایک مہربان ماں کی طرح دیکھا ہے۔

؎ چھٹ جائے جب غبار تو پھر مڑ کے دیکھنا ہوگی مری نوا بھی تمہاری صداؤں میں (ادا جعفری)

ترقی پسند افسانہ

ترقی پسند افسانے کا رشتہ زبدگی کی حقیقت نگاری سے وابستہ ہے اور اس کی ایک مثالی تخلیق پریم چند کا افسانہ ''کفن'' ہے۔ انگارے کے افسانوں میں مشرقی اقدار کے خلاف غم وغصہ کی آگ زیادہ تھی لیکن ان افسانوں کی فنی جہت کمزور تھی۔ ترقی پسند افسانے میں پلاٹ، کردار اور ماحول کہانی کے امتزجی تاثر کو بڑھانے میں دوسری اقسام کے افسانے ہی کی طرف معاونت کرتے ہیں لیکن ایک مخصوص نو کا تاثر پیدا کرنے کے لیے صورتِ واقعہ اور کردار اس طبقے سے منتخب کیے جاتے ہیں جن پر زندگی نہ مہربان ہے، چنانچہ امیروں کے مقابلے میں غریب، کارخانہ داروں کے مقابلے میں مزدور اور افسروں کے مقابلے میں کلرکوں کو اس افسانے میں زیادہ موضوع بنایا گیا اور ''قحط دمشق'' کا وہ منظر پیش کیا گیا جس میں عشق بھی فراموش کر دیا جاتا ہے۔ ترقی پسند افسانے کا مقصد معاشرتی اور معاشی تضاد کو مارکسی حقیقت نگاری کے زاویے سے اجاگر کرنا تھا۔ چنانچہ مقصد کو فن پر فوقیت دے دی گئی اور بہت سے ایسے افسانے لکھے جانے لگے جو فنی لحاظ سے کمزور تھے اور یکساں قسم کا تاثر پیدا کرتے تھے۔ جس پر پروپیگنڈے کا گمان بھی ہوتا تھا۔ حقیقت نگاری کے اس رجحان کو ملک میں خاطر خواہ پزیرائی ہوئی اور ترقی پسند تحریک سے نہ صرف چند بڑے افسانہ نگار ابھرے بلکہ حقیقت نگاری کے رجحان کو مستقبل کے افسانہ نگاروں نے بھی قبول کیا۔

''انگارے'' کے افسانہ نگار

01 احمد علی

احمد علی کی افسانے میں اولیں نمود ''انگارے'' میں شامل دو افسانوں **''بادل نہیں آتے''** اور **''مہاوٹوں کی ایک رات''** سے ہوئی تھی۔ ان افسانوں کا انداز استہزائیہ اور بیانیہ بے ربط تھا لیکن ان کے بطون میں اقدار سے شعوری بغاوت کی تحریک موجود تھی۔ احمد علی کے دوسرے مجموعہ ''شعلے'' کے افسانوں میں پریم چند کی روایت نمایاں نظر آتی ہے۔ ''ہماری گلی''، ''استاد شمو'' اور تصویر کے دو رخ'' میں واقعہ نگاری کے گہرے مشاہد کی غماز ہے۔ ترقی پسند حقیقت نگاری کے بعد احمد علی کے ہاں رمزیہ اسلوب بھی پیدا ہوا۔ ''قید خانہ''، ''میرا کمرہ'' اور ''گذرے دنوں کی یاد'' میں انہوں نے اپنی تکنیک یکسر بدل ڈالی تھی۔ احمد علی نے کم لکھا لیکن وہ اردو افسانے میں ایک تاریخی شخصیت شمار ہوتے ہیں۔

02 رشید جہاں صاحبہ (متوفی ۱۹۵۲ء)

رشید جہان ''انگارے'' کے افسانوں میں عورت کے حقوق کی نگہبان بن کر ابھریں، اس کتاب میں ان کا افسانہ ''دلی کی سیر'' شامل تھا۔ ان کی کتاب ''عورت'' میں اساسی طور پر ہندوستانی عورت کی سماجی حیثیت، معاشرتی ناانصافی اور مذہبی نا آگہی کو اہم موضوعات کی حیثیت دی گئی ہے۔ لیکن فنی پہلو بے حد کمزور ہے۔

03 محمود الظفر

محمود الظفر کا افسانہ **''جواں مردی''** 'انگارے' میں رسمی شرکت کے مترادف ہے۔اس کا موضوع مرد کا جھوٹا پندار ہے اور یہ اقتصادی محرومیوں اور نارسائیوں کو منظر پر لاتا ہے۔لیکن فن پر محمود الظفر کی گرفت بھی مضبوط نہیں اور اب انہیں اس کتاب کی تاریخی حیثیت سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔

04 سجاد ظہیر

سجاد ظہیر ''انگارے'' گروپ کے فعال اور باشعور رکن تھے لیکن افسانہ نگاری ان کی زندگی میں بھی نمایاں حیثیت نہیں رکھتی۔ ''انگارے'' میں ان کے پانچ افسانے شامل ہیں لیکن ان سب کی نوعیت تجرباتی ہے۔وہ آزاد تلازمۂ خیال کی رو میں بہتے چلے جاتے ہیں اور مقصد سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے لیکن مجموعی طور پر سجاد ظہیر فنی لحاظ سے ایک مکمل افسانہ تخلیق نہیں کر سکے۔

''انگارے'' کے افسانوں نے جو سماجی سرگرمی پیدا کی تھی اس نے علی سردار جعفری اور سید احتشام حسین کو بھی افسانہ نگاری پر مائل کیا لیکن اس صنف میں وہ کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔علی سردار جعفری ''منزل'' کی اشاعت کے بعد شاعری کی طرف اور احتشام حسین ''ویرانے'' کی اشاعت کے بعد تنقید کی طرف راغب ہو گئے۔

ترقی پسند افسانے کا دورِ زریں

05 کرشن چندر (متوفی ۱۹۷۷ء)

کرشن چندر ترقی پسند افسانے کے دورِ زریں کا روشن ستارے اور اس تحریک کے وفا شعار نمائندے تھے۔وہ طبعاً رومانی تھے لیکن ان کی معروضیت گہرے سماجی شعور کی عکاس ہے۔انہوں نے سماج اور انسانی مسائل کو اہم موضوعات کے طور پر قبول کیا اور ترقی پسند نظریے کی فوقیت ثابت کرنے کا کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہ کیا۔کرشن چندر وزیر آباد (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔لاہور سے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور عملی زندگی ریڈیو، فلم اور ادب کو ذریعہ روزگار بنا کر گذاری۔وہ کل وقتی ادیب اور اہم ترقی پسند تھے۔ان کے افسانوں کے ابتدائی مجموعوں ''طلسمِ خیال''، ''نظارے'' اور ''ٹوٹے ہوئے تارے'' میں زندگی کی جراحتوں کو خوشبودار قلم سے لکھنے کی کاوش کی گئی ہے۔وہ ترقی پسند تحریک کے بے حد زرخیز دماغ افسانہ نگار تھے۔انہوں نے پلاٹ، کردار اور فضا کے امتزاج باہمی سے حقیقت کی عمدہ تصویر کشی کی اور ''آدھے گھنٹے کا خدا''، ''مہالکشمی کا پل''، ''کالو بھنگی'' اور ''کچرا بابا'' جیسے افسانے لکھے جن میں عصری صداقت منکشف ہوتی ہے۔''تین غنڈے''، ''امن کی پانچ انگلیاں'' اور ''پشاور ایکسپریس'' افسانوں میں وہ نظریاتی جواز کی تلاش میں سرگرداں رہے اور غیر جانب دار نظر نہیں آتے۔

کرشن چندر کا شبنمی اسلوب ان کی خوبی بھی ہے اور کمزوری بھی۔بے رحم حقیقت نگاری میں یہ اسلوب ان کی معاونت نہیں کر پاتا۔انہوں نے بڑی افراط سے لکھا اور ''نغمے کی موت''، ''زندگی کے موڑ پر''، ''ہم وحشی ہیں''، ''ان داتا''،

''گھونگھٹ میں گوری جلے'' اور ''تین غنڈے'' کے علاوہ افسانوں کی کم وبیش دو درجن کتابیں پیش کیں۔کرشن چندر کو اپنی زندگی میں کڑی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔**ڈاکٹر محمد حسن** نے لکھا ہے کہ:

''ان کے افسانوں میں سچے کرداروں کا وجود ہی نہیں''

ممتاز حسین کی رائے میں:

''کرشن چندر اپنے کردار کی منفرد شخصیت نہیں بنانا چاہتے''

علی سردار جعفری نے رائے دی کہ:

''انہوں نے حقیقت کی چھان بین میں تھوڑی بہت غفلت برتی ہے۔''

لیکن **ڈاکٹر انور سدید** کے مطابق ان آراء میں صرف جزوی صداقت موجود ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

''حقیقت یہ ہے کہ کرشن چندر ایک کثیر الابعاد افسانہ نگار تھا۔''

''پورے چاند کی رات''، ''گرجن کی ایک شام'' ''بالکونی''، ''غالیچہ''، ''دسواں پل''، ''تائی ایسری''، ''دو فرلانگ لمبی سڑک''، ''دانی''، ''ایک سریلی تصویر'' اور ''بندوالی'' جیسے افسانوں کا خالق اردو ادب میں ایک اہم مقام کا مالک ہے اور وہ ترقی پسند نظریے کے لیے اپنے فن کی قربانی پیش کرنے کے باوجود اپنی کثرتِ تخلیق میں گم نہیں ہوا۔

06 راجندر سنگھ بیدی (۱۹۸۴ء)

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں سماجی حقیقت اور انسان کی داخلی واردات کیمیائی امتزاج کی صورت میں سامنے آتی ہے۔بیدیؔ لاہور میں پیدا ہوئے لیکن زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے،عملی زندگی کی ابتداء ڈاک خانے کی معمولی ملازمت سے کی پھر ریڈیو اور فلم کے ساتھ وابستہ ہو گئے جہاں زندگی پہلے ان پر مہربان ہوئی اور پھر ناراض ہو گئی۔

بیدیؔ نے انسانی دکھوں کی نقاب کشائی اس طرح کی کہ ان کا دکھ ہر انسان کو اپنی واردات نظر آنے لگا۔وہ چھوٹی سی حقیقت سے زندگی کی گہری معنویت بیدار کرنے والے افسانہ نگار تھے۔بھولا،بلی،گرم کوٹ،اپنے دکھ مجھے دے دو،لاجونتی،صرف ایک سگریٹ جیسے افسانوں میں بیدیؔ نے زندگی کو معصوم ناظر کی حیثیت میں دیکھا اور حقیقت کو معنی آفریں بنا دیا۔ترقی پسند مقصدیت ان کے افسانوں پر غالب نہیں آتی اور یہ خوبی انہیں کرشن چندر سے بڑا افسانہ نگار بنا دیتی ہے۔ان کے افسانوں میں جنس کو ایک متحرک قوت کی حیثیت حاصل ہے لیکن یہ ننگی بھوک نہیں بنتی اور داخلی ارتعاش سے معاشرتی امن کو تباہ نہیں کرتی۔بیدیؔ کی غیر ہموار زبان کو موردِ اعتراض بنایا گیا لیکن اس کا اپنا ایک ذائقہ ہے اور یہ افسانے کی داخلی ضرورت کا پورا ساتھ دیتی ہے لیکن اس میں آرائش کے عناصر موجود نہیں۔ دانہ و دام،گرہن، کوکھ جلی،لاجونتی،اپنے دکھ مجھے دے دو،لمبی لڑکی،ہاتھ ہمارے قلم ہوئے اور مکتی بودھ کے افسانے اردو ادب کا قد بلند کرنے والے ادیب کی تخلیقات ہیں۔راجندر سنگھ بیدیؔ کو اردو افسانے میں اہم مقام اور مرتبہ حاصل ہے۔

07 عصمت چغتائی صاحبہ

عصمت چغتائی کی شہرت میں عظمت کم اور حیرت زیادہ ہے۔انہوں نے اردو افسانے میں رشید جہاں کی نسوانی بغاوت کو وسعت دی اور جنس نگاری کے پردے میں معاشرتی حقیقت نگاری کا فریضہ سرانجام دیا۔عزیز احمد نے انہیں رجعت پسندانہ اور مریضانہ رجحان کی افسانہ نگار شمار کیا ہے۔**کلیاں** ، **چوٹیں** اور **چھوئی موئی** کے افسانوں میں وہ سماجی حقیقت نگار کے طور پر ابھریں اور اس دور کے تہذیبی رویے سے برملا انحراف کیا۔ان کے افسانے **گیندا**، **فسادی** ، **لحاف** ، **پردے کے پیچھے** ، **بہو بیٹیاں** ، **بے کار** ، **چوتھی کا جوڑا** اور **دو ہاتھ** اس انحراف کی چند مثالیں ہیں۔

عصمت چغتائی بنیادی طور پر عورت کے معاشرے کی مشاہدہ بین اور اس کی حقیقت نگار ہیں۔انہوں نے عورت کے داخلی جذبوں اور سماجی کردار کو اجاگر کیا۔ان کا افسانہ ذہنی اور عملی زندگی کے تضاد سے پیدا ہوتا ہے اور محبت و نفرت کو واضح طور پر سطح پر لے آتا ہے۔عصمت کی سب سے بڑی خوبی بیانیہ پر قدرت اور مکالمے کا فطری انداز ہے۔ان دونوں کے بغیر عصمت کا افسانہ شاید اپنی قدر و قیمت قائم نہ رکھ سکتا، ان کے فنکارانہ استعمال سے عصمت کا افسانہ زندگی کی رواں دواں تصویر بن جاتا ہے۔

08 حیات اللہ انصاری

حیات اللہ انصاری نے طبقاتی تضاد کو حقیقی زندگی سے آشکار کیا۔ان کے افسانوں میں درد اور کرب زیر سطح لہر کی طرح رواں دواں نظر آتا ہے۔ **سہارے کی تلاش** ، **انوکھی مصیبت** ، **موزوں کا کارخانہ** اور **ڈھائی سیر آٹا** میں انصاری ایک بے رحم حقیقت نگار نظر آتے ہیں۔ **ماں بیٹا** اور **شکر گذار آنکھیں** میں انہوں نے تعصّبات کی فساد انگیز صورت سے افسانے تراشے۔ان کا افسانہ ''**آخری درشن**'' دیہات اور شہر کے تصادم سے جنم لیتا ہے اور ایک چھوٹے ناول کا درجہ رکھتا ہے۔

ڈاکٹر محمد انور سدیدؒ کے بقول:

''**انصاری کی سب سے بڑی خوبی گہرا مشاہدہ اور جزئیات نگاری ہے۔**''

09 خواجہ احمد عباس (متوفی ۱۹۸۱ء)

خواجہ احمد عباس کو ترقی پسند تحریک کا ایسا رپورٹر شمار کیا گیا جس پر افسانہ نگاری کا گمان ہوتا ہے اور جو ہر اخباری بات کو افسانے کا روپ دے سکتا ہے۔ان کے افسانے ''**شکر اللہ کا**'' ، ''**ایک لڑکی**'' ، ''**اتار چڑھاؤ**'' ، ''**چوراہا**'' ، ''**سردار جی**'' اور ''**انتقام**'' میں ردِعمل کی تیزابیت موجود ہے۔خواجہ صاحب نے مروجہ اخلاقی نظام اور اقدار پر ضرب لگانے کی کوشش کی اور شہر کے کھوکھلے پن کو تضادات سے اجاگر کیا۔

10 اوپندر ناتھ اشکؔ

اوپندر ناتھ اشک نے نچلے متوسط طبقے سے محرمیوں اور نارسائیوں کی اندوہ ناک حقیقتیں تلاش کیں اور انہیں افسانے کا روپ دے دیا۔ ''**کونپل**''، ''**قفس**''، ''**چٹان**''، ''**ڈاچی**'' اور ''**پلنگ**'' جیسے مجموعوں میں انہوں نے پریم چند کے انداز میں زندگی کی سچائیوں کو واقعاتی شہادت فراہم کی، ان کی خامی یہ ہے کہ وہ ناظر کی دلچسپی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور کلائمکس پر جب چونکاتے ہیں تو افسانہ بعض اوقات مصنوعی سا ہو جاتا ہے۔ افسانے کے مقصدی کردار سے اشکؔ نے کبھی اغماز نہیں برتا۔ لیکن **ٹیبل لینڈ**، **کھلونے** **قفس** جیسے افسانوں میں وہ ترقی پسند تحریک کی نظریاتی مقصدیت سے بلند نظر آتے ہیں۔

11 اختر انصاری

اختر انصاری کی افسانہ نگاری رومانویت کی صبح صادق میں پروان چڑھی تھی۔ ''**اندھی دنیا**'' کے افسانوں میں وہ خوابوں میں گم نظر آتے ہیں۔ ''**نازو**''، ''**خونی**''، ''**لوایک قصہ سنو**'' جیسے افسانوی مجموعوں میں انہوں نے حقیقت نگاری کا رویہ اختیا کرلیا۔ ان کی کتاب ''**یہ زندگی**'' میں خارجی زندگی اپنی تمام تر جراحتوں کے ساتھ جلوہ آرا ہے اور جذبہ پیوستہ بہ ارض ہے۔ لیکن ان کے ہاں کہیں کہیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ پلاٹ اور کردار میں فنی امتزاج پیدا نہیں ہوسکا۔

12 دیویندر ستیارتھی

دیوندر ستیارتھی کے افسانے ان کی جہاں گردی کا قیمتی ثمر ہیں۔ انہوں نے محبت، انسانیت اور شرافت کی قدروں سے مسرتِ جاوداں حاصل کرنے اور دیہات کے دھندلکوں سے گیت اور لوک دانش تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ''**میں ہوں خانہ بدوش**''، ''**نئے دیوتا**'' ''**اور بانسری بجتی رہی**''، ''**دیا جلے ساری رات**''، ''**لالی دھرتی**'' اور ''**دھان سے پہلے**'' وغیرہ مجموعوں میں زندگی کا پرتو نئے انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے اور خلقِ خدا میں اعتماد بحال کر دیتا ہے۔

13 سہیل عظیم آبادی (متوفی ۱۹۷۹ء)

سہیل عظیم آبادی پریم چند کے فن اور ترقی پسند تحریک دونوں سے متاثر تھے، انہوں نے صوبہ بہار کی دیہی زندگی کو اردو افسانے میں دو دِ جذبے اور آگہی سے پیش کیا۔ ''**الاؤ**''، ''**نئے اور پرانے**'' اور ''**تین تصویریں**'' کے افسانوں میں زندگی کے غیر جانب دار لیکن ہمدرد مبصر نظر آتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''**چچا جان**'' اخلاقی اعتبار سے ایک زوال آمادہ کردار کا کلاسیکی روپ ہے۔

14 اختر اورینوی

اختر اورینوی کے افسانوں میں انسان فطرت کی چیرہ دستیوں سے نبرد آزما نظر آتا ہے۔ چنانچہ موسمی حالات، قحط، کمی آب، بہت زیادہ بارش، سیلاب اور متعدی بیماریوں سے پیدا ہونے والی صورتِ حال سے اختر اورینوی نے بہار کے دیہات کے حقیقی افسانے تراشے ہیں۔ ان کا افسانہ ''**کلیاں اور کانٹے**'' انسان کی بے بضاعتی اور دپ دق جیسے مرض کی پیش قدمی کا المناک مرقع ہے۔

منظر و پس منظر ، **سیمنٹ اور ڈائنامیٹ**، **انارکلی** اور **بھول بھلیاں** میں خارج کی زندگی انسان کے ساتھ نبرد آزما ہے اور المیوں کو جنم دے رہی ہے۔اختر نے مکالموں میں مقامی زبان سے استفادہ کر کے افسانے کے تاثر میں قیمتی اضافہ کر دیا ہے۔

15 ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے فن نے رومانویت کی گود میں آنکھ کھولی تھی ،ان کے **''محبت''** کے افسانوں پر ٹیگور کے اثرات نمایاں ہیں۔لیکن **''نفرت''** کے افسانے زیادہ تر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے گئے۔**''زندگی کا میلہ''** کے افسانوں میں بیزاری تلخی اور زہرناکی نمایاں ہے۔لیکن **''دل کا اندھیرا''** ، **''جسم کی پکار''** ، **''دیوان خانہ''** اور **''کافرستان کی شہزادی''** جیسے افسانوں میں انہوں نے زوال آمادہ کرداروں کو سنجیدگی اور حقیقت بیانی سے روشناس کرایا ہے۔ان کے افسانے زندگی کے معرکۂ خیر و شر کی آویزش کو خوبی سے آشکار کرتے ہیں۔

16 احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری نے بے کار نوجوانوں کے رومانی خوابوں سے جنم لیا تھا۔انہوں نے فنی زندگی کا بیشتر سفر ترقی پسند تحریک کے سائے میں طے کیا۔ڈاکٹر صادق نے لکھا ہے کہ

''چوپال اور بگولے کے تقریباً سب افسانے مقصد سے لبریز ہیں ،اکثر
اوقات یوں بھی ہے کہ مقصد کے پیروں تلے افسانے کا فن روندا گیا ہے۔''

ان کے دوسرے دور کے افسانوں میں اس بے کار نوجوان کو روزگار میسر آجاتا ہے لیکن وہ تمانیت سے محروم رہتا ہے۔آزادی کے بعد قاسمی صاحب نے شہر اور دیہات کی آویزش پر افسانے لکھے۔ان کے کرداروں پر زندگی مہربان نظر آتی ہے اور یہ کردار مواقع سے فائدہ اٹھانے ، چڑھتے سورج کی پوجا کرنے اور نامساعد حالات سے سمجھوتہ کرنے کے فن سے بھی آشنا ہیں۔**رئیس خانہ**، **بندگی** ، **بے چارگی** ، **مولوی اُبل** ، **الحمد للہ** اور **کنجری** جیسے افسانوں میں انہوں نے اس قسم کے کرداروں کو جذباتی شیفتگی سے پیش کیا ہے اور بقول منٹو SENTIMENTان کی بیخ تک پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی بے حد زود نویس افسانہ نگار ہیں، **چوپال**، **بگولے**، **آبلے**، **سیلاب**، **طلوع و غروب**، **سناٹا**، **گھر سے گھر تک**، **نیلا پتھر**، **بازار حیات**، **درو دیوار** اور **برگِ حنا** ان کے چند مجموعوں کے عنوانات ہیں۔قاسمی صاحب کی دیہات نگاری قابلِ ذکر ہے۔ان کے افسانوں کے دیہات کا کردار منفعل ہے اور یہ شہر کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے بھی دیکھتا ہے۔ان کے ہاں کرشن چندر کے کشمیر کے افسانوں کا تاثر قبول کرنے کا رجحان بھی موجود ہے ان کی کمزوری یہ ہے کہ ان پر شعریت غالب آجاتی ہے اور وہ بقول منٹو

''بقدرِ کفایت ضبط کو کام میں نہیں لاتے اور ایک چھوٹے
سے افسانے میں سینکڑوں چیزیں کہہ ڈالتے ہیں۔''

چنانچہ منٹو کو وہ اس بچے کی مانند نظر آئے جو سینما ہال میں فلم دیکھتے دیکھتے بیچ میں کئی بار بول اٹھتا ہے۔

17 بلونت سنگھ (۱۹۸۶ء)

بلونت سنگھ پنجاب کے دیہات کے حقیقت نگار تھے۔انہوں نے سکھ قوم کے فعال کرداروں کے عمل اور ردِعمل کے معنی خیز افسانے تخلیق کیے۔ **جگا** ، **پنجاب کا البیلا** ، **پہلا پتھر** اور **تین چور** وغیرہ افسانوں میں انہوں نے دلیری، دردمندی اور زندہ دلی کی تصویریں پیش کیں، بلونت سنگھ نے ایک دیہاتی کی نظر سے شہر کو بھی بنظر غائر دیکھا اور **دیمک** ، **سمجھوتہ** ، **بابو مانک لعل** اور **بازگشت** جیسے افسانوں میں معاشرتی مسائل پر اپنا ردِعمل پیش کیا۔ **''جگا''** ، **''تار و پود''** ، **''سنہرا دیس''** اور **''پہلا پتھر''** جیسے مجموعوں میں بلونت سنگھ نے حقیقت نگاری کا جادو سادہ، بے رنگ اور نسبتاً غیر آرائشی زبان میں جگایا لیکن ان سب سے گہرا اثر پیدا کیا۔

18 مہندر ناتھ (متوفی ۱۹۷۴ء)

مہندر ناتھ کے افسانوں میں شہری زندگی کا جزرومد بڑی خوبی سے منعکس ہوا ہے۔انہوں نے افسانے میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ان کی پرجوش وکالت نے تبلیغی صورت اختیار کرلی اور افسانہ رپوتاژ بن گیا۔

ترقی پسند تنقید

ترقی پسند تنقید میں زندگی کے خارجی محرکات جن میں پیداواری ذرائع کو اہمیت حاصل ہے ادب کی ناگزیر بنیادیں ہیں۔ادب اس حقیقت کا عکس ہے جو زندگی کے عمل اور ردِعمل سے صورت پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ ترقی پسند تنقید میں تاریخ کے جدلیاتی نظریے کا اطلاق ادب پر کیا جاتا ہے اور معاشرتی جزرومد کو انقلاب کی حرکی ضرورتوں کا معاون بنانے کی سعی کی جاتی ہے۔اس قسم کی تنقید کے پسِ پردہ ادب کا یہ نظریہ کارفرما ہے کہ **''ادب جماعتی شعور کی تخلیقی ہیئت کا نام ہے''**۔اردو ادب میں اس نظریے کی حامل تنقید نے ترقی پسند تحریک کے زمانے میں فروغ حاصل کیا اور اسے ادب کی تنقید و تعبیر کا ایک اہم وسیلہ شمار کیا گیا۔بعض نقادوں نے تو خود کو مارکسی نظریات کے عملی استعمال کے لیے وقف کردیا اور اس قسم کی تنقید کے علم برداروں میں شمار کیے گئے۔

01 اختر حسین رائے پوری

اختر حسین رائے پوری ترقی پسند تحریک میں اوّلیں اہم نام ہے۔انہوں نے اس تحریک کے باقاعدہ آغاز سے پہلے مقالہ **''ادب اور انقلاب''** لکھا اور زندگی کی حقیقی صورتیں پیش کرنے پر زور دیا۔**''روسی ادب''** ، **''ادبی ترقی پسندی کا مفہوم''** اور **''اردو ادب کے جدید رجحانات''** جیسے مضامین میں ان کی روشنی کا ماخذ مارکسی نظریات ہیں لیکن کتاب **''روشن مینار''** میں ٹیگور اور کالی داس کی عملی تنقید میں بے حد تنگ مزاجی نظر آتی ہے۔انہوں نے جمالیاتی پیمانوں کو استعمال کرنے کی سعی بھی کی ہے۔

02 سید احتشام حسین

سنجیدہ فکر ادیب اور مارکسی نظریے کے راسخ الاعتقاد نقاد تھے۔ان کا تنقیدی اثاثہ **''ادب اور سماج''** ، **''تنقیدی جائزے''**

، ''روایت وبغاوت'' اور ''تنقید وعملی تنقید'' ، ''ادبی ذوق'' اور ''شعور'' جیسے متعدد مجموعہ ہائے مضامین کی صورت میں موجود ہے لیکن انہوں نے کسی اہم مضمون پر مربوط ومبسوط کتاب نہیں لکھی، انہوں نے مارکسی نظریے کی فوقیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور ادب کو افادی اور اجتماعی زاویوں سے پرکھا۔ اس عمل میں انہوں نے توازن واعتدال سے کام لیا۔ چنانچہ ان کی تحریروں سے علم کی روشنی چھن چھن کر آتی ہے لیکن انتہا پسندی اور بے ضرورت جوش نظر نہیں آتا۔ نظری اور عملی دونوں زاویوں سے وہ ترقی پسند نقطۂ نظر کے اہم نقاد تھے اور انہوں نے اشتراکی نظریات کو بہت کھلے ہوئے انداز میں پیش کیا۔

03 مجنوں گورکھ پوری

مجنوں گورکھ پوری ابتداء میں رومانی نقاد کی صورت میں سامنے آئے لیکن بعد میں انہوں نے مادی نظریات کی اہمیت تسلیم کر لی اور ترقی پسند نقطۂ نظر کے نقاد شمار ہوئے۔ ان کا مقالہ ''**ادب کی جمالیاتی ماہیت**'' مارکسی فلسفے کی بنیادی سائنس کو تجزیاتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ مجنوں ادبی مسائل کو مستقیم انداز میں حل نہیں کرتے بلکہ قولِ محال پیدا کر کے قاری کو الجھا دیتے ہیں ۔ یہ حربہ انہوں نے ''**تفہیم وتعبیرِ اقبالؔ**'' میں زیادہ استعمال کیا۔ ''**ادب اور زندگی**'' اور ''**تنقیدی حاشیے**'' ان کے مضامین کے مجموعے ہیں، انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے صہباؔ لکھنوی اور شبنم رومانی نے دو جلدوں میں ''**ارمغان مجنوں**'' پیش کی۔

04 احمد علی

ابتداء میں ترقی پسند نظریے کے مؤثر وکیل کی صورت میں ابھرے تھے۔ ان کی تنقید میں مارکسی نقطۂ نظر کی وضاحت بھی تھی اور فکری روشنی بھی لیکن جب انہوں نے گرفت اور احتساب کی روش اختیار کی تو اس تحریک کے ادبا نے ہی ان کی مخالفت کی، احمد علی کے مضامین میں عظیم تر ادب کی ضرورت کا احساس نمایاں ہے اور وہ ترقی پسندی کے محدود معانی اور اشتراکی حد بندیوں کو قبول نہیں کرتے۔ اس بنا پر ان سے اختلاف بھی کیا گیا لیکن انہوں نے اپنا مسلک تبدیل نہیں کیا۔

05 سجاد ظہیر

سجاد ظہیر کی تنقید ترقی پسند تحریک کی مدلل وکالت کا درجہ رکھتی ہے۔ انہوں نے مادی ذرائع کو اہمیت دی اور آلاتِ ہنر سے زندگی کا دھارا موڑنے کی تبلیغ کی۔ ان کی کتاب ''**روشنائی**'' ترقی پسند تحریک کی تاریخ ہے۔ لیکن اس سے ان کا تنقیدی رویہ بھی آشکار ہوتا ہے۔ وہ بنیاد پسندی کے مخالف تھے۔ لیکن ان کی تنقید میں کلبیت کا عنصر بھی موجود ہے۔

06 ڈاکٹر عبدالعلیم

ڈاکٹر عبدالعلیم کی ترقی پسندی میں حسن کو خیر وصداقت کے سرچشمے کی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے ادب کو انسانی روح اور کائنات کے سنگم پر معرضِ وجود میں آنے والا تخلیقی تجربہ شمار کیا اور مارکس کی یک طرفگی میں جمالیاتی عنصر شامل کرنے کی سعی کی۔

07 علی سردار جعفری

علی سردار جعفری کی مثال اس سپاہی کی ہے جو تعمیلِ ارشاد، بلا چوں و چراں کرتا ہے اور اگلے مورچوں پر لڑتا ہے۔ ان کی کتاب ''**ترقی پسند ادب**'' اس انتہا پسندی کی ایک مظہر ہے، اس پر مناظرے کا رنگ غالب ہے اور وہ فریقِ مخالف کو تہہ تیغ کرنے کا کوئی موقعہ فرد گذاشت نہیں کرتے، اور اکثر اپنے ہتھیاروں سے خود ہی زخمی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ابتداء میں انہدامِ اقبال میں سرگرمی دکھائی لیکن ''**اقبالؒ شناسی**'' میں اقبالؒ کے مدح خواں بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے تنقید میں ذاتی نقطۂ نظر پیش کرنے کے بجائے تحریکی نقطۂ نظر نمایاں کرنے کی کوشش کی۔

08 اختر انصاری

اختر انصاری کے نزدیک ادب حیاتِ انسانی کی تفسیر ہے۔ ''**افادی ادب**''، ''**ایک ادبی ڈائری**'' اور ''**حالی کا تنقیدی شعور**'' میں انہوں نے نظریاتی تعصب سے بلند ہو کر جدلی مادیت کو روشنی فراہم کی۔

09 ظہیر کاشمیری

ظہیر کاشمیری نے ادب کو سماج کے طبقاتی حوالوں سے پرکھنے کی کوشش کی، انہوں نے ادب کی تعمیر میں مارکسی نقطۂ نظر ہی کو افراط سے استعمال کیا۔ ''**ادب کے مادی نظریے**'' کے بیشتر مضامین اس نقطۂ نظر ہی کی توضیحات ہیں اور انہوں نے اپنی بات پورے تیقن اور قطعیت سے کہنے کی کوشش کی ہے۔

10 ممتاز حسین

ممتاز حسین کا شمار ان نقادوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ترقی پسند تنقید کو علمی بنیاد فراہم کی اور پڑھنے والوں کو فکری استدلال سے متاثر کیا۔ انہوں نظریاتی سنگم پر قدیم اور جدید کی توضیح کی، **ترقی پسند ادب**، **مارکسی تنقید کا نظریہ**، **ادب اور پروپیگنڈا**، **آرٹ میں حسن کا تعین** اور متعدد دوسرے مضامین میں انہوں نے مارکسی فکر سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔ غالبؔ اور امیر خسروؔ میں انہوں نے قدیم ورثے اور روایت کو بھی اہمیت دی اور یہ ان کے ہاں بڑی خوش گوار تبدیلی معلوم ہوتی ہے۔

11 فیض احمد فیضؔ

فیضؔ ترقی پسند تحریک و تنقید میں جمالیاتی اسلوب کے نقاد ہیں۔ ان کی کتاب ''**میزان**'' ترقی پسند نقطۂ نظر کو خنک مزاجی سے پیش کرتی ہے۔ انہوں نے حسن کو بے حد فعال قرار دیا اور نظریاتی تخلیق کاری کے لیے بھی جمالیاتی قدروں کی پیروی ضروری سمجھی، تاہم ان کی شاعری کے سامنے تنقید ماند نظر آتی ہے۔

تقسیم کے بعد پاکستانی ادب

جوابی خاکہ:

تقسیم کے بعد پاکستانی ادب

01 تمہید

02 پاکستانی / اسلامی ادب کی تحریک کا آغاز

03 آزادی کے بعد نثری ادب

3.1 افسانہ نگاری

3.2 ناول اور ناولٹ

04 آزادی کے بعد اردو شاعری

4.1 نظم گوئی

4.2 غزل گوئی

4.3 اینٹی غزل

05 خلاصہ / اہم نکات

جواب-------------------------------------

تقسیم کے بعد پاکستانی ادب

01 تمہید

۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ دہلی اور کلکتہ کالج سے فارغ التحصیل جوانوں نے اسلام اور مسلمانوں کی پاسداری کا علم بلند کر دیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک آزاد اسلامی مملکت کا خواب دیکھا اور بالآخر تمام نوجوانوں اور بالخصوص قائداعظم محمد علی جناح (رحمۃ اللہ علیہ) کی کوششوں سے ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ اب جب پاکستان کے قیام کی وجہ اسلام اور مسلمان تھے، تو کیسے ممکن تھا کہ اس نئے ملک کا ادب اسلام (پاکستان) کے لیے نہ ہوتا۔ آزادی کے بعد پاکستانی ادب ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں شروع ہوا۔

02 پاکستانی / اسلامی ادب کی تحریک کا آغاز

پاکستانی ادب یا اسلامی ادب کی تحریک آزادی کے بعد وجود میں آئی۔ اس کے نمود پذیر ہونے کی نمایاں وجہ تو تشکیل پاکستان کے وہ مقاصد تھے جن کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا اور دوسری وجہ ترقی پسند تحریک کا انقلابی نعرہ تھا۔ اس تحریک نے قیام پاکستان کے بعد کھلم کھلا اشتراکیت کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اس نعرہ لینن کا مطلب لادینیت اور الحاد تھا اور اس کی براہ راست ضرب پاکستان کی بقاء اور سالمیت پر پڑ رہی تھی جو اسلامی نظریات کا ممبع و محور تھا۔ لہٰذا یہ ضروری سمجھا گیا کہ شعر و ادب کے لیے اشتراکی تصور کی بیخ کنی کی جائے اور فکر و فن کو اسلامی اقدار روایات کے سانچے میں ڈھالا جائے تاکہ تعلیمات اسلامی عام ہوں اور نوزائیدہ ملک کے عوام کی ذہنی اور اخلاقی تربیت صحیح سے کی جا سکے۔

الغرض:

پاکستانی ادب سے مراد وہ ادب ہے جس کا براہ راست تعلق ترقی پسند تحریک سے بنتا ہے اور وہی ادب پچھلے پچاس ساٹھ برسوں سے ہمارے ادب پر حاوی ہے۔ یہ ایک باضابطہ تحریک تھی جو کہ ناکامی سے ہم کنار ہوئی۔

پاکستانی / اسلامی ادب کی تحریک باضابطہ تحریک تھی۔ <u>اس تحریک کو فروغ دینے میں سب سے اہم کردار محمد حسن عسکری نے ادا کیا۔</u>
پاکستان کے قیام کے بعد ''ساقی'' دہلی سے کراچی منتقل ہوا تو انہوں نے اپنے مشہور زمانہ کالم ''جھلکیاں'' میں متعدد مضامین لکھ کر اس کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر محمد حسن عسکری نے ''ساقی'' میں چھپنے والے اپنے مضامین ''جھلکیاں'' میں پاکستانی یا اسلامی ادب کے بارے میں کہا ہے کہ۔

''پاکستانی یا اسلامی ادب کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں ریاکاری کو مطلق دخل نہ ہو۔''

مزید انہوں نے لکھا کہ:

''اگر آپ اسلام کے کسی اصول پر ایمان نہ لا سکے تو اپنے افسانے یا نظم میں اپنا پورا ذہنی اور روحانی تجربہ پیش کیجئے کہ فلاں فلاں نفسیاتی محرکات مجھے ایمان نہیں لانے دیتے۔''

(محمد حسن عسکری ''جھلکیاں'' حصہ اوّل مکتبہ روایت لاہور)

محمد حسن عسکری کی ذاتی کوششوں کے علاوہ اسلامی اقدار و روایات پر اعتمادِ کلی رکھنے والے ادباء و شعراء سے ۱۹۴۸ء میں حلقۂ ادب اسلامی پاکستان کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی۔ اس کے خدوخال معین کرنے اور لکھنے والوں میں قومی شعور اور ملی رجحان کو فروغ دینے کے لیے باقاعدہ منشور تیار کر لیا گیا اور اس منشور کے تحت اسلامی روح کو ادب میں سمو کر پیش کرنے، الحاد اور عریانیت کے عناصر کو ختم کرنے، اخلاقی احساس کو ادب کی بنیاد قرار دینے اور اسلامی نظریات کے منافی عوامل کی بیخ کنی کرنے کے لیے موثر اقدامات کیے گئے۔

پاکستانی تحریک کے مقاصد

اس تحریک کے مندرجہ ذیل مقاصد تھے۔

01 ادیب کا اوّلین فریضہ ہے کہ وہ قاری میں پاکستانی/اسلامی روح پھونکے۔

02 ادیب کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ پاکستانی قوم کے افراد کو یہ بات ذہن نشین کرائے کہ قوم کا ہر فرد قوم کی بقاء کی وجہ سے باقی ہے۔

؎ افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ (اقبالؒ)

03 ادیب پاکستانی قوم کے نوجوانوں کو یہ باور کرائے کہ زندگی اور دنیا کی ترقی قوم ہی کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہے۔

04 قومی سالمیت اور قومی یکجہتی کا تصور پیدا کرے۔

05 صوبائی اور علاقائی تعصب کی لعنت کو ذہنوں سے نکال پھینکے۔

06 اسلامی اقدار کو نظر انداز نہ کرے کیوں کہ پاکستان کا مطلب ہی ایک ایسی مملکت ہے جہاں اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور ہم سب اس کے بندے اور نائب ہیں۔ لہٰذا اس کے سامنے جوابدہ بھی ہیں۔

اس تحریک کو فروغ دینے میں سب سے نمایاں خدمات مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ہیں۔ انہوں نے اسلامی فکر و نظریہ کی اشاعت کے دوش بدوش ادب کے ظاہری حسن و اقدار کی اہمیت بھی واضح کی۔ ان کے علاوہ جن لکھنے والوں نے اس تحریک کو تاب و توانائی عطا کی ان میں حسبِ ذیل افراد شامل تھے۔

نعیم صدیقی	فروغ احمد	ماہر القادری	محمود فاروق
نسیم حجازی	خورشید احمد	عبدالکریم ثمر	ابوالخطیب
اسد گیلانی	ہارون الرشید	آثم میرزا	

03 آزادی کے بعد نثری ادب

آزادی کے بعد اردو نثر کا بیان ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

3.1 افسانہ نگاری

برصغیر کی آزادی اپنے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات کا نیا موضوع لے کر آئی تھی۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی نے اس موضوع کو سیاسی بصیرت اور معاشرتی آگاہی سے برتا اور ایسے افسانے لکھے جن سے انسانی بربریت تو سامنے آ گئی لیکن درد کی تصعید نہ ہو سکی۔ منفی سیاست کی پیدا کردہ ہیجانی کیفیت ختم ہوئی تو سعادت حسن منٹو نے ''**ٹوبہ ٹیک سنگھ**'' حیات اللہ انصاری نے ''**شکر گذار آنکھیں**'' عزیز احمد نے ''**کالی رات**'' راجندر سنگھ بیدی نے ''**لاجونتی**'' صلاح الدین اکبر نے ''**البم اور سائے**'' رامانند ساگر نے ''**بھاگ ان بردہ فروشوں سے**'' بلونت سنگھ نے ''**پہلا پتھر**'' جیسے افسانے لکھے جن میں فسادات کا المیہ اور انسانی کرب پوری طرح مجسم ہو گیا ہے۔ اس دورِ فسادات سے چند ایسے کردار بھی ابھرے جو سماجی اندھیرے میں خیر کے جگنو کی طرح چمک رہے تھے۔ منٹو کا کردار ''**بابو گوپی ناتھ**'' راجندر سنگھ بیدی کا ''**لاجونتی**'' اور مرزا ادیب کا کردار ''**مائی پھاتاں**'' چند ایسے ہی کردار ہیں جو عمل خیر سے انسانیت کی شمع کو روشن رکھتے اور بنیادی نیکی میں اعتماد بحال کرتے ہیں۔

متذکرہ بالا اجمال نے اردو افسانے کا نیا پیش منظر مرتب کیا۔ اس دور میں ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق سے ابھرنے والے بیشتر افسانہ نگار تخلیقی طور پر فعال نظر آتے ہیں لیکن ان کے ساتھ آزادی سے قبل جو نئے ستارے طلوع ہوئے تھے اب ان میں قطبی ستارہ بننے کی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ آزادی کے بعد ہر دہائی میں نئے افسانہ نگاروں کی ایک پوری کھیپ منظر عام پر آئی اور نہ صرف اپنی پہچان کرانے میں کامیاب ہوئی بلکہ مستقبل کے افسانے نے ان کے تاثرات بھی قبول کیے۔ افسانے کے اس تاریخی ارتقاء میں ان افسانہ نگاروں کا جائزہ ضروری ہے جو آزادی کے بعد معروف اور ممتاز ہوئے۔

01 قرۃ العین حیدر صاحبہ

قراۃ العین حیدر ایک الٹرا ماڈرن طبقے سے ابھری تھیں۔ انہوں نے معاشرتی زندگی کے متنوع اور گوناگوں سوالات کا حل تہذیبی حوالوں سے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں اونچے طبقے کی نوخیز لڑکیوں کی مزاجی کیفیات اور زمانے کی گرد سے اپنی پسند کا آئی۔ سی۔ ایس دولہا تلاش کرنے کی آرزو نمایاں ہے۔ ''**ستاروں سے آگے**'' اور ''**شیشے کے گھر**'' میں ایسے متعدد کردار ابھرے ہیں جو خوابوں کی تعبیر مثالی کرداروں میں تلاش کرتے کرتے اپنی عمر گذار دیتے ہیں۔ لیکن قرۃ العین حیدر نے آزادی کے بعد کے افسانوں میں حقیقت کی جراحت کو محسوس کیا اور معاشرتی مسائل کو چابک دستی سے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ''**جلاوطن**''، ''**ہاؤسنگ سوسائٹی**''، ''**سیتاہرن**''، ''**چائے کے باغ**''، ''**دلربا**'' اور دوسرے متعدد طویل افسانوں میں مختلف کردار تاریخ و تہذیب کے متعدد پسِ منظر اور پیش منظر سامنے لاتے ہیں اور صداقت کا اثبات تاریخی حقیقتوں سے کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے موضوع اور اسلوب کو نئی تکنیک سے

آپس میں مدغم کیا اور انسان اور بالخصوص عورت کے بنیادی المیہ کو ابھارا۔ ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع اور ابعاد متعدد ہیں۔ انہیں تہذیبی، سماجی اور تاریخی آگہی کی ایک منفرد افسانہ نگار کی حیثیت حاصل ہے۔

02 بانو قدسیہ

بانو قدسیہ **''بازگشت''** ، **''دانت کا دستہ''** کے افسانوں میں ایک ایسی داستان طراز کی صورت میں ابھریں جس کے سامنے کردار اپنی زندگی کی کتاب کھول دیتے ہیں۔ ان کے نئے افسانوں میں سماجی حقیقت پر فکری عنصر غالب ہے اور وہ انسان کی دھندلی بصیرت کو اجالنے میں مصروف نظر آتی ہیں۔ **''ناقابلِ ذکر''** کے افسانوں میں انہوں نے سماجی حقیقتوں کو خلوص اور دردمندی سے سمجھا اور ان پر اپنا ردِ عمل بے حد مثبت انداز میں پیش کیا۔ بانو قدسیہ کے افسانے قاری کے ذہن کو کروٹ دیتے ہیں اور اس کی سوچ کو مہمیز لگاتے ہیں۔

03 خدیجہ مستور (متوفی ۱۹۸۲ء)

خدیجہ مستور کا طلوع ترقی پسند افسانے کے عروجی دور میں ہوا تھا۔ اس تحریک کے زیر اثر انہوں نے معاشرتی تضادات اور عورت کی مظلومیت کو اپنے افسانوں میں خصوصی اہمیت دی۔ **''بوچھاڑ''** ، **''چند روز اور''** ، **''تھکے ہارے''** اور **''ٹھنڈا میٹھا پانی''** میں انہوں نے نچلے اور متوسط طبقے کے کرداروں کو ان کے مسائل سے ابھارا۔

04 ہاجرہ مسرور

ہاجرہ مسرور کے افسانوں میں ترقی پسند نظریے کو زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ انہوں نے عوام دوستی اور انسان دوستی کی مثالی تصویریں مرتب کرنے کی سعی کی اور حقیقت نگاری سے اپنے فن کو عصری آگہی کا نمائندہ بنا دیا۔ **''اندھیرے اجالے''** ، **''کھیل''** اور **''ہائے اللہ''** ان کے افسانوں کی مشہور کتابیں ہیں۔

05 الطاف فاطمہ

الطاف فاطمہ ان عورتوں کی افسانہ نگار ہیں جنہیں زندگی کی بیل گاڑی کھینچنے کے لیے خود اپنا کندھا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ **''وہ جسے چاہا گیا''** کے افسانوں پر اس قسم کی عورت کی بے بسی اور لاچاری کی دبیز تہہ جمی ہوئی ہے اور وقت بے لگام گھوڑے کی طرح انہیں روندتا چلا جاتا ہے۔ الطاف فاطمہ کے خلوص اور اس طبقے سے جذباتی وابستگی نے ان کے افسانوں کو حقیقت کا مرقع بنا دیا ہے۔

06 سائرہ ہاشمی

انہوں نے جدید زمانے کی عورت کو رومانی آنکھ سے دیکھا اور اس کے داخلی کرب کو افسانے میں آشکار کیا۔ **''ریت کی دیوار''** میں حقیقت کا جمالیاتی پرتو نمایاں ہے۔ بقول میمونہ انصاری وہ ماہر سرجن کی طرح زخموں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ جراحت پیدا کرنے کے بجائے ان زخموں پر یوڈی کلون بھی چھڑک دیتی ہیں جس سے زخم ایک نشیلی فضاء میں آسودہ نظر آنے لگتے ہیں۔ سائرہ ہاشمی کو چھوٹی سی بات کو پھیلانے کا فن آتا ہے اور ان کے افسانے پر ناولٹ کا گمان ہوتا ہے۔

07 اقبال مجید

اقبال مجید نے افسانے میں تہذیبی سوالات اٹھانے کی سعی کی ہے۔ **''تھکن''** اور **''پیٹ کا کیچوا''** میں نئی حقیقت سے اقدار سازی کی کاوش کی گئی۔

08 اشفاق احمد

اشفاق احمد زندگی کے اندھیرے سے چھوٹے چھوٹے جگنو چننے اور پھر ان سے پورے مطلع کو روشن کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔ **''ایک محبت سو افسانے''** ، **''اجلے پھول''** اور **''سفر مینا''** میں محبت کا جذبہ لطافت کی پھوار بن کر اترتا اور ناظرین کو شرابور کر ڈالتا ہے۔ اشفاق احمد نے افسانے کو سماجی تنقید کا وسیلہ بنانے کے بجائے اس سے مجموعی طور پر نیکی اور خیر کی فضاء تعمیر کرنے کا کام لیا ہے اور معصوم حیرتوں کو کروٹ دی ہے۔ **''امی''** ، **''عجیب بادشاہ''** ، **''شب خون''** ، **''اجلے پھول''** ان کے چند مقبول افسانوں کے عنوان میں **''گڈریا''** میں ان کا تخلیق کیا ہوا کردار **''داؤجی''** اردو افسانے میں کلاسیکی حیثیت رکھتا ہے۔

09 انتظار حسین

انتظار حسین کے فن کی ابتداء **''گلی کوچے''** کے افسانوں سے ہوئی تھی۔ **''کنکری''** ، **''آخری آدمی''** ، **''شہر افسوس''** اور **''کچھوے''** سے ہوتے ہوئے جب وہ **''خیمے سے دور''** کے افسانوں تک پہنچے تو وہ ارتقائے فن کے متعدد مراحل طے کر چکے تھے۔ ابتداء میں انہوں نے معاشرتی اور تہذیبی کہانیاں لکھیں۔ پھر اخلاقی انسان کی گم شدگی اور زوالِ آدمِ خاکی کو موضوع بنایا۔ آخری دور کے افسانوں میں انہوں نے اساطیری اور مذہبی کہانیوں کو علامتی انداز میں اس طرح لکھا کہ اس دور کی عصری آگہی ان کے داخل میں سما گئی۔ انتظار حسین علامتی اور استعاراتی اسلوب کو نت نئے ڈھنگ سے استعمال کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔ **''کایا کلپ''** ، **''وہ جو یار چاٹ نہ سکے''** ، **''زرد کتا''** ، **''کشتی''** ، **''آخری آدمی''** ، **''انتظار''** اور **''شجرہ نسب''** ان کے معروف اور ممتاز افسانے ہیں۔ انتظار حسین کا فن عوامی نہیں۔ ان کے افسانے کا اسرار معلوم کرنے کے لیے وسیع المطالعہ ہونا بھی ضروری ہے۔

10 ابراہیم جلیس

ابراہیم جلیس کی فکری اور ذہنی آبیاری میں ترقی پسند تحریک کا حصہ زیادہ ہے۔ انہوں نے بھی زندگی کے تضادات کو پست و بلند کے امتیازات سے اجاگر کیا۔ ''زرد چہرے'' ، ''چالیس کروڑ بھکاری'' ، ''تکونا دیس'' اور ''بھوکا ہے بنگال'' جیسے مجموعوں میں انہوں نے غیر جذباتی انداز میں افسانے کا موضوع بنایا۔ خواجہ احمد عباس کی طرح وہ بھی فوری تاثر کو افسانے کا روپ دے دیتے ہیں اور اکثر اوقات ان کا افسانہ اخباری خبر کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

11 غلام ثقلین نقوی

غلام ثقلین نقوی نے زندگی کو ایک سادہ لوح اور مشفق مزاج دیہاتی کی نظر سے دیکھا اور اردو افسانے میں محبت اور انس کو پروان چڑھانے کی سعی کی۔ **''شفق کے سائے''** ، **''بند گلی''** ، **''نغمہ اور آگ''** کے افسانوں میں نقوی نے اخلاقی قدروں کی پاسبانی کی اور دیہات کو ماں اور زمین کی علامت بنا کر نیکی اور خیر کی قدروں کی عظمت مستحکم کر دی۔ چنانچہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ نقوی کے ہاں شیطانی کرداروں کی شدید کمی ہے۔ **''چنبیلی''** ، **''شیرا نمبردار''** ، **''جلی مٹی کی خوشبو''** ، **''گلی کا گیت''** ، **''وہ''** اور **''سائبان والے دن کا عذاب''** ان کے چند یادگار اور ممتاز افسانوں کے عنوان ہیں۔ انسان دوستی کا حقیقی جذبہ نقوی کے افسانوں کا قیمتی عنصر ہے۔

12 رام لعل

رام لعل غیر تزئینی اسلوب کے افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے حقیقی مشاہدے کے کڑوے افسانے لکھے اور واقعاتی حقیقت کو آشکار کیا۔ کرداروں کو نفسیاتی زاویوں سے پیش کرنا ان کی ایک اور منفرد خصوصیت ہے۔ **''گذرے لمحوں کی چاپ''** ، **''چراغوں کا سفر''** ، **''اکھڑے ہوئے لوگ''** اور **''کل کی باتیں''** ان کے افسانوں کے چند ممتاز مجموعے ہیں۔ رام لعل کا افسانہ آہستہ روی سے چلتا ہے اور دیر تک قاری کو اپنا گرویدہ بنائے رکھتا ہے۔ **''سیوادار''** ، **''دو گھروں کی کہانی''** ، **''حیرت زدہ لڑکا''** ، **''روشنی کے آنچل''** اور **''سورج کا بوجھ''** ان کے چند عمدہ افسانوں کے عنوان ہیں۔ رام لعل کے بیانیہ میں گہرائی بھی ہے اور تہہ داری بھی۔ انہوں نے جنس اور جرم کے گرد ایسے افسانے لکھے ہیں جن سے عصری حقیقت صحت مندانہ انداز میں سامنے آتی ہے۔

13 محمد احسن فاروقی (متوفی ۱۹۷۸ء)

احسن فاروقی نے افسانے میں محبت کے متعلقات کو جنسی اور معاشرتی زاویوں سے ابھارا۔ **''افسانہ کردیا''** کے افسانے تشنہ روح افراد کی جذباتی کیفیات کو آشکار کرتے ہیں، ان کے بیانیہ کا داستانی اسلوب اکثر اوقات افسانے کا ساتھ نہیں دیتا اور یہ ان کے افسانوں کی ایک بڑی کمزوری ہے۔

14 رحمٰن مذنب

رحمٰن مذنب ایک موضوعی افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اس ماحول کی عکاسی حقیقت پسندانہ انداز میں کی جو طوائف کو پروان چڑھاتا ہے۔ **''اسی گلی''** ، **''چڑھتا سورج''** ، **''پتلی جان''** ، **''کوباں کی جنت''** اور **''گوری گلاباں''** اسی فضاء کے افسانے ہیں۔ ان کے افسانوں کی روح ڈیرے دار طوائف کی نمایاں داخلی تلاطم سے دوچار نہیں ہوتی بلکہ بدلے ہوئے سماجی حالات میں بھی اس فضاء کو قائم رکھنے کی کوشش میں مصروف نظر آتی ہے۔ اسی کشمکش سے رحمٰن مذنب نے چند دلچسپ کردار تراشے اور ان کی سماجی کش مکش کو آشکار کیا ہے۔

15 خلیل احمد

خلیل احمد افسانے میں ''خمارِ زہر آلود'' کی صورت نمایاں ہوئے تھے۔انہوں نے محبت کی داخلی آنچ کو کرداروں کی نفسیاتی کیفیت سے ہویدا کیا۔ان کے اسلوب میں ایک دلنشین رومانیت اور اداسی تھی اور وہ چند خوبصورت نقوش ابھار کر افسانے کے افق سے اوجھل ہو گئے۔

مندرجہ بالا احباب کے علاوہ اس دور میں مندرجہ ذیل افراد شامل ہیں۔

اے حمید،شوکت صدیقی ، جوگندر پال ،ممتاز شیریں ،سیّد انور، جمیلہ ہاشمی ، جیلانی بانو،رضیہ فصیح احمد،فرخندہ لودھی ،سیّدہ حنا،شکیلہ اختر ،رشیدہ رضویہ،قاسم محمود، واجد تبسم ،قاضی عبدالستار،اختر جمال ،انور عظیم ،اقبال متین ،مسعود مفتی ،منیر احمد شیخ ،حسن منظر،حسن طاہر،عذرا اصغر،صادق حسین ،یونس جاوید،غلام علی چوہدری،نسیم درانی ،غیاث احمد گدّی ،عوض سعید، رتن سنگھ،شرون کمار روما، ہرچرن چاولہ،کلام حیدری، عابد سہیل،ستیش ، وغیرہ وغیرہ

مزید ''**تجریدی اور علامتی افسانہ**'' دیکھنے کے لیے ڈاکٹر انور سدید کی ''**اردو ادب کی تاریخ**'' کا صفحہ نمبر ۵۶۰ ملاحظہ کریں۔

اُردُو ناول

اردو ناول کی تعریف

ناول ایک ایسے طویل نثری قصے کا نام ہے جس میں زندگی کے حقیقی واقعات، مسائل اور معاملات کا بیان ہوتا ہے۔ اس کے کردار بھی حقیقی ہونے چاہئیں، تاکہ یہ محسوس کرسکیں کہ ان کو ہمارے اطراف سے لیا گیا ہے اور ان کے احساسات و جذبات حقیقی انسانی احساسات جذبات ہیں۔ اس میں ایک منضبط پلاٹ (PLOT) کا ہونا ضروری ہے، تاکہ اس کی ایک ایسی ہیئت نظر آئے کہ اسے دوسری کسی نثری صنف سے علیحدہ رکھ کر جانچا اور پرکھا جا سکے۔ آیئے ناول کی تعریف کے ضمن میں کچھ اور نقطہ ہائے نظر کا جائزہ لیتے ہیں جس سے اس کی صنفی اہمیت کا ہمیں بخوبی اندازہ ہو سکے۔

ناول ایک ایسی طویل نثری صنف ادب ہے جو اپنے کرداروں کے قصوں کو تمام تر حقیقتوں (REALITIES) سچائیوں اور تنوعات کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس میں افسانے (Short Story) کی نسبت زیادہ پھیلاؤ ہوتا ہے جس کے بنا پر ابعادی (DIMENSIONAS) بن جاتا ہے۔ ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ دبردست دماغی انہماک اور تخیلی بصیرت کا حامل ہو۔ ناول کے قصے یا ماجرے میں انسانی تجربات پر مبنی صداقتیں یا سچائیاں ہونی چاہئیں۔

ناول کسی ایک یا ایک سے زیادہ عہد کی زندگی کی دستاویز ہوتا ہے۔ ایک اچھے ناول میں رفعتِ خیال اور زندگی کی بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ناول زندگی کے بڑے مسائل سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ جن میں حیات وممات کے مسائل، جبر واستحصال، وقت کا جبر، تاریخ کا جبر، سماجی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی وثقافتی جبر (COMPULSIONS) شامل ہیں۔

ان تعریفوں سے پڑھنے والے کے ذہن میں ناول سے متعلق اور بھی خیالات در آتے ہیں۔ مثلاً: ناول مسلسل قصے کا نام ہے۔ اس میں ایک سے زیادہ عہد سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایسی بیانیہ نثر ہے جس میں اصل زندگی کی پیشکش موجود ہوتی ہے۔

ناول کی وہ خصوصیات جو بادی النظر میں اسے داستان (ROMANCE) سے ممتاز کرتی ہے وہ حقیقت نگاری، کردار کی اہمیت اور فلسفیانہ یا فکری بصیرت ہے۔

ناول کے اجزائے ترکیبی

وہ اجزاء جو ناول کو خوبصورت بنانے کے لیے ضروری ہیں، ناول کے اجزائے ترکیبی کہلاتے ہیں۔ یہ اجزائے ترکیبی کسی ناول نگار کی ذاتی کوشش نہیں ہے اور نہ ہی ان اجزائے ترکیبی کو ایک دن میں بیٹھ کر متعین کیا گیا ہے۔ بلکہ ان اجزاء کے وجود میں آنے میں ناول کو صدیوں ارتقاء کے زینے طے کرنے پڑے۔ ناول کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں۔

ناول کے اجزائے ترکیبی

۱	پلاٹ (Plot)	۷	اسلوبِ بیان (Style)
۲	قصہ/ماجرا	۸	جذبات نگاری
۳	کردار	۹	نقطۂ نظر (نظریۂ حیات/بصیرت Vision)
۴	مکالمہ	۱۰	زبان
۵	فنتاسی (Fantasy)	۱۱	تکنیک
۶	ماحول	۱۲	کہانی پن (Story Element / Storyness)

مندرجہ بالا نکات کی مختصر تشریح پیشِ خدمت ہے تاکہ طلباء مزید سمجھ سکھیں کہ یہ اجزائے ترکیبی کس طرح ایک ناول کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔

۱ **پلاٹ:** یہ قصے یا ماجرے کی فنی ترتیب کا نام ہے۔

۲ **قصہ:** اسے ہم کہانی یا ماجرے سے تعبیر کرتے ہیں۔

۳ **کردار:** ناول میں انسانی کردار یا کرداروں ہی کی کہانی بیان کی جاتی ہے۔ یہ کردار جیتے جاگتے ہونے چاہئیں۔ یہ کردار فنتاسی (Fantastical) بھی ہو سکتے ہیں۔ فنتاسی کی وضاحت آگے کی جائے گی۔

۴ **مکالمہ:** ناول میں کردار کے خیالات کا اظہار مکالمہ ہے۔ اس کی گلشن میں پھول کی سی اہمیت ہے۔

۵ **فنتاسی:** فنتاسی سے مراد ہے کہ کردار یا ماحول پر ایک خاص قسم کی نقاب ڈال کر ماجرے یا کہانی کو واضح کیا جائے۔ عام زندگی میں جو سچائیاں ہیں اگر انہیں الٹ کر دوسری شکل دے دی جائے تو اسے فنتاسی سے نام سے پکاریں گے۔ یہاں عقل اور منطق کے بجائے یقین کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں ہیں، جیسے: حجاب امتیاز علی کا ناول ''پاگل خانہ'' جس میں تخیل کے زور پر ایٹمی جنگ کا فنتیسائی حال چال بتایا گیا ہے۔ یا محمد خالد اختر کے ناول ''چاکیواڑہ'' میں وصال کے کردار اور واقعات فنتاسی کی مثال ہیں۔ قراعۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' میں کمال، گوتم، چمپیا کے کردار ڈھائی تین ہزار سال کے دوران ہر عہد میں موجود ہیں۔ مغرب میں ورجینیا وولف (VIRGINIA WOOLF) کے ناول ''اورلینڈو'' (ORLANDO) کی مثال ہے۔

فنتاسی والے ناول کے پیچھے کوئی اخلاقی سبق، کوئی فکر یا کوئی فلسفہ ضرور ہوتا ہے۔ مختصر طور پر اتنا سمجھ لیا جائے کہ داستانوں کے کردار اور واقعات زیادہ تر فنتاسی پر مبنی ہوتے ہیں۔

۶ **ماحول:** ناول کا قصہ خلا میں معلق نہیں ہوتا اس کے لیے کسی نہ کسی ماحول یا فضاء (Envoirenment) کی ضرورت ہوتی ہے جس میں کردار سانس لے رہے ہوتے ہیں۔ خاصے ناول اپنے مخصوص ماحول کی بنا پر یادگار بن جاتے ہیں۔ اکثر غیر ملکی ناول اپنے مخصوص ماحول کی بنا پر اپنے اندر کشش رکھتے ہیں۔

۷ **اسلوب بیان:** جس طرح جسم کے ساتھ جان ہوتی ہے اسی طرح تحریر کے ساتھ اسلوب (Style) ہوتا ہے۔ دل نشین و دلچسپ اسلوب ناول کی جان ہوتا ہے۔ ناول کے ایک محقق نقاد علی عباس حسینی اسے ''سلیقے'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک نقاد نے تحریر کو بذاتِ خود تحریر کہا ہے۔

۸ **جذبات نگاری:** انسان کی زندگی جذبات سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ جذبات انسانوں کے درمیان پُل کا کام انجام دیتے ہیں۔ جذبات نگاری میں تخلیقی بھرم کا ہونا ضروری ہے۔ راشد الخیری سے منسوب ''جذبات نگاری'' مصنوعیت کی مثال ہے، جذبات حقیقی ہوں اور ماجرے کی قوت کو مستحکم کرتے ہوں تو بہتر ہے۔

۹ **نقطۂ نظر:** کوئی بھی ناول نگار نقطۂ نظر (نظریہ حیات / زندگی کی بصیرت یا وژن) سے صَرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ ہر ناول کی کہانی سے کوئی نہ کوئی ویژن ضرور برآمد ہوتا ہے۔ جس سے قاری متاثر ضرور ہوتا ہے۔

۱۰ **زبان:** ناول میں زبان ماجرے کا وسیلہ ہوتی ہے جسے کردار بولتا ہے اور وہ مکالمہ میں جھلتی ہے۔ ناول میں ماجرے کے تقاضوں کے تحت حقیقی زبان اس کی شان بڑھا دیتی ہے۔ ناول میں زبان سادہ ہوسکتی ہے، مرصع ہوسکتی ہے کا دونوں کا مرکب۔ زبان ایسی ہونا چاہئے کہ قاری کے ذہن پر بار نہ ہو۔

۱۱ **تکنیک:** تکنیک اس طریقے کو کہتے ہیں جس کے ذریعے فن کار مواد کو اسلوب سے ہم آہنگ کر کے اسے ایک مخصوص طریقے سے متشکل کرتا ہے۔ اس طریقے میں بہت سے طریقے پنہاں ہوتے ہیں۔ (ابھی جو بات کی گئی ہے اسے ممتاز خاتون نقاد ممتاز شیریں کی کتاب ''معیار'' سے اخذ کیا گیا ہے۔

۱۲ **کہانی پن:** کہانی پن یا قصہ پن کا پسِ منظر یہ ہے کہ افسانے / ناول میں تجرید نگاری اور بے ڈھنگی علامت نگاری کی وجہ سے ابلاغ (قصے کا سمجھ میں آنا یا اس کی فہم) کا مسئلہ پیدا کر دیا گیا تھا۔ اس لیے کہانی پن کی اصطلاح مسلسل استعمال ہوئی، تا کہ یہ واضح کیا جا سکے کہ ناول میں کہانی پن یا ابلاغ ہونا چاہئے، اگر یہ چیستاں یا معمہ ہے تو قاری ناول یا افسانے کو کیوں پڑھے۔ کہانی پن کے بغیر ناول ادھورا بلکہ ناکام ہے۔

ہیئت کا تصور

ان اجزائے ترکیبی سے ناول کی ہیئت (FORM) متشکل ہوتی ہے لیکن اسے کلیہ نہیں بنانا چاہیے اور اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت بھی نہیں دینی چاہیے۔ محض ہیئت کا تقاضہ پورا کرنے سے ناول دلچسپ نہیں ہوسکتا۔ ناول کی ہیئت میں تھوڑی بہت تبدیلی ہوسکتی ہے، تا کہ ناول میں دلچسپی برقرار رہے۔ وقت سے ساتھ ساتھ ہیئت میں خفیف سی تبدیلی آجاتی ہے، مگر جوہر سلامت رہنا چاہئے۔

اردو ناول کا مختصر ارتقاء

بیسویں صدی کے ابتدائی چار عشروں میں اردو افسانے کو جتنی اہمیت ملی اتنی اہمیت ناول کو نصیب نہیں ہوئی۔ رومانویت کی سنہری دھول اور ترقی پسند تحریک کی حقیقت پسندانہ روش سے بھی معدودے چند ناول ہی برآمد ہوئے۔ یہ اعزاد پریم چند کو حاصل ہے کہ انہوں نے متعدد ناول لکھ کر اس صنف نثر کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔

01 سجاد ظہیر

سجاد ظہیر کا ناولٹ **''لندن کی ایک رات''** نئے سماجی شعور کی بیداری کا اطلاع نامہ ہے اور اس میں لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے خوش حال نوجوانوں کے دلوں میں پرورش پانے والے اضطراب کو منعکس کیا گیا ہے۔ ناولٹ کا مرکزی کردار **نعیم** درحقیقت سجاد ظہیر کی فکری پرواز اور تبلیغی مقاصد سے ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ترقی پسند ناول میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

02 کرشن چندر (متوفی ۱۹۷۷ء)

کرشن چندر نے اپنے ناول **''شکست''** میں اقتصادی بدحالی اور طبقاتی آویزش کو کشمیر کے پسِ منظر سے ابھارا ہے۔ ناول کے دو اہم کردار **شیام** اور **موہن سنگھ** اونچے طبقے سے نسوانی کرداروں میں سے **ونتی** اور **چندرا** نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ناکام عشق اور المیہ انجام سے عورت کی مظلومیت آشکار کی گئی لیکن اس سے ناول نے ایک فارمولا کہانی کی صورت اختیار کر لی۔ سیاسی اور سماجی حقائق کو کرشن چندر کے ناولوں میں پس منظر کا کام بھی دیتے ہیں اور یہ ناول کا پیش منظر بھی بن جاتے ہیں۔ ناول **''جب کھیت جاگے''** تلنگانہ کے کسانوں کی سیاسی کش مکش کا آئینہ دار ہے۔ **''طوفان کی کلیاں''**، **''آسمان روشن ہے''**، **''ایک وائلن سمندر کے کنارے''** اور **''ایک عورت ہزار دیوانے''** میں بھی سماج کے زخموں کی نمائش زیادہ ہے اور اس کی انتہاء **''ایک گدھے کی سرگذشت''** ہے جس میں طنز غالب قوت بن گئی ہے۔ ان ناولوں میں کرشن چندر کی گل بارز بان ان کی کم زوری بن گئی ہے۔ کرشن چندر نے اردو ادب کو چند مقبول ناول دیے لیکن ان کے قلم سے کوئی ایسا ناول نہیں نکلا جو ابعادِ ثلاثہ کا احاطہ کرتا اور جاوداں تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

03 عصمت چغتائی

عصمت چغتائی کا ناول **''ٹیڑھی لکیر''** ان کی اپنی زندگی کے پسِ منظر سے ابھرا۔ اس کا مرکزی کردار **شمن** ان کی ذاتی اور نفسیاتی مہیّجات کا آئینہ ہے۔ ان کا ناولٹ **''ضدی''** میں امیر لڑکے **پورن** اور غریب لڑکی **اوشا** کی محبت کو طبقاتی تضاد ابھارنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ **''معصومہ''** اور **''عجیب آدمی''** کی اساس فلمی دنیا میں پرورش پانے والی ہوسِ زر اور ہوسِ جنس ہے۔ ناول **''ایک قطرہ خون''** کا تانا بانا واقعۂ کربلا سے مرتب ہوا ہے۔

''سودائی'' میں زبان کو نسائی لوچ سے استعمال کرنے کا انداز نمایاں ہے۔ عصمت نے شوخ مزاجی سے گرم جملوں کو استعمال کیا اور نسوانی مزاج اور نفسیات آشنائی کا ثبوت دیا ہے لیکن بطور ناول نگار انہیں **''ٹیڑھی لکیر''** سے ہی شہرت ملی اور یہی ان کے فن کا سنگِ میل نظر آتا ہے۔

04 اوپندر ناتھ اشک

اوپندر ناتھ اشک کا ناول ''**ستاروں کا کھیل**'' محبتوں کا گورکھ دھندا ہے۔جس میں تقدیر اپنا غالب کردار ادا کرتی ہے۔ ہندی سے اردو میں منتقلی نے اس ناول کے بیانیہ کو مزید کم زور کر دیا ہے اور یہ زندگی کے لمس سے محروم نظر آتا ہے۔

05 عزیز احمد (متوفی ۱۹۷۸ء)

عزیز احمد کی نمود ''**ہوس**'' اور ''**مرمر اور خون**'' جیسے رومانی ناولوں سے ہوئی تھی، لیکن انہیں شہرت ''**گریز**'' سے ملی جس میں مرکزی شخصیت **نعیم** کا کردار اشتراکی زاویوں سے تعمیر کیا گیا ہے اور یہ جنس کے ہیجانی عمل اور ردِعمل کی کمزوری کا شکار ایک منفعل کردار ہے اور اپنے آئیڈیل کو بلقیس کی صورت میں دیکھتا اور شکست خواب سے گذرتا ہے۔ناول ''**آگ**'' میں آزادی سے قبل کے کشمیر کی سماجی زندگی اور ڈوگرہ شاہی پر موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔''**ایسی بلندی ایسی پستی**'' حیدرآباد کے ریاستی ماحول، امرا کی ریشہ دوانیوں، متزلزل وفاداریوں، تہذیبی تصنع اور ہوس پرستی کو اجاگر کرتا ہے۔''**شبنم**'' میں جنس کو جسمانی ضرورت کے طور پر ابھارا گیا لیکن اس سے افلاطونی محبت کا زاویہ بھی سامنے آتا ہے۔

عزیز احمد نے عصری سماجی اور تہذیبی زندگی کو ناول میں سمونے کے عمدہ تجربے کیے۔ان کا ایک رخ تاریخ کی طرف بھی مڑا ہوا نظر آتا ہے۔''**جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں**''، ''**خدنگِ جستہ**'' اور مثلث جیسے ناولٹوں میں انہوں نے تاریخ کو اس کے حقیقی ماضی سے بازیافت کیا اور حقیقت کو ایک ماہر فوٹو گرافر کی طرح فوکس میں لے لیا۔انہیں ناول کی تکنیک پر مکمل عبور حاصل تھا۔ان کا اسلوب غیر جذباتی لیکن بے حد موثر ہے۔ان کے اثرات بالواسطہ طور پر قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور رشیدہ رضویہ کے ہاں نظر آتے ہیں۔

چند مشہور پاکستانی ناول نگار

01 نسیم حجازی

نسیم حجازی کا شمار اس دور کے مشہور ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔قیسی کے ناول ''**خطا**'' ، ''**دھوپ**'' ''**چوراہا**''اور رشید اختر ندوی کے ناول ''**سازِ شکستہ**'' ، ''**سوزِ دروں**'' ، ''**ہرجائی**'' اور ''**سودائی**'' میں نوجوانی کی سرسبز محبت اور جذبات کی طغیانی آویزش نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔رئیس احمد جعفری اور نسیم حجازی نے نے شوکت وعظمتِ رفتہ کو اسلامی ہیرو کی فتوحات سے اجاگر کیا۔عنفوانِ شباب میں قدم رکھنے والے قارئین ان ناول نگاروں کو اب بھی دلچسپی سے پڑھتے ہیں لیکن اردو ناول کو انقلابی کروٹ قرۃ العین حیدر نے دی۔

02 عبداللہ حسین

عبداللہ حسین کا ناول ''**اداس نسلیں**'' کا سیاسی اور سماجی پسِ منظر انگریزی حکومت کے آخری نوے سالوں پر محیط ہے۔لیکن اس دور کے واقعات ناول کی بنت میں پوری طرح سما نہیں سکتے ،اس کا مرکزی کردار **نعیم** اس عہد کی اداس نسل کا نمائندہ ہے۔اور اس کے باطن میں پرورش پانے والا دیہات شہری تہذیب کی چکاچوند میں اپنی نئی پہچان کے لیے سرگرداں ہے۔اس ناول میں زندگی اور محبت کی کہانی اگرچہ صداقت کی چہرہ نمائی پوری طرح نہیں کرسکی لیکن اس ناول کو اردو ادب میں ایک اہم مقام دیا گیا۔ان کا ناول ''**باگھ**'' اور ناولٹ ''**نشیب**'' نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہیں ،عبداللہ حسین کا فن لالۂ خودرو کی طرح بڑھتا اور پھلتا پھیلتا ہے لیکن ان کے اسلوب کو ان کی زبان مناسب سہارا فراہم نہیں کرتی۔

03 محمد احسن فاروقی (متوفی ۱۹۸۱ء)

احسن فاروقی کو بطور ناول نگار ''**شامِ اودھ**'' سے شہرت ملی جو امراؤ جان آدا کے بعد لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کا حقیقی مرقع ہے۔ان کا ناولٹ ''**صبح بنارس**'' ، ''**شامِ اودھ**'' ہی کا ضمیمہ ہے لیکن اس میں مستقبل کی چاپ اور نئی تہذیب کا غلبہ نمایاں ہے۔ان کے ناول ''**سنگم**'' کو اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

04 انتظار حسین

انتظار حسین کی واردات جو ہجرت کے تجربے سے پھوٹی تھی ان کے ناول ''**چاند گہن**'' اور ''**بستی**'' کے باطن میں موجود ہے اور ان کے دونوں ناولوں میں زمانی تسلسل موجود ہے۔''**چاند گہن**'' میں امید کی شمع روشن ہوئی تھی لیکن ''**بستی**'' میں قدروں کی شکستگی سامنے آئی اور مثبت ماضی ٹوٹی ہوئی امید کی انگلی پکڑ لیتا ہے۔ناول بستی کو زیادہ روشنی **ذاکر** اور **صابرہ** کے کرداروں سے ملی ہے جو منظر کے ساتھ پسِ منظر کو بھی منور کردیتے ہیں۔''**دن اور داستان**'' میں انتظار حسین کا غیر روایتی انداز اور اساطیر اور تلمیحات سے استفادہ کا رجحان نمایاں ہے۔**بستی** کو انتظار حسین کے فن اور اردو ناول کی ایک اہم کڑی شمار کیا گیا ہے۔ان کا نیا ناول ''**تذکرہ**'' کے عنوان سے چھپا ہے۔

05 مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ کا ناولٹ ''**فاختہ**'' میں جنگ کو ہولناک محرمیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ ''**پیار کا پہلا شہر**'' میں ان کی خیال آفرینی سفر نامے کے انداز میں سامنے آتی ہے۔مستنصر کے بیشتر نسوانی کردار جسمانی معذوری کا شکار ہیں اور یہ دردمندی پیدا کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ان کا سحر آفریں اسلوب انہیں مقبول ناول نگاروں میں جگہ دینے میں بہت معاون ہے۔

06 غلام ثقلین نقوی

غلام ثقلین نقوی کی ناول میں اوّلین نمود ''**چاند پور کی نینا**'' سے ہوئی تھی جس میں ہارڈی کے ناول ''**ٹیس**'' کا المیہ مشرق کی دیہاتی سرزمین سے ابھارا گیا تھا۔ان کے ناول ''**میرا گاؤں**'' میں تغیر کا عمل مشین کی آمد سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس طرح یہ ناول ہر اس گاؤں کا نمائندہ بن جاتا ہے جس کی نئی صورت گری میں مشین اور بجلی اہم کردار ادا کر رہی ہے۔اس ناول کے مرکزی کردار شیماں، حمیداں، ماسی ریشم، احمد، علی، عبدالرحمٰن اور سلمٰی اپنی خوشیاں اور غم دیہات کی کوکھ سے ہی پیدا کرتے ہیں۔گاؤں بڑی ماں کی طرح دامنِ عافیت کشادہ رکھتا ہے اور اس کی آغوش سے نکلنے والے دائم نا آسودگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔نقوی صاحب کے خلوصِ عمل نے نہ صرف ناول کے خارجی اور باطنی مفاہیم کو آشکار کیا ہے بلکہ پاکستانی مٹی کی باس بھی قاری کو منتقل کر دی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے درست لکھا ہے کہ

''**ایسا ناول تو کبھی کبھار ہی تخلیق ہوتا ہے لیکن جب تخلیق ہوتا ہے تو اپنے عہد کا سب سے اہم واقعہ قرار پاتا ہے۔**''

(ڈاکٹر وزیر آغا ۔ دائرے اور لکیریں۔ص۔۵۳)۔۔۔(ڈاکٹر انور سدیدؔ۔اردو ادب کی تاریخ ص۔۵۷۵)

07 قدرت اللہ شہاب (متوفی ۱۹۸۶ء)

قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ''**یا خدا**'' اس مظلوم عورت کا المیہ ہے جسے فسادات کے مظالم نے بے حس بنا دیا تھا۔شہاب نے ایک غیر جانبدار مبصر کی طرح اس المیے کو سمیٹا اور عورت کا روحانی کرب ناظرین کو منتقل کر دیا۔اس ناولٹ کا موضوع لمحاتی تھا لیکن اثرات ہمہ گیر ہیں۔

08 قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر کی اوّلین نمود ''**میرے بھی صنم خانے**'' سے ہوئی تھی۔''**سفینۂ غمِ دل**'' میں انہوں نے اونچے ارسٹوکریٹ طبقے کی عکاسی شعور کی بہتی رو سے کی۔ان دونوں ناولوں کی فضا، زبان اور اخلاقیات میں رومانی اجنبیت موجود ہے۔''**آگ کا دریا**'' ان کا ایک ایسا نادر تجربہ تھا جس میں گم شدہ تشخص کی بازیافت کے لیے چار ہزار سال قدیم ماضی میں تخلیقی سفر کیا گیا اور گوتم نیلمبر، چمپا اور ہری شنکر کے کرداروں سے فلسفہ اور زندگی کے مسائل بھگتی رویہ اور عرفانِ حیات کا زاویہ ابھارا گیا۔ان کا ناول ''**آخرِ شب کے ہم سفر**'' میں عہد حاضر کی سیاسی اور انقلابی تحریکوں میں ڈوبتے ہوئے اینگو انڈین کلچر کی عکاسی کی گئی ہے۔''**کارِ جہاں دراز**'' کا موضوع قرۃ العین حیدر کے اپنے خاندان کی تہذیبی اور فکری زندگی ہے اور اس میں بھی جڑوں کی تلاش کا رجحان نمایاں ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ناول کے وسیلے سے تاریخ کے باطن میں سفر کیا اور روحانی قدروں کی بازیافت کی، ان کے ناول کثیر الابعاد اور تینوں

زمانوں پر محیط ہیں۔اگرچہ ڈاکٹر احسن فاروقی نے ان پر کڑی تنقید کی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے اردو ناول کو وسعت آشنا کیا اور اسے اعتبارِ فن بخشا۔ان کے اثرات عبداللہ حسین، نثار عزیز بٹ، جمیلہ ہاشمی، حتیٰ کہ انتظار حسین کے ہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدیدؒ کہتے ہیں کہ:

''تاریخ کو ناول میں کیمیائی انداز میں شامل کرنا ان کی منفرد خصوصیت ہے۔'' (اردو ادب کی تاریخ: ص۔۵۷۰)

بلاشبہ انہوں نے اردو ناول کو نئے آفاق سے روشناس کرایا ہے۔''**گردشِ رنگِ چمن**'' ان کا تازہ ترین ناول ہے۔

09 خدیجہ مستور

خدیجہ مستور نے ''**آنگن**'' اور ''**زمین**'' میں معاشرتی مسائل اور تاریخ کے دھارے کو باہم مدغم کرنے کی سعی کی لیکن شاید مطلوبہ تاثر پیدا نہیں ہو سکا۔ان ناولوں کے بیشتر کردار مثلاً عالیہ، چھمی، بڑے چچا، صفدر، جمیل اور کریمن یوا سب حالات و حادثات کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں اور مصنفہ کا سیاسی شعور یہ واضح نہیں کرتا کہ آزادی ہند نعمت تھی یا آزارِ جاں۔ان ناولوں کو تاریخ سے الگ کر دیا جائے تو خدیجہ مستور کی سادگی میں پرکاری اور دردمندی اور نفسیاتی آگہی کی پرتیں سامنے آجاتی ہیں۔

10 فرخندہ لودھی

فرخندہ لودھی کا ناول ''**حسرتِ عرضِ تمنا**'' خواب اور شکستگیِ خواب کا منظر مرکزی کردار **سپنا** کے وسیلے سے پیش کرتا ہے۔فرخندہ لودھی نے اس ناول میں زندگی کی تین منازل **دھیان**، **گیان** اور **نروان** کی تعبیر کی ہے اور طوائفیت کے حوالے سے عورت کے المیے کو ابھارا ہے۔ فرخندہ لودھی نے ایک مرکزی کہانی کے بطون سے منفرد انداز میں متعدد کہانیوں کو جنم دے کر اس ناول کو ایک علیحدہ نوعیت کا تجربہ بنا دیا ہے۔

11 رشیدہ رضویہ

رشیدہ رضویہ نے ''**اسی شمع کے آخری پروانے**''، ''**لڑکی ایک دل کے ویرانے میں**'' اور ''**گھر میرا راستے غم کے**'' جیسے ناولوں میں تاریخ کے وسیع کینوس پر سیاسی اور تہذیبی نقوش ابھارے ہیں۔لیکن ان کے کردار جب تاریخ میں سفر کرتے ہیں تو کٹھ پتلیوں جیسے نظر آنے لگتے ہیں اور رشیدہ قرۃ العین حیدر کے سائے میں تخلیقی سفر طے کرتی نظر آتی ہیں۔

12 بانو قدسیہ

بانو قدسیہ نے ناول ''**راجہ گدھ**'' تک کا فنی سفر ناولٹ ''**پردہ**'' اور ''**شہرِ بے مثال**'' کے راستے سے طے کیا۔ان ناولوں میں وہ شدید ردِعمل نمایاں ہے جو بانو قدسیہ کے دل کے کسی کونے میں بڑے شہروں کے خلاف موجود ہے۔شہرِ بے مثال کا مرکزی خیال رشیدہ اور ''**راجہ گدھ**'' کا مرکزی کردار **قیوم** دونوں کا عقبی دیار، زندگی کا پس منظر اور ذہنی عمل دیہاتی ہے اور وہ عمل و ردِعمل کی چکی میں آسانی اور دیہاتی سادگی سے پستے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدیدؒ کے مطابق:

''بانو قدسیہ ایک ماہر پارچہ باف کی طرح ناول کا کینوس باریک سوت سے تیار کرتی اور چنیوٹی کھیس کی طرح اس پر زندگی کے ہمہ رنگ نقش ابھارتی ہیں۔'' (اُردو ادب کی تاریخ: ص۔۵۷۴)

لیکن ان کی منطق بعض اوقات اختلاف رائے کا محل بھی پیدا کر دیتی ہے۔

13 الطاف فاطمہ

الطاف فاطمہ نے درمیانے درجے کے خاندانوں کو اردو ناول میں جگہ دی۔ اس کی مثال ''**دستک نہ دو**'' ہے جس کے کرداروں میں **گیتی آرا** بغاوت کی، **ارجمند** اطاعت کی اور **صولت** پھوہڑ پن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن زندگی پر کم زور گرفت ان سب کو ایک مستقل تباہی سے دوچار کر دیتی ہے۔ ''**چلتا مسافر**'' میں مشرقی پاکستان کی تقسیم اور بہاری مہاجروں کے ابتلا کو کامیابی سے موضوع بنایا گیا ہے۔ الطاف فاطمہ نے واقعات کے فطری بہاؤ کو قائم رکھا اور المیہ صورت کو فنی چابکدستی سے مجسم کر دیا ہے۔

مشرقی پاکستان کے موضوع پر سلمیٰ اعوان کا ناول ''**تنہا**'' اور طارق محمود کا ''**اللہ میگھ دے**'' رونگٹے کھڑے کر دینے والی ادبی دستاویزیں ہیں۔

14 رضیہ فصیح احمد

رضیہ فصیح احمد نے ناول ''**آبلہ پا**'' میں کہانی کو متعدد راویوں کی زبان سے پیش کرنے کا تجربہ کیا ہے۔ ''**انتظارِ موسمِ گل**''، ''**ایک جہاں اور بھی ہے**'' اور ''**متاعِ درد**'' ان کے چند دوسرے قابل ذکر ناول ہیں۔

رضیہ فصیح احمد واقعات کی کڑیاں اسی طرح جوڑتی ہیں جیسے سوئیٹر بن رہی ہوں۔ (ڈاکٹر انور سدیدؒ)

لیکن حادثات اور واقعات کے انوکھے پن کی وجہ سے بعض اوقات مجموعی تاثر بکھر جاتا ہے اور ناول پر سوچی ہوئی حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔

15 جیلانی بانو

جیلانی بانو کا ناول ''**ایوانِ غزل**'' حیدرآباد کے سیاسی افق پر ابھرنے والی نئی قوت کا نمائندہ ناول ہے۔ سائرہ ہاشمی، آمنہ ابوالحسن، رضیہ سجاد ظہیر، شہزاد منظر، رحیم گل، موہن لعل، صالحہ عابد حسین، بشریٰ رحمٰن اور سلمیٰ یاسمین کے ناولوں میں گھریلو اور سماجی عورت کی خوشیوں اور غموں کو نسائی آگہی سے پیش کیا گیا ہے۔

16 و۔ب۔سدید

و۔ب سدید اردو کی گم شدہ ناول نگار ہیں۔ ان کا معرکہ آرا ناول ''**بیاضِ سحر**'' خیر و شر کے تصادم کو بے حد فطری انداز میں پیش کرتا ہے اور عمل کی اہمیت کو مکافاتِ عمل سے گذارتا ہے۔

04 آزادی کے بعد اردو شاعری

اقبالؒ کی وفات سے لے کر برصغیر کی آزادی تک اردو شاعری کی بیشتر قوت غیر ملکی تسلط کے خلاف جدوجہد میں صرف ہوتی رہی۔ انگریز کے خلاف ردِعمل نے قومی تحریکوں کو جنم دیا جس سے فکری رجحان وتموّج پیدا ہوا۔ آزادی کے بعد کا دور اس حرکت وحرارت کو مائل بہ اعتدال کرنے اور نظم وضبط کے علاوہ نئی قومی تعمیر کا دور تھا۔ اس دور میں اردو شاعری نے بھی کئی سطحوں پر تعمیری کارنامہ سرانجام دینے کی کوشش کی۔ شعراء نے ہجرت کے تجربے کو شاعری میں سمویا، تشبیہ، استعارہ اور علامت کا نیا نظام گردوپیش کی اشیاء اور مظاہر سے مرتب کیا، لفظ کی تخلیقی دریافتِ نو کی گئی اور اظہار کے نئے کرینے وضع کیے گئے۔ تخلیقات کو داخل کے وسیع تر برِّ اعظم سے مواد حاصل کرنے کی اجازت دی گئی تو اس کی شہادت کے لیے قدیم روایات کو بھی استعمال میں لایا گیا۔ باہر کی دنیا سے رابطہ قائم رکھا گیا لیکن تخلیقی عمل میں صریرِ خامہ کو نوائے سروش بنانے کے لیے غیب سے مضامین حاصل کرنے کی سعی بھی کی گئی۔ اس دور میں شاعری نے افقی اور عمودی دونوں جہات میں سفر کیا۔ غزل اور نظم کو معنوی وسعت عطا ہوئی اور شاعری میں اظہار کی بعض نئی اصناف کو بھی روشناس کرایا گیا۔ اس دور کی بیشتر تخلیقات ابھی وقت کی کٹھالی میں امتحانی مراحل طے کر رہی ہیں۔ تاہم زیرِ نظر چالیس برس کے دور نے چونکہ سابقہ ادوار سے اپنا ادبی رابطہ قائم رکھا ہے۔ اس لیے ۱۹۸۶ء تک کم از کم چار نسلوں نے تخلیق کاری کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ قدیم صنفِ سخن غزل نے ترقی کے کئی مدارج طے کیے ہیں اور یہ اس دور میں بھی مقبول ترین صنف ثابت ہوئی ہے۔ آزادی کے بعد نظم اور غزل کا احوال ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

4.1 نظم گوئی

آزادی سے پہلے اردو نظم نے جس نئے سفر کی ابتداء کی تھی اس کے راستے پر راشدؔ، میراجیؔ، فیضؔ، مجید امجدؔ، یوسف ظفرؔ، قیوم نظرؔ، مختار صدیقی اور صفدر میرؔ جیسے شعراء نے اپنے فن کے قمقمے روشن کیے اور مستقبل کی نظم کو نئے امکانات کی تلاش پر آمادہ کیا۔ اگرچہ میراجیؔ کا انتقال نومبر ۱۹۴۹ء میں ہو گیا تھا لیکن اردو نظم کی خوش قسمتی تھی کہ متذکرہ بالا شعراء میں سے بیشتر تادیر زندہ رہے۔ اور چند ایک اب بھی زندہ ہیں۔ اور اس نظم کو ارتقاء آشنا کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوئے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ آزادی کے بعد متعارف ہونے والے شعراء نے نظم کے نئے مزاج کو بڑی خوبی سے سمجھا اور نہ صرف ذات اور کائنات میں نیا ربط باہم تلاش کیا بلکہ انہوں نے روح کا تعاقب بھی کیا، اپنے اندر کی آواز بھی سُنی اور حقیقت کے پسِ پردہ اسرار کو تخلیقی عمل سے کھولنے کی سعی بھی کی۔ چنانچہ آزادی کے بعد کی چار دہائیوں میں نظم نے صرف استعارہ، علامت اور تمثال کے تخلیقی استعمال سے ایک نئی شعری زبان وضع کی جس میں تازگی بھی تھی اور توانائی بھی۔ نئی نظم نے بیسویں صدی کی بڑھتی ہوئی میکانکیت، تنہائی اور مایوسی کو متعدد بار اہم موضوع کی حیثیت دی۔ لیکن جب شاعری کی داخلی نظر نے اپنے اندر کی کائنات تک رسائی حاصل کی اور اس کے احساس نے روحانی مدار کو مس کیا تو اس نے ''روحِ کُل'' تک رسائی کی کاوش بھی کی۔ چنانچہ اس دور میں نئی نظم محض ایک شعری تجربہ نہ رہا بلکہ شعراء نے اس کی تقدیس میں بھی دلچسپی لی۔ موضوعاتی نظم مسلسل روبہ زوال ہوتی گئی اور اب جو نظم سامنے آئی اس نے فنی ابہام اور تخلیقی تہہ داری کے لیے علامتی فضاء کو زیادہ قبول کیا اور معنی کی کئی جہتوں کو بیک وقت اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔

کثرتِ تخلیق کے لحاظ سے گذشتہ چالیس سال کا عرصہ نظمِ جدید کا زرخیز ترین دور ہے اور اس دور میں اظہار و ابلاغ کے علاوہ ہئیت، اسلوب اور موضوعات کے تجدد کے کئی نئے تجربے سامنے آئے۔ ان میں سے اردو نظم کے چند ایسے شعراء کا تذکرہ یہاں کیا جا رہا ہے جن کے فن کے امتیازی نقوش سے اردو نظم گذشتہ چالیس سالوں کے دوران متاثر ہوئی۔

عزیز طلباء! ڈاکٹر سدید مرحوم نے اپنی تاریخ کی کتاب میں صفحہ نمبر ۵۱۷ سے جن چالیس (۴۰) شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں سے صرف دس کا سوال کی مناسبت سے تفصیلی ذکر کیا جائے گا باقی کے شعراء کے محض نام گنوائے جائیں گے۔

01 خلیل الرحمٰن اعظمی (متوفی ۱۹۷۸ء)

خلیل الرحمٰن اعظمی کی رومانیت نے نظم کے نئے لہجے کی تشکیل میں ان کی بہت معاونت کی۔ ان کی نرم خود کلامی نے ان کی داخلی کیفیت کو سطح پر سجل انداز میں ابھارنے میں بہت مدد دی ہے۔ انہوں نے زندگی کو متاعِ گراں مایہ تصور کیا اور اپنے تجربے کو داخلی آنچ سے پیش کیا۔ **''نیا عہد نامہ''** اور **''کاغذی پیرہن''** میں سلگن زیادہ ہے لیکن فکری گہرائی نسبتاً کم ہے۔ **''سوداگر''**، **''میں گوتم نہیں ہوں''**، **''خلوت کا چراغ''** اور **''دوسری ملاقات''** جیسی نظموں میں بیسویں صدی کے انسان کا المیہ اپنی صورت نمائی خوبی سے کرتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اردو نظم میں ہجو، شہر آشوب اور مثنوی کی اصناف کو بھی تجدد آشنا کرنے کی سعی کی۔ انہوں نے اپنے احساس کو طنز کی گہری جراحت سے پیش کیا۔

02 ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں میں استعارے کے پھیلاؤ کے ہمراہ موضوع کا دائرہ بھی وسعت اختیار کرتا ہے۔ اور شعر کہتے وقت ان کی بصیرت اور بصارت دونوں بیدار اور بیک وقت مصروفِ کار ہو جاتی ہیں۔ **''شام اور سائے''**، **''دن کا زرد پہاڑ''**، **''نردبان''** اور **''گھاس میں تتلیاں''** کی نظموں میں وزیر آغا نے فطرت کے ازلی اور ابدی روپ کو دیکھنے اور اس کے اسرارِ سربستہ کو آشکار کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ لاشعور میں گہرے اترتے اور انسان کے بطون میں پرورش پانے والے روحانی کرب تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ انہوں نے انسان کو اپنی ریکھاؤں کی قید سے آزاد ہونے کا مشورہ دیا اور داخل کے بند دریچے کھول کر تازہ ہوا سے جسم و جاں کو معطر کیا۔

ڈاکٹر محمد انور سدیدؒ نے ''اردو ادب کی تاریخ'' کے صفحہ ۵۱۷ پر اظہار خیال کیا ہے کہ:

''وزیر آغا علامت کو تخلیقی انداز میں استعمال کرنے والے جدید نظم نگار ہیں۔''

مزید لکھتے ہیں کہ:

''نظم ان کے روحانی کشف کا اظہار ہے۔''

''آدھی صدی کے بعد'' اردو کی پہلی تویل نظم ہے جس میں انہوں نے فکری اور سوانحی تجربہ کو شعری روپ دیا۔ وزیر آغا نے میراجیؔ کے بعد جدید نظم کو فکری اور معنوی طور پر شاید سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور ان کا فن نئے آفاق کی طرف سفر کر رہا ہے۔

03 ڈاکٹر وحید قریشی

وحید قریشی کی نظم میں فطرت سے موانست کا جذبہ ایک غالب رجحان کی حیثیت رکھتا ہے۔ **''نقدِ جاں''** اور **''الواح''** کی نظموں میں انہوں نے فطرت کی پُر اسرار آواز کو ایک روحانی کشف کی صورت دی اور انسان کو اس تخلیقی پیکر سے متعارف کرایا جو نظر نہ آنے کے باوجود ہر جگہ موجود ہے۔ ڈاکٹر انور سدیدؒ لکھتے ہیں کہ:

''وحید قریشی کی نظمیں بٹے ہوئے انسان کو مجمع کرتی ہیں۔''

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وحید قریشی تنقید میں جتنے آہنگ مزاج ہیں اپنی نظموں میں وہ اتنے ہی نرم خو نظر آتے ہیں۔

04 شہزاد احمد

شہزاد احمد نظم کے عدسے سے زندگی کی متنوع تصویریں دیکھتے ہیں اور زندگی کے حقیقی ڈرامے کو منعکس کرتے ہیں۔ **''جامِ جہاں نما''** ، **''ماورا''** ، **''گریزاں''** ، **''زندگی''** اور **''جہان دور''** جیسی نظموں میں انہوں نے آشوبِ جہاں کو مجسم کیا ہے اور اپنی دور انگیز لے سے احتجاج کا لہرا اٹھانے کی سعی بھی کی۔

05 شہاب جعفری

شہاب جعفری کی نظم نے جنگل کے معاشرے سے زیادہ اثرات قبول کیے ہیں۔ سورج ان کی شاعری کی ایک بنیادی علامت ہے اور اسی سے انہوں نے جدید میکانکی زندگی کا آشوب نمایاں کیا ہے۔ شہاب جعفری کی نظم بعض اوقات منقی بیانیہ صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے تاثر پھیل جاتا ہے۔ انہوں نے زندگی کی ہیئت کو پھیلا کر اس میں ڈرامے اور غنائیے کے تجربات بھی کیے ہیں۔ ان کی غزل پر ان کی نظم کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ ان کی غزل پر دو مصرعوں کی مختصر نظم کا گمان ہوتا ہے۔

06 شاذ تمکنت (متوفی ۱۹۸۵ء)

شاذ تمکنت نے رومانی اداسی کو نظم میں ڈرامائی صورت دی اور رنگ و آہنگ اور لفظوں کی نئی ترکیب کاری سے ایسے مجسمے تراشے جن کا جمالیاتی پیکر بے حد متاثر کرتا ہے۔ انہوں نے تراشیدہ ترکیبوں سے ایک ساحرانہ فضاء تخلیق کی لیکن نقصان یہ ہوا کہ فکری عناصر زیرِ سطح دب گئے۔ جدید نظم میں شاذ تمکنت کو ایک صاحب اسلوب شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔

07 مظہر امام

مظہر امام نے ترقی پسندی سے جدیدیت کی طرف پیش قدمی اپنے داخل کی آواز پر کی۔ **''زخم تمنا''** اور **''رشتہ گونگے سفر کا''** کی نظموں میں یہ امتیاز نمایاں نظر آتا ہے۔ سماجی انسان کے مثبت پہلوؤں کی جستجو، اور زندگی کے خرابوں سے **''ذاتِ دیگر''** کی تلاش مظہر امام کا تخلیقی نصب العین نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو عارضی اور گونگا سفر قرار دیا اور رشتۂ صورت و صدا کو مستحکم کرنے کی سعی کی۔ انہوں نے اظہار کے لیے علامت بھی تخلیق کی لیکن انہیں علامتی شاعر قرار دینا شاید مناسب نہیں۔

08 عمیق حنفی

عمیق حنفی کی نظم میں عہد حاضر کی عدم اطمینانی کو ایک اہم موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔ **''سندباد''** ، **''شہزاد''** اور **''شب گشت''** میں وہ انسانی وجود کے اثبات کے لیے ایک نئی بوطیقا کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور اس عمل میں انہوں نے اسوۂ رسولِ اکرمؐ کو دورِ جدید کے لیے ایک بامعنی علامت کے طور پر قبول کیا ہے۔ عمیق حنفی کی نظم نگاری ان کے فکر و نظر کا پرتو تخلیقی انداز میں سامنے لاتی ہے۔ ان کے جمالیاتی پیکر عام زندگی سے مختلف نظر آتے ہیں۔ کلاسیکی زبانوں کے مطالعے نے ان کے ہاں ارسطوری سوچ کو بھی کروٹ دی ہے۔ طویل نظم میں انہوں نے ارتقاز فکر قائم رکھنے کی سعی کی لیکن کہیں کہیں احساس ہوتا ہے کہ موضوع پر گرفت کمزور ہوگئی ہے۔

09 عرش صدیقی

عرش صدیقی **''دیدہ یعقوب''** اور **''محبت لفظ تھا میرا''** کی نظموں میں ایک باشعور فرزانے کی صورت میں ابھرے، انہوں نے زمانے سے تعلق قائم کرنے کے لیے کائنات کے مناظر اور مظاہر کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا اور یوں اپنی نظموں کو عمودی جہت دے دی۔

10 عزیز حامد مدنی

عزیز حامد مدنی کی نظمیں اپنے معانی کو ہیئت کی پابند فضاء میں شگفتہ کرتی ہیں۔ انہوں نے روح عصر کو صنعتی شہر کی میکانکیات سے اخذ کیا اور دکھوں کی تجسیم سے اپنی آشفتہ سری ظاہر کی۔ **''کوچۂ گردانِ جہاں''** ، **''دستک کے بعد''** اور **''درونِ بیابان''** جیسی نظموں میں مدنی نے اپنا تاثر امیجری کی تازہ کاری سے مرتب کیا ہے۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل شعراء اس زمانے میں قابل ذکر ہیں۔

بلراج کومل	**باقر مہدی**	**مغنی تبسم**	**افتخار عارف**	**خالد اقبال یاسر**
ظہور نظر	**غلام جیلانی اصغر**	**شمس الرحمٰن فاروقی**	**ذوالفقار علی احمد تابش**	**فہمیدہ ریاض**
جیلانی کامران	**حمایت علی شاعر**	**اعجاز فاروقی**	**حسن اکبر کمال**	**تبسم کاشمیری**
زبیر رضوی	**کمار پاشی**	**ڈاکٹر وحید اختر**	**جاذب قریشی**	**انیس ناگی**
بشیر نواز	**شہریار**	**کشور ناہید**	**سرور کامران**	**جعفر طاہر**
راج نرائن راز	**ندا فاضلی**	**شبنم رومانی**	**اعجاز راہی**	**عبدالعزیز خالد**

4.2 غزل گوئی

آزادی کے بعد اردو ادب کو غزل کا جو ورثہ ملا اس میں دو اسالیبِ غزل بہت مقبول تھے۔

اوّل : کلاسیکی اسلوب جس میں اظہار کے لیے مروجہ علائم و رموز اور روایتی مضامین سے استفادہ کیا گیا۔

دوم: ترقی پسند انداز کی غزل، جس نے اقبالؒ سے خاطر خواہ استفادہ کیا تھا اور آزادی سے پہلے اونچے آہنگ میں سیاسی نوعیت کے مضامین کو بطور خاص غزل میں پیش کرنے کی طرح ڈالی تھی۔

آزادی کے بعد غزل نے جو جدید روپ اختیار کیا اس میں نئے علائم و رموز کو اردگرد کے ماحول کی عکاسی کے لیے بطورِ خاص استعمال کیا گیا، موضوعات کے انتخاب میں عصرِ نو میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات کو ترجیح دی گئی اور جذبہ و تاثر کی مقامیت کو استعمال میں لایا گیا۔ یہ ایک بڑی انقلابی تبدیلی تھی جس نے غزل کی ہیئت کو تو قائم رکھا لیکن اس کے داخل میں نیا خون شامل کر دیا۔ ترقی پسند تحریک نے پہلے نظم کو اپنے تبلیغی اظہار کے لیے سودمند سمجھا اور غزل کے عمومی انداز اور بیضوی صورت کو رد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بعد میں جب اس پر ی وش کی طرف نظرِ التفات کی تو اسے نظم سے ایک علیحدہ وصف کے طور پر قبول کیا۔ نئے دور میں بعض نامور نظم نگاروں نے غزل کہنے کا فریضہ قبول کیا تو اس کے حدود اثرات بھی پھیلا دیئے۔ چنانچہ نظم کے شخصی مزاج نے غزل کے عمومی مزاج پر بے حد مثبت اثرات ڈالے جس سے اردو غزل کا ایک نیا مزاج مرتب کرنے میں خاطر خواہ مدد ملی۔ اس اجمال کی روشنی میں آیئے سب سے پہلے جدید غزل نگاروں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

آزادی کے بعد پاکستان میں جو ادب تخلیق ہوا، اسے جدید ادب کہا جاتا ہے۔ ادب کے قدیم دور میں دہلی اور لکھنؤ کو مرکزیت حاصل تھی اور اردو ادب انہی دو شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد مرکزیت لاہور کے حصہ میں آئی اور یہاں ادب کے جدید دور نے جنم لیا۔ آزادی اپنے ساتھ لاتعداد مسائل لے کر آئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ آزادی کا خواب اچانک حقیقت میں بدل گیا تھا اور اس نے حیرت و استعجاب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ آبادی کے تبادلے اور لوگوں کے نئے ملاپ نے کئی معاشرتی مسائل کو جنم دیا۔ ادبی لحاظ سے بھی ایک نئی تعمیر عمل میں لائی جانی ضروری تھی۔ چنانچہ آزادی کا دور بھی گوناگوں تجربات کا دور ہے۔ جس میں قدیم اور جدید کی آویزش بھی پیدا ہوئی اور علوم کی کئی جہتوں سے استفادہ کا رجحان بھی پیدا ہوا۔ اس دور میں ماضی کی طرف جذبات کی مراجعت اور مستقبل کی جانب ذہنی پیش قدمی کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے ارض وطن سے وابستگی کا گہرا جذبہ پیدا کیا اور یوں اپنی تہذیب و ثقافت سے شدید انداز میں شگفتگی بھی پیدا کی۔ یہاں ہم غزل کی جدیدیت کے اعتبار سے ایک جائزہ پیش کرتے ہیں۔

اقبالؒ کے زمانے سے لیکر آزادی کی صبح تک اردو شاعری کا زیادہ تر رجحان غیر ملکی تسلط کے خلاف جدوجہد میں رہا۔ آزادی کے بعد شعراء نے نئی قومی تعمیر کے ضمن میں اپنے سخن کو کھپانا شروع کر دیا۔ اس دور میں شعراء نے ہجرت کے صدمات کو شاعری میں سمو دیا اور گرد پیش کی اشیاء اور مظاہرے، تشبیہ، استعارہ، اور علامت کا نیا نظام مرتب کیا۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

''اس دور میں شاعری نے افقی اور عمودی دونوں جہات میں سفر کیا۔ غزل اور نظم کو معنوی وسعت عطا ہوئی اور شاعری میں اظہار کی بعض نئی اصناف کو بھی روشناس کرایا گیا۔''

(اردو ادب کی مختصر تاریخ صفحہ 492)

آزادی کے بعد اردو غزل میں جو شعراء نمایا ہوئے ان میں ناصؔر کاظمی کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے بعد جدید شعراء کی لمبی لسٹ ہمارے سامنے ہے جن میں سے چند ایک کا ذکر ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

01 فیض احمد فیضؔ: (1911-1984)

بیسویں صدی کے وہ خوش نصیب شعراء جنہیں اپنی زندگی میں مقبولیت اور شہرت نصیب ہوئی، فیضؔ ان میں سرفہرست ہیں۔ آپ کو اقبالؔ کا استاد بھائی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے مختلف زبانوں میں مختلف کلام کے تراجم بھی کیے۔ ان کے انگریزی، فرانسیسی، روسی، فارسی، عربی، چیکوسلواکیا، ہنگری، جاپانی، منگوئین، بنگالی، ہندی، نیپالی اور بعض دیگر زبانوں میں تراجم موجود ہیں۔

فیض کے کلام کی نمایاں خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

انقلابی شاعری	رومانی عناصر	عشقیہ شاعری	جذبات کی ترجمانی
حسن ادا اور قدرت بیان	استحصال سے نفرت	غزل کی نئی روایت	آزاد نظم
تراکیب	محاکات پر قدرت	روایت سے بغاوت	

فیضؔ، اقبالؔ اور غالبؔ کے سلسلے کا شاعر ہے۔ اور اس دور کی کلاسیکیت کو جدید انداز میں ڈھالنے کے فن سے بھی آشنا ہے۔ فیضؔ کا سماجی شعور و ادراک جس قدر واضع ہے اور اس کے خدوخال جس قدر روشن ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ان کی ترجیحات کا سراغ لگانا مشکل نہیں۔ فیضؔ کی شاعری میں عشق نہایت متحرک اور پرقوت جذبہ بن کر ابھرتا ہے۔ جو اپنی تبدیل شدہ شکلوں کے ساتھ ہر عہد میں کی گئی شاعری میں شاعر کے ہم رکاب رہتا ہے۔ طبقاتی کشمکش کے خلاف، انقلاب اور جدوجہد، تیسری دنیا کے استحصال زدہ عوام، مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے چند ایسے موضوعات ہیں جن پر فیضؔ نے بہت کچھ لکھا۔

؎ اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے — جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں — جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت — چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے (فیضؔ)

02 حفیظؔ جالندھری (1900-1982)

غزل نے جدیدیت کی طرف جو تیز پیش قدمی کی تھی اسے ساتویں دہائی میں ایک نئی جہت ملی۔ آٹھویں دہائی میں غزل کو اسلوب اور فکر و نظر کی تازگی ملی اور نئے شعراء کی اتنی بڑی تعداد غزل کی طرف مائل ہوئی کہ ان سب کا فرداً فرداً ذکر کرنا ممکن نہیں اس کے باوجود جن اہم شعراء کا ذکر ضروری ہے ان میں حفیظ جالندھری بھی نہایت قابل ذکر ہیں۔ حفیظ کی شاعری پر اقبالؒ، حالیؔ اور ٹیگورؔ کے نمایاں اثرات ہیں۔ آیئے! ان کی پر لطف شاعری کی ایک جھلک دیکھتے ہیں۔

؎ جس نے اس دور کے انسان کیے ہیں پیدا — وہ ہی میرا بھی خدا ہو ، مجھے منظور نہیں

کھا جو تیر دیکھا کمیں گاہ کی طرف — اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی (حفیظؔ)

03 احسان دانشؔ: (1914-1982)

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے بانی جنابِ احسان دانشؔ کی غزل میں بنیادی طور پر اس غم کو اجاگر کیا گیا ہے جو انسانی دردمندی سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میرؔ کی پیروی میں جگ بیتی ہے اور آپ بیتی بھی۔ **''سولن کی شام''** ، **''بہتے ہوئے دن''**، **''صبح بنارس''** اور **''شام اودھ''** جیسی نظموں میں وہ ایک فطرت نگار اور رومانی شاعر کی حثیت میں سامنے آئے۔

؎ قطرے کی ترائی میں تھے طوفان کے نشیمن — ذرے کے احاطے میں بگولوں کا سفر تھا

؎ وہ مقرض ہیں میرے چراغوں پہ خود جنہیں — آتا ہے روشنی میں نظر ، کم بہت ہی کم (دانشؔ)

04 احمد ندیم قاسمیؔ: (1916-2006)

احمد ندیم قاسمی اردو ادب کے ایک درخشاں ستارے ہیں۔ آپ نے اردو شاعری اور افسانہ نگاری میں وہ نمایاں کارنامے سرانجام دیئے کہ آج تک آپ مقبول عام ہیں۔ آپ نے ترقی پسند کو لیبل کے طور پر استعمال کرنے کی بجائے شعار زیست جانا اور ترقی پسندی کے آدرش کو فکری سطح پر اپنی شاعری میں شامل کیا۔ اس لیے ان کے ہاں نعرہ بازی نہیں بلکہ گہری سوچ ملتی ہے۔ آپ کے مقبول عام شعری مجموعے مندرجہ ذیل ہیں۔

'' جلال و جمال ''، '' محیط ''، '' دوام ''، '' لوح خاک ''، '' دشت وفا ''، '' رم جھم ''، '' قطعات ''، اور '' شعلہ گل ''

ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

؎ کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا — میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

؎ جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے — مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

؎ ہم نے ہر شعر میں تصویر جراحت کھینچی — لوگ وارفتہ رنگینی تحریر ہوئے

؎ نماز صبح کی مہلت میسر ہو تو کیسے ہو ؟ — اذانیں سن کے کھو جاتا ہوں چڑیوں کی پکاروں میں

؎ تربت سے گلاب بن کر پھوٹا — جو حسن نہ چھپ سکا کفن سے (قاسمیؔ)

05 مجید امجدؔ: (1914-1974)

مجید امجدؔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ یہ ایسے شاعر ہیں کہ بیک وقت کائنات اصغر (انسان) اور کائنات اکبر سے تخلیقی سطح پر رابطہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے بعض نظموں میں وقت کو کائنات کے تخلیقی استعارے کے طور پر استعمال کیا۔ مثلاً: ان کی نظم ''**امروز**'' اور ان سب پر مستزاد مجید امجدؔ کے عصری شعور۔ مثلاً: ''**توسیع شہر**''، ''**پنواڑی**''، ''**طلوع فرض**'' اور ذاتی محرومیوں کا احساس مثلاً: ''**آٹوگراف**'' اور ''**جلوس جہاں**'' ان کی نظموں کے علاوہ ان کی غزلیں بھی فنکاری کا بہترین نمونہ ہیں۔

؎ کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجدؔ — میری لحد میں کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

؎ اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ — میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے

؎ گھڑی کالی رین کی سونٹی سے لٹکائے — اپنی دھن میں دھیان نگر کو گئے کیا کیا لوگ (مجید امجدؔ)

06 قتیلؔ شفائی: (1919-2001)

اورنگ زیب خان قتیلؔ شفائی نے نظم، غزل اور گیت ہر صنف سخن میں اپنی انفرادیت کے جوہر دکھائے۔ اور سبھی میں کامیاب رہے۔ غزلیات کے مجموعہ ''**گفتگو**'' میں قتیلؔ کی غزل ایک نئے موڑ پر نظر آتی ہے۔ ''**گفتگو**'' کی غزلیں قتیلؔ کے فن میں ایک نئی جہت کی نشاندہی کرتی ہیں اور ان غزلوں میں ایک نیا قتیلؔ نظر آتا ہے۔ **ابابیل**، **ہریالی**، **چھتنار**، **جھومر**، **گھنگرو**، **گجرہ**، **پیراہن**، **صنم**، **چلترنگ**، **برگد**، **مطربہ**، **آموختہ**، **سمندر میں سیڑھی**، **روزن** اور **مونالیزا** ان کی غزلوں نظموں اور گیتوں کے مقبول مجموعے ہیں۔

؎ گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں — کوئی بدلی تیری پازیب سے ٹکرائی ہے

آج تک ہے دل کو اس کے لوٹ آنے کی امید — آج تک ٹھہری ہوئی ہے زندگی اپنی جگہ

لاکھ چاہا ہے کہ اس کو بھول جاؤں، پر قتیلؔ — حوصلے اپنی جگہ ہیں بے بسی اپنی جگہ

تھی ہم آغوش مگر کچھ بھی ہمیں حاصل نہ تھا — وہ ایک ایسا لمس تھا جس میں بدن شامل نہ تھا (قتیلؔ)

اسی طرح ابن انشاء، فارغ بخاری، منیر نیازی اور سیف الدین سیفؔ نے بھی مختلف انداز میں غزلیں لکھیں۔ سیف الدین سیفؔ نے کم کہا مگر بہت خوب کہا۔

؎ ہم کو تو گردش حالات پہ رونا آیا

رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا

؎ سیفؔ انداز بیاں رنگ بدل دیتا ہے

ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں (سیفؔ)

ضیاء جالندھری، میراجی، اور باقی صدیقی بھی بہترین غزل گو شاعر ہیں اور غزل کی روایت ان کے بنا ادھوری ہے۔ انجم رومانی کو فن غزل سے بالعموم مخصوص سمجھا جاتا ہے۔

07 سید ناصؔر رضا کاظمی: (1925-1974)

ناصؔر کاظمی غزل کے بہترین شاعر ہیں۔ان کی غزل میں آج کے مرد کا کھنڈر نظر آتا ہے آج کا مرا ایسا ڈوٹا پھوٹا گھر ہے جس کی دیوار نہ تو وہ خود بن سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور کو بننے دیتا ہے۔چنانچہ ناصؔر کی غزل بحیثیت مجموعی اسی المیہ کی عکاس رہی ہے۔وہ انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ان کو ہجرت کا جو غم تھا اس کو انہوں نے اپنی شاعری کا استعارہ بنالیا۔اور میرؔ کی طرح سادہ سادہ اشعار کی چھوٹی چھوٹی بحروں میں غم وحزن کی عکاسی کی۔ان کے مجموعہ کلام میں **''پہلی بارش''** اور **''برگِ نے''** دو نمایاں تصانیف ہیں۔ان کی وفات کے بعد ان کا شعری **''دیوان''** چھپا جس کو بہت زیادہ مقبولیت ملی۔ان مجموعوں میں ناصؔر کا فن مسلسل مائل بہ ارتقاء نظر آتا ہے۔انہوں نے جس اداسی کو بال کھولے دیکھا تھا وہ ان پر مسلسل چھائی رہی۔پیاسی تنہائی، جلتی اداسی، گونگی وادی اور بجھا سورج جیسی ترکیبیں ان کے داخلی کرب کو ہی ظاہر کرتی ہیں۔میرؔ طرح ناصؔر کاظمی نے بھی غزل کی نئی تہذیبی فضاء پیدا کی لیکن وہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہے اور نوعمری میں ہی وقت کی فصیل عبور کر گئے۔

؎ چمکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصؔر
کہ دن میں بھی مرے گھر میں وہی اداسی ہے (ناصؔر کاظمی)

08 سیدہ پروین شاکؔر نقوی : (1952-1994)

پروین شاکؔر، جون ایلیا کی کزن تھیں۔ادب میں ان کی اعطاء یہ ہے کہ انہوں نے اس زمانے کی عورتوں کو شوہر داری کا فن سکھایا ہے۔ان کے ذکر کے بغیر جدید غزل کی روایت ادھوری اور نامکمل ہے۔**احمد ندیم قاسمی** لکھتے ہیں۔

''پروین کی غزل اس کی شاعری کا مضبوط ترین حصہ ہے۔دنیا کا ماحول اور مسائل کو ایک باشعور عورت کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے اس نے جس خوبصورتی سے اپنے اندر کی لڑکی کے جذبات اور محسوسات کو زبان دی ہے یہ اسی کا حصہ ہے۔میرے نزدیک پروین شاکؔر ہمارے عہد کی ایک بہت توانا اور نمائندہ آواز ہے۔''

؎ پر سمیٹے ہوئے شاخوں میں پرندے آ کر
ایسے سوئے کہ ہوا سے بھی جگائے نہ گئے (پروین شاکؔر)

09 ابن انشاؔء (اصل نام شیر محمد خان تھا): (1927-1978)

انشاؔء کی غزل کا خمیر میرؔ کی غزل سے اٹھا۔ناصؔر کاظمی نے میرؔ کی غزل کی داخلیت کو قبول کیا تھا۔لیکن ابنِ انشاؔء نے جب درد وغم جمع کیے تو ان کے اندر کا شاعر کبھی جوگی کے روپ میں اور کبھی بنجارے کے روپ میں سامنے آیا۔۔انہوں نے بستیوں کے اجڑنے پر نوحہ خوانی نہیں کی بلکہ اپنی داخلی کشمکش کو عاشق کی وارفتہ خیالی سے پیش کیا اور زمانے پر بیگانہ محض کی نظر ڈالی۔

؎ جھوٹے سکوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال
شکلیں دیکھ کے سودا کرنا کام ہے ان بنجاروں کا (انشاؔء)

10 خلیل الرحمٰن اعظمی :(1927-1978)

ان کی غزل نے ترقی پسندانہ کشمکش سے جنم لیا تھا۔ وہ ان شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے رنگ میرؔ کی تجدید کی۔ چنانچہ انہیں غزل کی اس نئی روایت کا بانی شمار کیا گیا ہے جو فراقؔ اور یگانہؔ کے بعد شروع ہوئی تھی۔

؎ زباں پہ کس لیے یہ حرفِ ناگوار آتا
ہمارے زخم ہمارا اگر پتہ دیتے (خلیل الرحمٰن اعظمی)

11 منیرؔ نیازی: (1928-2006)

منیر کی غزل میں الفاظ ایک نیا روپ دھار لیتے ہیں اور معنوی طور پر ایک نئی پرت الٹتے ہیں ان کے وجدانی اسلوب کو طرز میرؔ سے تعبیر کرنا مناسب ہے۔

؎ منیرؔ اس شہر پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز ہے اور سفر آہستہ آہستہ (منیرؔ نیازی)

12 جمیل الدین عالیؔ: (1925-2015)

عالیؔ نے اپنی غزل کے لیے جو مخصوص فضاء تعمیر کی اس میں بھگتی رس کی آمیزش تھی۔ ان کا طنطنہ غالبؔ جیسا ہے لیکن پیش دستی ان کی غزل کے مزاج میں شامل نظر نہیں آتی۔ ان کی لذت گوشی میں نیاز مندی کا عنصر نمایاں ہے اور غزل میں جستگی کی کیفیت متاثر کرتی ہے۔

؎ سننے والو! غور نہ کرنا، ورنہ خفا ہو جاؤ گے
جن کو ہم نے دوست کہا ہے، وہ ہم سے بیگانے ہیں
؎ اپنا کام ہے صرف محبت، باقی اس کا کام
جب چاہے وہ روٹھے ہم سے جب چاہے من جائے (عالیؔ)

13 مصطفیٰ زیدیؔ: (1930-1970)

مصطفیٰ زیدی کی غزل میں جمالِ ہم نشیں کی آنچ کو اپنے اوپر نچھاور کرنے اور پھر اس میں مسلسل سلگنے کی کیفیت نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کو اطمینان کی نظر سے نہیں دیکھا لیکن شعری سطح پر ایک ایسا کردار تخلیق کیا جس کی ٹھوکر کی زد میں زمانہ تھا۔

؎ انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کہیں کہکشاں نہیں ہے (مصطفیٰ زیدیؔ)

14 جعفر طاہرؔ: (1917-1977)

جعفر طاہرؔ کی غزل کی لے حزن آمیز ہے اور یہ حزنیہ لے ان کے داخلی درد سے پیدا ہوئی ہے۔انہوں نے رنگ بدلتی دنیا کو بالعموم پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور اسی درد کو غزل میں مجسم کی کیفیت لفظ وخیال سے عیاں کر دی۔

؎ ہر زباں پر تھا کبھی تذکرۂ دورِ بہار
ہر زباں شکوہ گرِ جورِ خزاں ہے کہ نہیں (جعفر طاہرؔ)

15 سیف الدین سیفؔ : (1922-1993)

سیفؔ نے حقیقت کے پس پردہ نئی حقیقت دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس نئی دریافت نے ان کے ہاں یاسیت اور عدم اطمینانی ہی پیدا کی۔

؎ دشمن گئے تو کشمکش دوستی گئی
دشمن گئے کہ دوست ہمارے چلے گئے (سیفؔ)

16 ڈاکٹر وحید قریشی: (1925-2009)

وحید قریشی کے تغزل میں قدیم روایات کے انحراف اور منظر کو نئے زاویہ سے دیکھنے کا انداز نمایاں ہے۔

؎ دل کا کھونا، دل کا رونا، لاکھ عذاب الیم سہی
ہمت ہار کے بیٹھ ہی جائیں، ہم ایسے ناکام نہیں (وحید قریشی)

17 باقیؔ صدیقی (محمد افضل قریشی): (1908-1972)

باقیؔ نے عصری حقیقت کو تجربے کی صداقت سے پیش کیا۔ان کی غزل میں منظر ایک نئے منظر کو جنم دیتا ہے۔

؎ یہ دوپہر یہ پگھلتی ہوئی سڑک باقیؔ
ہر ایک شخص پھسلتا ہوا نظر آیا (باقیؔ)

18 شہزاد احمد: (1932-2012)

شہزاد اپنی غزل میں نئے لہجے کے نقیب ہیں۔وہ جذباتی سطح پر متوازن،فکری سطح پر متحرک اور تخلیقی سطح پر فعال ہیں۔وہ نئی غزل کے ابتدائی مزاج ساز ہیں۔

؎ شب غم سیل گریہ دیدۂ تر سے نکلتا ہے
مگر یہ کیسا دریا ہے سمندر سے نکلتا ہے (شہزاد احمد)

19 شکیب جلالی: (1934-1966)

شکیب کی غزل انسان اور فطرت کے درمیان ایک نیا رابطہ ہے۔انہوں نے نئی غزل کی مزاج سازی میں نمایاں حصہ لیا۔

؎ دھوپ کی لہر ہے تو، سایہ دیوار ہیں ہم
آج بھی ایک تعلق ہے ترے ساتھ ہمیں (شکیب جلالی)

20 ساقی فاروقی: (1936-.....)

ساقی کی غزل میں تازگی، اسلوب کی جدت سے پھوٹی ہے اور اس کا حیران کن اظہار ان کی بے باک شاعری سے ہوا ہے۔

؎ اک نئے نام سے پھر اپنے ستارے الجھے
یہ نیا کھیل نئے خواب کا بانی نکلا (ساقی فاروقی)

21 ڈاکٹر وزیر آغا: (1922-2010)

ڈاکٹر وزیر آغا نے غزل میں ظاہر کے پس پردہ ایک اور جہاں معنی کی نشاندہی کی۔ان کی غزل کا علامتی نظام ان کی معاصر غزل سے بالکل مختلف ہے۔

؎ تمام عمر پھرے کاسہ بدن لیکر
کہ جیسے اپنے ہی دست کرم بھی تھے ہم بھی (ڈاکٹر وزیر آغا)

؎ دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا (ڈاکٹر وزیر آغا)

22 جون ایلیا (سید جون اصغر ایلیا): (1937-2002)

جون ایلیا اردو زبان کے نامور پاکستانی شاعر، فلسفی اور دانشور تھے۔گرچہ انہوں نے حمد، نعت، نوحہ، مرثیہ اور قصیدہ لکھا لیکن پھر بھی غزل ان کا خاص میدان رہی۔اور غزل کے میدان میں انہوں نے اپنا لوہا منوایا۔

؎ جانے کہاں گیا وہ، وہ جو ابھی یہاں تھا
وہ جو ابھی یہاں تھا، وہ کون تھا کہاں تھا (جون ایلیا)

23 سلیم احمد: (1927-1983)

سلیم احمد نے غزل کا آغاز میر پرستی سے کیا تھا لیکن ان پر فراق، یگانہ اور حسرت زیادہ اثر انداز ہوئے۔

؎ صبح پھر ہو گئی کوئی حادثہ یاد آئے گا
شام پھر آئے گی پھر شام سے گھبرائیں گے (سلیم احمد)

ادب کے جدید دور کے دیگر اہم شعراء مندرجہ ذیل ہیں۔

روشن صدیقی، عزیز حامد مدنی، فرید جاوید، محبوب خزاں، غلام جیلانی اصغر، عمیق حنفی، خلیل رامپوری، بشیر بدر، فضا ابن فیضی، انور شعور، ریاض مجید، اقبال ساجد، سلیم شاہد، شمیم حنفی، کشور ناہید، عرش صدیقی، احمد فراز، محسن احسان، جمیل ملک، محسن بھوپالی، اختر انصاری، رئیس امروہوی (جون ایلیاء کے بھائی)، سراج الدین بھوپالی، تابش دہلوی، جگن ناتھ آزاد، شان الحق حنفی، مرتضیٰ برلاس، سجاد باقر رضوی، مشفق خواجہ، سلیم احمد وغیرہ۔ وغیرہ۔

24 ظفر اقبال: (تاحال زندہ۔ 1932)

ظفر اقبالؔ کا شمار غزل کے جدید جادۂ پیماؤں میں ہوتا ہے۔ ان کی غزل میں اپنے عصر سے ماورا جانے کا انداز بھی ملتا ہے۔ یہ تاحال زندہ وسلامت ہیں۔ اور نت نئی ترقیوں کی راہ پر گامزن ہیں۔

؎ شب وصال ترے دل کے ساتھ لگ کر بھی
مری لٹی ہوئی دنیا پکارتی ہے مجھے (ظفر اقبالؔ)

4.3 اینٹی غزل

آزاد کے کچھ عرصہ بعد چند نوجوان شاعروں نے محسوس کیا کہ غزل ہیئت اور موضوع کی معین فضا میں محبوس ہے اور نیا اظہار نئے انداز کا متقاضی ہے۔ اور یہ ردِعمل اگرچہ غیر سنجیدہ تھا لیکن اتنا شدید تھا کہ ان نوجوانوں نے ''اینٹی غزل'' متعارف کرانی شروع کی جس نے تضحیک واستہزا کی صورت پیدا کر دی۔ اینٹی غزل اکہری اور منفی تھی، اس نے غزل کے ایمائی اور رمزاتی مزاج کو مجروح کیا۔ اس نے اردو غزل کی قدیم روایت کو شکستہ کیا۔ گہری معنویت اور داخلی آہنگ کو ردخورِ اعتنا نہ سمجھا اور کھردرے، غیر حسی، ناشائستہ اور بے جذبہ اظہار کی طرح ڈالی۔ چنانچہ اسے غزل کے بجائے غزل کی مضحک پیروڈی شمار کیا گیا۔

انیسویں صدی میں اس قسم کی ہزل کے آثار انشاءاللہ خان انشاؔ کے ہاں نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی میں یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی کی کلبیت نے بھی ان سے اس قسم کے اشعار کہلوائے۔ ساٹھ کی دہائی میں نئی لسانی تشکیلات کے شوق میں چونکانے کی کوشش اینٹی غزل کی صورت میں بھی ظاہر ہوئی اور بعض شعراء نے اس غیر جمالیاتی تجربے کو داخل کی واردات بنائے بغیر قبول کر لیا۔

اینٹی غزل کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں۔

؎ کوئی تو نفسِ امّارہ کو ٹوکے
کہ حد سے بڑھ چلا ہے اب یہ سنڈا (سلیم احمد)

؎ چمک چمکارنے ، شب شیر نے کے
مزے محکم ، الف زنجیر نے کے (ظفر اقبال)

؎ ایک پانچے کا پانچ بنا
دو پانچے کا بنے گا دس (اختر احسن)

؎ پڑے ہو راہ میں پتھر کی صورت
گذرنے والوں کی لاتیں بھی کھاؤ (عادل منصوری)

؎ سر پر ٹوپی اور نہ جوتا پیروں میں
کس کی یہ بندوق اٹھائے پھرتے ہو (خلیل رام پوری)

اینٹی غزل کا تضحیکی رجحان زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ پڑھنے والوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور ردِعمل میں ہنگامی نوعیت کے اشعار لکھ کر نفرت کا اظہار بھی کیا گیا۔